کانفرنس نمبر

جلد (۱۱) — شمارہ (۲) -۴

زیر سرپرستی جناب خان فضل محمد خان صاحب ایم اے رنگلر ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی

انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

مجلس ادارت

سید علی اکبر ایم اے (کنٹب) مدیر مسئول عبد النور صدیقی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (ملیگ)

سعید الدین خاں بی۔ اے۔ ڈپ۔ ایڈ (عثمانیہ)

مقاصد

(۱) طبقۂ اساتذہ کے احساس معلمی کو بیدار کرنا۔

(۲) طبقۂ اساتذہ کے مخصوص انفرادی تجربات معلمی کو شائع کرنا۔

(۳) فن معلمی پر نفسیاتی حیثیت سے نقد و نظر۔

(۴) انجمن اساتذہ کے مفید مقاصد و اغراض کو ملک کے طول و عرض میں مکمل طور پر پھیلانا۔

قواعد

(۱) رسالہ کا نام حیدرآباد ٹیچر ہوگا اور ہر سہ ماہی پر صدر دفتر انجمن اساتذہ بلدہ سے شائع ہوگا۔

(ب) رسالہ کی سالانہ قیمت بہ تفصیل ذیل ہوگی۔

اندرون و بیرون ممالک محروسہ سرکار عالی تین روپیہ مع محصول ڈاک سالانہ (سکہ رائجہ)

صرف اردو حصہ (عہ) سالانہ قیمت فی پرچہ اردو و انگریزی (۱۲ر) صرف اردو (۸ر)

(ج) رسالہ نصف انگریزی و نصف اردو ہوگا جس میں حسب صوابدید تغیر بھی ہو سکے گا۔

(د) صرف وہی مضامین درج ہو سکیں گے جو تعلیم سے متعلق ہوں۔

(ہ) جملہ مضامین و مراسلت دفتر کے پتہ سے ہونی چاہئے۔

(و) اشتہارات کا نرخ حسب تفصیل اشاعت نامہ ہے گا۔

نرخ اشتہارات حیدرآباد ٹیچر حسب ذیل ہے

مقدار	سال بھر	۶ ماہ	فی اشاعت
پورا صفحہ	عـہ	صہ	ے
نصف صفحہ	صہ	عـہ	۸ر
ربع صفحہ	عـہ ۸ر	۹ر	۱۵ر
فی سطر	۱۰ر	۸ر	۶ر

اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن میں طبع ہو کر دفتر انجمن اساتذہ واقع صدر مہتممی تعلیمات بلدہ سے شائع ہوا

حیدرآباد ٹیچر

بابت آذر لغایتہ بہمن ۱۳۴۶ف

فہرست مضامین

جلد ۱۱ شمارہ ۲

خطبۂ استقبالیہ

دسویں سالانہ کانفرنس انجمن اساتذہ مستقرہ بلدہ ۱۳۴۶ف

از

سید نور الحسن بی اے۔ بی ٹی (علیگ) ڈپ ایڈ (گلاسگو)

صدر محترم معزز خواتین و حضرات

یہ میرا فرض ہے کہ اُن حضرات کا شکریہ ادا کروں جنہوں نے مجھے اس خدمت کے لیے منتخب فرمایا۔ آج میرا دل گونا گون جذبات کا حامل ہے انتہائی مسرت کے ساتھ میں بہی خواہان ملک علما، اور اساتذہ صاحبان کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ جن کی عظیم اکثریت نے اپنی زندگیاں تعلیم و تدریس اور تشکیل سیرت کے لئے وقف کردی ہیں، جن کے دلوں میں احساس فرض ہے، جن کے سروں میں سودائے علم۔ جو دنیا کی تاریکی کو علم کی روشنی سے دور کرنے کے لئے۔ مٹانے کے لیے۔ فنا کرنے کے لئے کمر ہمت باندھ چکے ہیں۔ گو ان کی زندگیاں چشم ظاہریں کو خوش و خرم نظر نہیں آتیں گو ان کے گھر محل سرا نہیں۔ گو وہاں عیش و عشرت کے نقارے نہیں بجتے۔ لیکن ان کا متاع حیات ان کا کام ہے جو بے شبہ روح کی غذا اور ضمیر کی تسکین کا باعث ہوتا ہے۔ خوش قسمت اور قابل مبارکباد ہے ہم میں سے وہ جو اپنے کام کو پابندی نیک نیتی فرض شناسی سے انجام دے رہا ہے۔

حضرات! صمیم قلب سے میں آپ سب کا متشکر ہوں کہ آپ نے تشریف آوری کی زحمت گوارہ فرمائی۔ خصوصاً ہمارے وہ مہمان جو دور و نزدیک سے سفر کی صعوبتیں برداشت فرما کر شریک جلسہ ہیں اگر آپ کو کسی قسم کی تکلیف بھی ہو تو یقین ہے کہ اس امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ یہ آپ ہی کا کام ہے۔ جس کی ذمہ داری ہم نے اپنے سر لی ہے آپ ہمیں معاف فرمائیں گے۔

حضرات! ہماری یہ دلی تمنا تھی کہ سال حال بھی عالیجناب نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام

سیاسیات وتعلیمات ہی کا نفرنس کا افتتاح فرماتے لیکن بدقسمتی سے ہماری یہ آرزو چند درچند وجوہ سے پوری نہ ہوسکی جس کا ہمیں بھی افسوس ہے مگر ساتھ ہی اس امر کی انتہائی خوشی بھی ہے کہ باوجود کثرت کار کے نواب صاحب معزکل کے جلسہ میں اپنے زرین خیالات سے اساتذہ صاحبان اور حاضرین کو متفید فرمائیں گے۔ اجنٹہ سے سفر کی صعوبت برداشت فرماکے شریک جلسہ ہونا۔ آپ کی علم دوستی علم پرستی اور علم شناسی کا بین ثبوت ہے۔ مثل اپنے ذی علم باوقار، روشن دماغ والد محترم عالیجناب نواب عماد الملک بہادر کے نواب صاحب ممدوح بھی علم کے حقیقی سرپرست تسلیم کئے جاتے ہیں۔ آپکے کارنامے حسن اخلاق اور حسن انتظام کے چرچے زبان زد خاص و عام ہیں۔ آپ کا پرمغز خطبہ صدارت جن حضرات نے بغور سنایا پڑھا ہوگا۔ وہ اس کی اہمیت اور اثرات سے بخوبی واقف ہیں۔ آپ نے عمل ہمدردی اطاعت اور اتحاد کا جو سبق دیا وہ فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اصول تعلیم وطریق تعلیم کے پیچ در پیچ مسائل کو جس آسانی سے صاحب موصوف نے اپنے خطبہ صدارت میں سلجھایا ہے وہ واقعی آپ ہی جیسے پختہ کار، کارآموز اور تجربہ کار افسر کا کام تھا ایک سال کے قلیل عرصہ میں جو ترقی تعلیم کے ہر شعبہ میں نظر آتی ہے، جو چہل پہل اور زندگی کے آثار ہمارے اساتذہ صاحبان اور طلبا میں پائے جاتے ہیں اور جس جوش عمل کے چرچے ہم دیکھتے اور سنتے ہیں جناب ممدوح کی انتھک کوششوں کے نتائج ہیں۔ زندہ جاوید اصولوں کے مجسمہ ہونے کی حیثیت سے صاحب موصوف نے واضح کردیا ہے کہ خشک احکامات کے نفاذ سے نہیں بلکہ ایک مثالی کردار اور مقناطیسی شخصیت کی طاقت تاثیر سے عالم جمود میں تجدید حیات کی نئی لہر دوڑ جاتی ہے۔

ہمارا دوسرا خوشگوار فریضہ عالی جناب قاضی محمد حسین صاحب نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ کا خیر مقدم کرنا ہے ہم آپ کو کرسی صدارت پر متمکن دیکھ کر جس قدر خوش ہوں کم ہے۔ جناب ممدوح کی جامع ہستی جامعہ عثمانیہ کے لئے ہی نہیں بلکہ ملک کے نوجوانوں کے لئے قابل تقلید ہستی ہے یقین کیجیے کہ ہم صرف زبان سے نہیں بلکہ دل سے آپ کی عنایت کے ممنون ہیں اور ساتھ ہی اس موقع کو غنیمت جان کر ارکان انجمن کی طرف سے آپ کی خدمت میں ہدیہ مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ اس منصب جلیلہ کے آپ ہر طرح سے اہل تھے۔ جزرسی دوراندیشی، اور سب سے بڑھ کر بے تعصبی آپ کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کو سخت ضرورت تھی ایسے کارآموز اور تجربہ کار صدر کی جو روشن دماغ، ہمدرد، مدبر اور بے تعصب ہو یہ تمام خوبیاں آپ ہی میں پائی جاتی ہیں۔

بالآخر ہمارے ممتاز ناظم تعلیمات جناب فضل محمد خان صاحب کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی موجودگی اور تعلیمی امور میں دلچسپی ہماری ہمت افزائی کا باعث ہے۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں صاحب موصوف نے ہمیشہ اس ریاست کی تعلیمی ترقی میں گہری دلچسپی لی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اس مخلصانہ اظہار خیال میں میں آپ سب کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کر رہا ہوں کہ محض انہیں کی مشفقانہ سرپرستی اور امداد کی وجہ سے انجمن ترقی کر رہی ہے۔ اور اپنے نصب العین کے قریب ہوتی جا رہی ہے۔

حضرات۔ اس موقع پر مختصراً انجمن کے قیام کی غرض و غایت اس کے اصول و مقاصد آپ کے گوش گذار کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ انجمن اساتذہ ۱۳۳۲ف میں مندرجہ ذیل مقاصد کی تکمیل کے لئے قائم ہوئی۔ یہ کانفرنس مختلف مدارس کے اساتذہ کو ایک جگہ جمع کرنے اور ان میں یکجہتی میل و محبت اشتراک عمل اور فرض شناسی کا جذبہ پیدا کرنے کی حتی الامکان کوشش وسعی کرتی ہے، نئے اور مروجہ فن تعلیم کے اصولوں سے آگہی کے ذرائع فراہم کرتی ہے باہمی مشورہ اور باہمی تبادلہ خیالات سے مشکلات کو دور کرنے کی تجاویز پیش کرتی ہے۔ ماہرین فن کے مقالے سننے اور مقررین کے اثر آفرین اور سبق آموز خیالات سے مستفید ہونے کے مواقع بہم پہنچاتی ہے۔

اگر کانفرنس کے پچھلے آٹھ نو سال کی روداد یں دیکھی جائیں تو معلوم ہوگا کہ کانفرنس نے اپنے مقاصد کے حصول کی کیا کیا تدا بیر کیں اور کیا کیا کارنمایاں کئے ہیں۔ کانفرنس نے..... اپنی پندرہ رپوٹوں کے ذریعہ سے جو مختلف کمیٹی کے ارکان نے نہایت عرق ریزی سے تیار کی ہیں اور لائق فاضل حضرات کے لکچر اور خطبات کے ذریعہ ایسا گراں بہا فنی ادب جمع کیا جس کو پڑھنے کی اگر زحمت و تکلیف گوارہ فرمائی جائے تو ہم جو آج غفلت اور جہالت کے شکار ہیں منزل مقصود کو پہنچ سکتے ہیں۔ کانفرنس قابل مبارکباد ہے۔ چونکہ اس نے صرف وہ کیا جو کرنا چاہیے تھا بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر کیا۔ انجمن کا سہ ماہی رسالہ حیدرآباد ٹیچر ہندوستان کے ممتاز فنی رسالوں میں شمار ہوتا ہے انجمن کا کتب خانہ جدید کتب سے مالا مال ہے۔ سالانہ کانفرنس۔ سالانہ باغبانی کے مقابلے، سالانہ مشاعرہ، سالانہ نمائش، مشقی اسباق اور سب سے بڑھ کر تعلیمی ہفتہ جو امسال منایا جا رہا ہے۔ انجمن ہذا کی مختلف النوع خدمات میں ٹیچرس کلب کا قیام ہمارے ہر دل عزیز، ہمدرد اور دور اندیش صدر مجلس انجمن اساتذہ یعنی مولوی علی اکبر صاحب کی کوشش وسعی کا مرہون منت ہے آپ ہماری ہر تعلیمی جد و جہد اور مصروفیات کے

کے خضر راہ ہیں اور آپ کی ذات ستودہ صفات ہمارے لیے ایک سچے رہبر دوست اور فلاسفر کا حکم رکھتی ہے زائد از نصاب مصروفیات کی مستقل کمیٹی اور دوسری مصروفیات تعلیمی سیر و سیاحت اور کشافی کے مظاہرے، ان سب سے ملک و قوم کو جو کچھ فائدہ حاصل ہوا اس کو اہل نظر بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

یہ سال انجمن کے لئے باعث صد افتخار ہے کیونکہ امسال نمائش تعلیمی کا افتتاح علیا حضرت شہزادی دُرشہوار وردانہ بیگم صاحبہ معظمہ مکرمہ نے باوجود مشاغل کثیرہ بہ نفس نفیس فرمایا جو ذرہ نوازی رعایا پروری علم دوستی، علم نوازی کا بین ثبوت ہے اور جس کی وجہ سے اس انجمن کو چار چاند لگ گئے اس عزت افزائی اور تشریف آوری سے ہمیں جو مسرت ہوی ہے وہ ناقابل بیان ہے۔

حضرات تعلیمی مسائل یوں تو بہت ہیں لیکن۔ ان میں سے چند نہایت دلچسپ اور اہم ہیں جن کا اس موقع پر ذکر غالباً بے محل نہ ہوگا۔ ہمارا موجودہ معاشرہ جمہوری نصب العین کا ایک حد تک تابع ہو چکا ہے جس کے مضر یا مفید اثرات ہمیں اپنی گرد و پیش کی زندگی میں نظر آ رہے ہیں۔ ہمارا موجودہ معاشرہ ایک عجیب مرکب ہے۔ مادیت، افادیت روحانیت، اور توہمات کا، جمہوریت، شخصیت اور انفرادیت کی عزت اور احترام پر زور دیتی ہے، جمہوریت کا تقاضا ہے کہ ایسے نوجوان پیدا کئے جائیں جن کی طبیعتیں زندہ ہوں۔ جن کے جذبات تربیت یافتہ ہوں۔ جو حساس ضمیر اور ہمدرد دل رکھتے ہوں جو مائل ہوں اچھائیوں کی طرف اور متنفر ہوں برائیوں سے، اور جو دوسروں کے جذبات اور خیالات کی عزت کریں بقول افلاطون تعلیم کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان کو اس قابل بنا دے جس کی فطری صلاحیت اس میں موجود ہے رسکن کہتا ہے کہ تعلیم کا واحد مقصد انسان کی روح کو بہترین قوتوں کی رہنمائی ہے تاکہ نہ صرف وہ خوش و خرم رہ سکے بلکہ اپنی زندگی دوسروں کے لئے مفید بنا سکے آج کل کے ماہرین تعلیم کا بھی یہی نظریہ ہے کہ متنفس کو اس کی اہلیت اور صلاحیت کے موافق مکمل انسان بنانا چاہیے۔ انسان میں کشادہ دلی۔ روشن خیالی۔ ہمدردی اور دیگر مفید اور کارآمد خصوصیات کو ترقی دینے کی کوشش وسعی کرنا چاہیے کیونکہ بغیر ان اوصاف کے وہ مکمل انسان نہیں بن سکتا اور نہ وہ اس نئے زمانہ میں زندگی بسر کر سکتا ہے۔ جہاں ہر چیز نہایت سرعت سے بدل رہی ہے۔ قدیم روایات اور رسومات اور قدیم طرز زندگی پر سختی سے حملہ کیا جا رہا ہے۔ سوسائٹی کی بنیادیں ہل چکی ہیں۔ اخلاقی اصولوں میں تبدیلیاں رونما ہیں اور ہر چیز کو ایک جدا زاویہ نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ ہمیں اپنے نوجوانوں کی تشکیل سیرت کے لیے ضرورت ہے کہ ایسے تعلیمی مشاغل اور مصروفیات فراہم کریں جو انھیں ایک آزاد شہری اور

جمہوری سماج کا ذمہ دار رکن بناسکے۔ اور وہ اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کو سمجھ سکیں۔ فرض شناسی، وقت کی پابندی، ضابطہ، تنظیم، محنت اور استقلال، راست بازی اور ہمدردی نہایت اہم خصوصیات ہیں جن کا پیدا کیا جانا لابدی ہے۔ تاکہ جہاں کہیں وہ جائیں جو کچھ وہ کریں مفید ہو نہ صرف ان کے لیے بلکہ سوسائٹی بھی ان کے اقوال اور افعال سے مستفید ہو سکے۔ انسان کی امتیازی شان یہ ہے کہ وہ خود سوچ سکے۔ اچھے اور برے کام کو جانچ سکے، اقوال اور افعال کی اضافی قدر و قیمت کو پرکھ سکے، اہم اور غیر اہم میں فرق کر سکے، اصل و نقل میں دھوکہ نہ کھائے اس کا قلب صحیح اور دماغ سلیم عارضی دلچسپیوں کی خاطر صحت کو خطرہ میں نہ ڈالے۔

حضرات! انسان کی سیرت، اس کے اعمال و کردار سب جبلی رجحانات پر منحصر ہیں۔ فطرتی جبلتوں کا اظہار ماحول اور دیگر اثرات کے تحت ہوتا ہے۔ لہٰذا ان ہی جبلی رجحانات میں ربط و ترتیب پیدا کرنا تشکیل سیرت ہے۔ مشاغل کی تنظیم ایسی ہو کہ طالب علم کے جبلی رجحانات مفید عادتوں میں مبدل ہو جائیں۔ بچہ کی سیرت کی تشکیل مشاہدے، نمونے، تجربے، اور تعلیم سے ہوتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کے فطرتی میلانات کا اظہار تعلیم، نمونہ اور ماحول کے اثرات سے متاثر ہوتا ہے اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ سیرت کی نشو و نما بچپن میں میلانات طبعی کے ذریعہ سے ہوتی ہے لیکن جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے تربیت اپنا اثر جماتی جاتی ہے سن شعور کو پہنچنے پر مکمل سیرت تربیت کا ماحصل ہوتی ہے۔ اوائل عمر ہی سے بچہ کو نشست و برخاست کے طریقے، غذا اور سونے میں باقاعدگی، غصہ کو روکنا، دوسروں کا خیال کرنا، خاطر و تواضع کے پسندیدہ اطوار پیدا کرنا، صحت بیانی، غیرت، راستی، محنت، انصاف پسندی، بزرگوں کی عزت، غریبوں اور بے کسوں کی اعانت، شفقت اور ہمدردی، ان تمام مذکورہ اوصاف کی عظمت اور ضرورت شعوری اور لاشعوری، علمی اور عملی طور پر ذہن نشین کرنا والدین اور معلم کا فرض ہے۔ استاد کی کامیابی کا دار و مدار علم الاطفال اور جبلی رجحانات کے گہرے مطالعہ پر مبنی ہے۔

قابل غور اور اہم جبلتیں

جبلت نقل و تقلید بچپن سے سن شعور کو پہنچنے تک بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مہد سے لحد تک ہم کسی نہ کسی کی نقل کرتے ہیں۔ ہمارے چلنے، زبان، الفاظ اور ان کا اشیا سے تعلق نتیجہ ہے تتبع کا ہمارے افعال اور

اقوال نقل ہیں دیکھے ہوئے افعال کی سنے ہوے اقوال کی، ہمارا لباس، غذا، اور طرز زندگی وہی ہے جو ہمارے گھر وطن یا جن سے ہم ذہنی اور دلی تعلق رکھتے ہیں ان کا ہے، تجدید اول تو ترمیم کا دوسرا نام ہے اور اگر تجدید ہو بھی تو وہ شاذ و نادر اور خال خال ہے۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ حقیقی اور عملی تقلید سے قبل ذہنی اور دلی تقلید ہوتی ہے ٹارڈے نے تقلید کے متعلق چند نہایت دلچسپ قوانین مرتب کئے ہیں۔

۱۔ اُس کا خیال ہے کہ اقلیت اکثریت کی، محکوم حاکموں کی، چھوٹے بڑوں کی، ماتحت عہدہ داروں کی نیم تربیت یافتہ مہذب اقوام کی تقلید کرتے ہیں۔

۲۔ لوگ ایسے افعال اور اقوال کی آسانی سے تقلید کرتے ہیں۔ جو دل کو لبھانے والے ہیں۔

۳۔ جن لوگوں میں پستی کا احساس ہوتا ہے وہ خواہ مخواہ اپنے سے متصورہ بلند تر ہستیوں کی نقالی کرتے ہیں۔

مشیخت یہ جذبہ انسان کو خود نمائی پر مجبور کرتا ہے۔ ناز، خود پسندی، خود نمائی، غرور، تکبر، مشیخت کی مختلف صورتیں ہیں۔ ہر شخص پر مشیخت کا بھوت سوار ہے۔ اسی کی بدولت انسان دولت، شہرت، عزت ثروت اور طاقت کا شیدائی بنتا ہے یہی جذبہ اس کو اطاعت، مصلحت، دوستی، روا داری، خدمت اور فرمانبرداری سکھاتا ہے لیکن جذبۂ مشیخت اگر گمراہ ہو جائے بھٹک کر کہیں سے کہیں نکل جائے تو یہی بختر کی تمنا اس کو ذلت اور بدنامی، سرکشی اور غداری دشمنی اور نافرمانی کے قعر ذلت میں اوندھے منہ گراتی ہے۔

تعمیر و تخریب یا جبلّت عمل یہ جبلت جو تقاضائے عمل ہے ہر بچہ میں موجود ہوتی ہے۔ اس جبلت کے عملی صفات استقلال، محنت جرأت اور حوصلہ ہیں۔ اس کی تربیت کے لیے وسائل کی تنظیم۔ مادی اور نفسی حالات کو قابو میں لانا ضروری ہے۔ نیک کام کے لئے محض نیک دل نہیں بلکہ تخیل کی وسعت، حالات کی واقفیت اور عمل کی صلاحیت بھی درکار ہے معاملہ فہمی کا مادہ ہمدردی اور فراخ دلی جذبہ تعمیر و تخریب کے رشتہ میں، اسی طرح منسلک کر دئے جائیں کہ ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہو جائیں تاکہ اپنے مفاد کے ساتھ دوسرے کا مفاد مد نظر رہ سکے۔ پروفیسر ڈیوئی تعمیر و تخریب کے جذبہ کو معہ اس کے لوازمات کے قوت عمل یا کارکردگی کے نام سے منسوب

کرتا ہے اور اپنے فلسفہ تعلیم عینی پر وحکمت میتھڈ کی تمام وکمال بنیاد اسی پر رکھتا ہے۔

ہمدردی برٹرنڈرسل۔ زیادہ زور جذبہ ہمدردی پر دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جذبۂ ہمدردی جبلت گروہ بندی کے لیے لازمی ہے۔ اور اس کی تربیت اولیٰ ہے انفرادی اور اجتماعی احساسات، جذبات اور خیالات کا احترام کرنا، ایک کی تکلیف سے دوسرے کا تکلیف محسوس کرنا، اور ایک کی مسرت سے دوسرے کا مسرور ہونا، ونیز گردوپیش کی اچھی اور بری، خوشگوار اور ناگوار چیزوں سے مناسب طور پر متاثر ہونے کی صلاحیت اپنے میں پیدا کرنا اصل ہمدردی ہے۔ اور ہمدردی ہمہ گیر اس وقت ہو جاتی ہے۔ جب احساس اور اثر نہ صرف دکھ دیکھ کر بلکہ دکھی انسانوں کے حالات معلوم کرکے پیدا ہو اس سے تہذیب نفس اور ذوق جمال کی تربیت بھی ہوتی ہے۔

تشکیل سیرت کے ذرائع

تربیت جبلت ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جبلت انسان میں مثل دیگر حقیر جانوروں کے ایسی نہیں ہوتی کہ جس کی تربیت نہ ہو سکے بلکہ اس کی تشکیل اور تربیت بڑوں کے منشاء کے موافق ہو سکتی ہے جبلت کی یہ صلاحیت تربیت اطفال کا اساسی اصول ہے جس کی واقفیت اولیاء اطفال اور اساتذہ صاحبان کے لیے ازبس ضروری ہے۔

تشکیل سیرت کے مختلف النوع ذرائع

جسمانی سزا عام اور ایک حد تک غیر موثر طریقہ تربیت جبلت کا جسمانی سزا ہے یعنی جب کبھی بچہ سے نازیبا حرکات سرزد ہوں اس کو جسمانی سزا دی جائے۔

جسمانی سزا کا اساسی اصول یہ ہے کہ لذت، عمل اور تکرار عمل کا باعث ہے اور دکھ ترک عمل کا سبب ہوتا ہے ماں خفا ہو کر باپ غصہ ہو کر، استاد مار کر بچہ کو تنبیہہ کرتے ہیں اور وہ اس کی تاب نہ لاکر اپنے رویہ کو بدل دیتا ہے معاشری دباؤ اور سیاسی قوانین بھی جبر و تشدد کی ذہنی اور قانونی شکلیں ہیں۔

جسمانی سزا، وقتیہ اور فوری انسداد کا حربہ ضرور ہے۔ لیکن کسی قسم کی بھی جسمانی سزا ہو ہمیت ہے اور یہ قطعی بربریت ہے کہ بڑوں کی جسمانی قوت کمسن بچوں کی سیرت سازی کے لیے استعمال کی جائے۔

مشق، تکرارِ عمل اور ترکِ عمل بچوں کا ماحول اس طرح کا بنانا چاہیے کہ ان کو سوائے جائز افعال کے ممنوعہ افعال کے دیکھنے، سننے اور تقلید کرنے کا حتی الوسع موقع نہ ملے غیر موزوں اشخاص اور ان کے زہریلے اثرات سے حتی الامکان بچوں کو محفوظ رکھنا چاہیے۔ اچھے نمونے ان کی نظروں کے سامنے ہوں کیونکہ نمونے اور مثال سے وہ بہت جلد اور لاشعوری طور پر سیکھتے ہیں نمونے اور مثال میں ایک جاذبی قوت ہوتی ہے۔ اور اس کا اثر ہزاروں نصیحتوں اور کتابوں سے بڑھ کر ہوتا ہے علاوہ بریں معلم کو چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ مواقع اچھے اور مفید کام کرنے کے بچوں کے لیے مہیا کرے جن کو سماج اچھا سمجھتی ہو۔ تکرارِ عمل کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اعصاب اچھے کام کرنے کے عادی ہو جائیں گے۔ معلم کو چاہیے کہ سیرت کے مختلف پہلو دل نشین انداز میں درسوں کھیلوں بحثوں، تقریبوں اور دوسرے موقعوں پر بتائے۔ نمایاں سیرت اور شخصیت کے اشخاص کو مدعو کرے ممتاز شخصیتوں کے سوانح نمونتاً ان کے سامنے پیش کرے۔ اخبار اور رسائل سے چن کر اچھی سیرت کے واقعات سنائے۔

ابدال سب سے زیادہ موثر طریقہ تربیت جبلت کا ابدال ہے۔ جس کے ذریعہ نامناسب کردار کا رخ مناسب کردار کی طرف پھیرا جا سکتا ہے۔ مثلاً قانون شکن جماعتوں کو راہ راست پر لانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ گروہ بندی کی جبلت کا اعتراف کرتے ہوئے انسانوں کے شایانِ شان معقول معیارِ زندگی کے مطالبات پورے کئے جائیں ذرائع معاش مہیا کئے جائیں پارک بنائے جائیں کھیل کود اور دوسری دلچسپیوں کے سامان مہیا کئے جائیں۔ کتب خانہ اور عجائب خانے کھولے جائیں۔ تفریح گاہیں قائم ہوں جن کو منظم کر کے ان قانون شکن جماعتوں کو امن پسند شہری بنایا جا سکتا ہے۔ جنگ و جدل کی جبلتوں کی تربیت سب سے زیادہ اہم ہے بجائے آپس میں لڑنے جھگڑنے کے فرقہ وارانہ خون ریزی کے منظم مقابلہ کے کھیلوں کے ذریعہ سے فوج اور مدارس میں برائیوں سے لڑنا، اپنے نفس سے جنگ کرنا، مشکلات کا ہمت اور جرأت سے مقابلہ کرنا نیز اپنی ذہنی اور عقلی قوتوں سے قابو پانا سکھایا جا سکتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں تشکیل سیرت خصوصاً مدارس میں علاوہ دیگر زائد از نصاب مصروفیات کے اسکاوٹنگ یا کشافہ کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ کشافہ نوجوانوں کو قوی تندرست، اور طاقتور بنانے کا ایک بہترین ذریعہ ہے ہمارا اصلی مقصد آدمی کو ضمیر کی آزادی کے ساتھ انسان بنانا ہے تاکہ ہر فرد میں وسعت نظر، اخلاقی جراءت اور عزت نفس پیدا ہو۔

حضرات! اس نہج پر تعلیم کو منظم کرنے کے بعد ہمارے نوجوان راست باز، صاف گو، محبت شعار اور آزاد ہوں گے صحیح معنی میں ادب اور فنون لطیفہ سے محظوظ ہوسکیں گے فطرت کے دلفریب مناظر سے لطف اندوز ہوسکیں گے ان میں خارجی مقاصد اور مادی منافع کے ساتھ ساتھ نفس کا تجزیہ کرکے اپنی زندگی کا جائزہ لینے کی قوت پیدا ہوگی۔ ان میں اتحاد عمل کے ساتھ ایک مشترک غرض کے لئے کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔ حکومت کی قابلیت اور اطاعت کی استعداد ہوگی اور اس طرح وہ متحد ہوکر اتحاد باہمی اور اشتراک عمل کا سبق سیکھیں گے۔

حضرات!۔ اس اعلیٰ مطمح نظر کے تحت ہمیں اپنے سرگرم، جوشیلے اور فرض شناس اساتذہ صاحبان سے قوی توقع ہے کہ وہ ملک اور مالک کی جوش عمل سے خدمت انجام دیتے رہیں گے

اب میں اپنے اس مقالے کے اختتام پر عالی جناب صدر کانفرنس اور معزز مہمانوں کا مکرر شکریہ ادا کرتے ہوئے اور اس سمع خراشی کی معافی چاہتے ہوئے اس دعا کے ساتھ رخصت ہوتا ہوں کہ ہمارے آقائے ولی نعمت تاجدار دکن حضرت سلطان العلوم حضور پرنور بندگان عالی متعالی مدظلہ العالی کا سایہ عاطفت ہمارے سروں پر مدت مدید تک قائم و دائم رہے۔
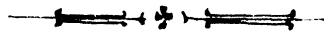
خطبۂ صدارت

دسویں سالانہ کانفرنس منعقدہ ۱۱-آذر ۱۳۴۶ف / ۱۶-اکتوبر ۱۹۳۶ء

از

جناب قاضی محمد حسین صاحب ایم۔اے۔ال ال۔بی (کینٹب) نائب معین امیر جامعۂ عثمانیہ

انجمن اساتذہ کی اس دسویں سالانہ کانفرنس کی صدارت کے لیے مجھے منتخب کرکے جو عزت افزائی میری فرمائی گئی ہے اس کا پورا احساس میرے قلب میں موجود ہے۔ جب مجھے اس اجلاس کی صدارت کی دعوت دی گئی تو میں نے اس کے قبول کرنے سے اپنی معذوری کا اظہار کیا تھا' اس لیے کہ مجھے یقین کامل تھا اور ہے کہ حیدرآباد میں اس شرف کے مجھ سے زیادہ مستحق حضرات موجود ہیں۔ جب میں ان جلیل القدر ہستیوں کا خیال کرتا ہوں جو سابق میں اس منصب پر فائز رہ چکی ہیں تو مجھے ان کے زمرہ میں شامل ہوتے ہوئے ایک طرح کا حجاب سا محسوس ہوتا ہے۔ بہرحال میں انجمن اساتذہ کا نہایت ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنی کانفرنس کی صدارت کے لیے اس سال مجھ جیسے ایک غیر معروف شخص کا انتخاب کیا۔

انجمن اساتذہ کے اراکین کے ساتھ میری وابستگی اور میرے روابط بہت گہرے قسم کے ہیں اسی لیے انہیں مخاطب کرنے کا جو موقع مجھے اس وقت حاصل ہو رہا ہے' اسے میں بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں میں فطرتاً' نیز ملازمت کے اعتبار سے خود بھی ایک استاد ہی ہوں' انتہائی مشغولیت اور کثرت کار میں بھی میں نے درس و تدریس کے ساتھ اپنا تعلق قائم رکھا ہے۔ روزمرہ کے کاموں کی کشمکش اور متعدد انتظامی فرائض کے ہجوم میں مجھے کمرہ درس کی نسبتہً ہلکی مشغولیتوں میں ایک طرح کی تفریح اور تبدیلی اور ایک قسم کا سکون محسوس ہوتا ہے کمرۂ درس بھی واقعی ایک عجیب بلند پایہ مقام ہوتا ہے' جہاں استاد کی حکومت مسلم ہوتی ہے' اور جو اس کے اور پورے قوم کے مستقبل کے مواقع کا گہوارہ ہوتا ہے۔ اس کی معمولی نشستوں پر نسل کے ہونے والے افراد نابغہ افراد ماتحت دنیا کے آئندہ شہری ایسے حالات میں دوش بدوش بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں کہ استاد کے الفاظ' اور اس کا اثر عین اس زمانے میں جب کہ انسانی دماغ انتہا درجہ کا اثر قبول ہوتا ہے' اس دماغ کی تشکیل کرتا گویا اسے سانچہ میں ڈھالتا ہے۔ ارثی خصائص میں جو ناگزیر تاثیر ہوتی ہے' اور اس سے انسانوں کی زندگیاں جس حد تک

متاثر ہوتی ہیں، اس سے قطع نظر کرکے، اگر ہم آیندہ کی امیدوں کو صرف اکتسابی خصائص اور خارجی تربیت کے ساتھ وابستہ کریں (اس لیے کہ مدارس اور ضبط تعلیمی کی ساری کائنات یہی ہیں)، تو ملنا پڑیگا کہ وسیع معنوں میں کمرۂ درس اور اس کے پورے ماحول میں جو قوت مضمر ہوتی ہے، اور اس کا جو اثر پوری قوم کی زندگی پر مترتب ہوتا ہے، اس کا صحیح اندازہ لگانا حیطۂ امکان سے باہر ہے۔ یہ امر بڑی حد تک صحیح ہے کہ اگر آپ ماہرین موسیقی کی ایک قوم پیدا کرنا چاہتے ہیں، یا شجاعت اور جرات والے انسان یا ایسے انسان پیدا کرنا چاہتے ہوں جن کے دل و دماغ پاک اور اعلیٰ مقاصد میں ڈوبے ہوے ہوں، تو اس کے لیے بہترین مقام کمرۂ درس ہی ہے جہاں جاکر آپ کو مدرس کی شخصیت سے کام لینا چاہیے آج دنیا کی تمام زندہ اقوام کمرہ درس کے حالات اور مدرس کے خصائص میں انتہائی گہری دلچسپی لے رہی ہیں۔ استاد سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ سیرتوں اور زندگیوں کی تشکیل کرے اس کی ذمہ داری بہت بڑی ہے۔ تعلیمی کی کئی کئی پشتیں اس کے ہاتھوں سے نکل نکل کر اس کے اثر ذہن اور سیرت کا نقش لیے ہوے دنیا میں قدم رکھتی ہیں۔ اب یہ محسوس کیا جارہا ہے کہ جس شخص کی استعداد محدود اور دائرہ نظر تنگ ہوگا، اس کی ان خامیوں کا عکس اس کے نوخیز مخاطبین پر بھی ضرور پڑیگا؛ برخلاف اس کے جو شخصیتیں اپنے اندر فن، سائنس یا کسی قسم کے ہنر میں فضیلت اور شرف کے جوہر رکھتی ہونگی۔ وہ جوہر قابل پاکر اس میں علم اور سرگرمی کا ایسا شعلہ روشن کر دینگی جس سے دوسرے طبائع بھی کسب نور کریں گے، اور دانش و تفکر کی قوتیں حاصل کریں گے اس طرح سے ایک فرد واحد کی خوبیاں بڑھ کر اور پھیل کر ایک پورے حصۂ ملک کو اپنی آغوش میں لے لینگی۔ جو قومیں کامل ترین قوت اور بصیرت کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرنا چاہتی ہیں، وہ اپنے مالی ذرائع کا ایک ایک حبہ تک اس جستجو میں خرچ کرنے سے دریغ نہیں کریں گی کہ جہاں کہیں سے بھی ممکن ہو کوئی ایسا شخص ہاتھ آئے جو اپنے انفاس کی برکت سے نونہالان قوم میں معرفت و حکمت کی روح پھونک دے۔ ہمارا خاص الخاص مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ایسے لوگوں ہی کی جستجو کریں خواہ اس میں ہماری ساری پونجی ہی کیوں نہ صرف ہو جائے۔ اگر اس تلاش میں کامیابی ہوی تو دوسرے لوازمات، عمارتیں ساز و سامان، طلبا سب خود بخود پیدا ہو جائیں گے۔ دنیا کے تمام حکمت کدے اسی طرح وجود میں آئے ہیں۔ اور اپنے اساتذہ کی زندگیوں اور ان کے کام کے طفیل میں مشہور ہوے ہیں۔ لیکن یہ امر ملحوظ

ظاہر ہے کہ جوہر قابل کو روپیہ آنے پائی کی میزان میں نہیں تولا جا سکتا۔ بلند پایہ سیرتوں کا اپنے علم اور اپنے ماحول کے تعلقات دونوں سے متعلق ایک خاص نصب العین ہوتا ہے۔ بلند مرتبہ شخصیت خود شناسی اور خود یابی کے مواقع کے مقابل میں اجرت کو ہمیشہ ایک کم درجہ کی چیز سمجھتی ہے۔

ابتدائی بارہ مہینے

کمرۂ درس اور استاد کی گراں بہا امانت اصل میں بچہ ہے۔ دنیا کے تمام ذرائع اور سارے مساعی اس کی صحیح تعلیم کے لیے وقف کر دیئے جاتے ہیں۔ بچہ کی تعلیم اس کے پیدا ہوتے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ اس تعلیم کے ابتدائی بارہ مہینے خاص طور پر نازک اور اہم ہوتے ہیں، اور اس کی آیندہ زندگی کی تشکیل پر جس کے ممکنات کا احصا تعریف اور تحقیق کے دائرے سے خارج ہے ان کے گہرے اثرات پڑتے ہیں۔ یہ نووارد مہمان دنیا میں قدم رکھتے ہی بالکل ہی نئے حالات سے دوچار ہوتا ہے اس کے ذہن پر کمال سرعت کے ساتھ نئے نئے ارتسامات ہوتے ہیں۔ اگر اس نئے مہمان کو اپنے نئے مسکن میں ٹھیرنا اور اس میں بہ آسانی بسر کرنا ہے، تو ضروری ہے کہ نئے ارتسامات کے جوابی اعمال بھی جلد جلد ظاہر ہوں اور نئے حالات کے ساتھ ساتھ جلد از جلد توافق پیدا ہو۔ شروع ہی سے بچہ قدرت کی طرف سے جبلتیں اور اضطرارات لئے ہوئے پیدا ہوتا ہے اور یہ حیرت انگیز سرعت کے ساتھ پختہ ہو کر عادت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں یہی عادتیں کسی فرد کی آیندہ سیرت کی اٹل بنیادیں ہوتی ہیں۔ قدرتی عناصر مثلاً روشنی، اندھیرا، شور، حرکات، اشیا وغیرہ معصوم دماغ کو متضاد ارتسامات کے نرغہ میں لے لیتے ہیں، اور شروع میں بچہ کی زندگی کو دشوار اور تکلیف دہ بنا دیتے ہیں۔ اس نوبت پر ضروری ہے کہ علم اور عقل کی روشنی میں انسانی محبت اور ہمدردی اس نووارد کی دستگیری کرے اور اس کی ابتدائی تکالیف کو رفع کرے بچہ کی یہ حالت سراسر بے بسی اور بے چارگی کی ہوتی ہے، پورے حالات کو کما حقہ سمجھ کر، جو چنداں آسان کام نہیں ہے، کامل حزم و احتیاط کے ساتھ اس کی جسمانی ضروریات کی تکمیل کرنی پڑتی ہے۔ یہ حزم و احتیاط دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں مسلسل کرنی پڑتی ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے پوری طرح عہدہ برآ ہونا صرف اس راسخ اور قوی جبلت ہی کی وجہ سے ممکن ہے جو محبت پر مبنی ہو۔

بچہ کی اس زمانے کی حالت کچھ عجیب پُراسرار ہوتی ہے، اس کا رونا اور اس کی حالت بس انہی دو باتوں سے اندازہ کرنا ہوتا ہے، اور ان کی تحلیل کرنے اور ان کے سمجھنے کے لیے اعلیٰ درجہ کی

فراست کی ضرورت ہوتی ہے قطع نظر اس کے دیکھ بھال اور ماتا میں مناسب اعتدال بھی قائم رکھنا ہوتا ہے، اس لیے کہ ہر قسم کی افراط و تفریط راسخ ہو کر عادت کی شکل اختیار کر لیتی ہے، اور بعد میں جبلت بن کر پوری قوت اور استحکام کے ساتھ کارفرما ہوتی ہے۔ یہ زمانہ اپنے اندر گہری معنویت رکھتا ہے۔ اس لئے کہ صحت کی بنیادیں اسی زمانے میں رکھی جاتی ہیں، مزاج اور سیرت کے چربے بھی اسی زمانے میں قائم ہوتے ہیں، غرضکہ ننھا سا انسان پیدا ہو جاتا ہے۔ جزئیات کے بارے میں انتہائی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ آیندہ زندگی کو با اصول بنانے کے لیے ابھی سے پابندی اور باقاعدگی کی ضرورت ہے۔ اس زمانے میں کوئی غیر معمولی بات واقع نہ ہونے دی جائے، بلکہ ہر چیز واقعات کی معمولی رفتار کے ساتھ مطابق اور ہم آہنگ ہو۔ ذہنی استعدادوں اور خوشگوار پہلوں کو جیسے جیسے وہ بروے کار آتی جائیں، قدرتی طریقہ پر تقویت دیجائے، لیکن ان کے نشو ونما کی رفتار میں کوئی مزاحمت نہ ہونے پائے۔ ماتا حد سے متجاوز نہ ہو، بچہ کی ناز برداری ضرورت سے زیادہ نہ ہو، ورنہ اس جبلت کا بیج آگے چل کر پھوٹے گا۔ جو لوگ بچہ کی حوائج کی تکمیل کے ذمہ دار ہیں ان کی طرف سے بھولے سے بھی خوف کا کوئی اشارہ ظاہر نہ ہو، ورنہ خوف کا جو سرچشمہ اس کچی عمر میں ہوگا، وہ عجب نہیں کہ آیندہ زندگی میں اور پھیل جائے۔ بچے کے قویٰ محدود ہوتے ہیں، لیکن اس کی ذہنی کائنات وسیع ہوتی ہے، ایک سال کے اندر وہ اتنا کچھ، اور اس حیرت انگیز سرعت کے ساتھ، اور پیے مستقل طور پر سیکھ لیتا ہے کہ آیندہ زندگی کے کسی دور میں اس کی نظیر ملنی ناممکن ہے۔ اس کے وجود کے اس نازک دور میں ماں اس کی معلمہ ہوتی ہے۔ قدرت اس زمانے میں ماؤں میں ایسی جبلتیں ودیعت کر دیتی ہے جو بچہ کی جبلتوں کی پوری طرح ہمنوا ہوتی ہیں۔ یہ حصہ اور یہ شرف ماؤں کا ہی ہے وہ بنی نوع انسان کو خصوصاً زندگی کے اس نازک دور میں پروان چڑھتے دیکھتی ہیں۔ حیات انسانی کے صدہا سال سے مائیں دن اور رات اپنی امانت کی حفاظت کرتی آئی ہیں۔ اس بارے میں ان کی ریاضت اور ان کا صبر فوق الانسانی اور شان ربانی کا مظہر ہے اور یہ قصور دنیا کے حالات کا ہے کہ انھیں اپنے اس ذمہ دارانہ کام سے کما حقہ عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری علم اور فراست کا سرمایہ نہیں دیا جاتا۔

عورت — عورت ہی نسل انسانی کا سرچشمہ ہے۔ حالات زندگی سد راہ بن کر اُسے

اس کے مواقع سے پوری طرح بہرہ اندوز نہیں ہونے دیتے، اور حصول علم اور تربیت ذہنی کے فوائد اس کے حق میں محدود کر دئے گئے ہیں۔ وہ اپنی ذمہ داریوں کی گراں باری کی وجہ سے ابھرنے نہیں پاتی۔ اس سے اس کی بساط سے زیادہ کی توقع کی جاتی ہے، اور اس کی حالت کی اصلاح کے لیے جتنا کچھ کرنا چاہیے وہ نہیں کیا جاتا۔ بنی نوع انسان کا آدھا حصہ مدرسہ جاتا ہے اور آدھے کے لیے مدرسہ کے دروازے بند ہیں۔ ایک ایسا معاشرہ جس کے نصف اراکین تو تعلیم و تہذیب کی بیشتر سہولتوں کی وجہ سے زندگی اور فکر کے متعلق اعلیٰ درجہ کے ذہنی نصب العین قائم کرتے ہیں، لیکن بقیہ نصف نسبتاً جہالت میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ آخر میں چل کر سوءِ اعتدال کی حالت پہنچ جائے گا۔ ان نتائج کے قطع نظر، حالات زمانہ کی سخت گیری کی وجہ سے وہ اپنی ان غیر محدود ذمہ داریوں سے بھی پوری طرح عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ جن پر نسل کی آئندہ فلاح و ترقی منحصر ہے۔ صرف یہی نہیں ہے کہ اس کے لیے تعلیم کے مواقع محدود کر دئے گئے ہیں، بلکہ فی زمانہ ایسے حالات بھی نظر آتے ہیں جن کے باعث اس کی آزادی، اور زندگی سے پوری طرح تمتع حاصل کرنے میں بھی رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ جن سے اس کی صحت جسمانی پر مضر اثر پڑتا ہے اور آیندہ اولاد آدم کو ان نتائج کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے، اس کی جان داری اور تنومندی بتدریج کم ہوتی جاتی ہے، اور یہ سلسلہ قائم ہو جاتا ہے، حتّٰی کہ ایک وقت ایسا آتا ہے جب کہ بنی آدم کے ان اعضا کا نشوونما قطعاً مسدود ہو جاتا ہے۔ جو اولاد ان حالات کی آفریدہ ہو اس سے یہ توقع رکھنا کہ۔ وہ آزاد حالات زندگی میں پیدا ہونے والے بچوں کے ہمدوش ہو، بلکہ ان سے بھی سبقت لے جائے، ہرگز قرین انصاف نہیں خود قدرت نے بھی عورتوں کے حق میں ظلم سے کام لیا ہے، زندگی کی جست و خیز میں وہ گلے میں پتھر باندھ کر شریک کی گئی ہے۔" انسان کا فرض ہے کہ وہ اس بات کا خیال رکھے کہ قدرت نے جو بوجھ عورتوں پر ڈالا ہے، اس میں ایک ذرہ کا بھی اضافہ نہ ہونے پائے اور عدم مساوات کے گناہ میں بے انصافی کے گناہ کا اضافہ نہ ہونے دیا جائے۔" خواہ تعلیمی طریقہ استعمال کئے جائیں یا کوئی اور طریقے، جب تک عورت کی حالت کی اصلاح نہ ہوگی بنی نوع انسان کی حالت کی بہتری کی بھی کوئی امید نہیں ہو سکتی۔

بعد کے پانچ سال اب ہم بچہ کی زندگی کے آیندہ پانچ سال پر نظر ڈالتے ہیں عام طور پر

یہ رائے ظاہر کی جاتی ہے کہ چھ سال کی عمر کو پہنچنے تک بچہ کی اخلاقی تعلیم مکمل ہو جانی چاہیے جب ابتدائی بارہ مہینے صحت اور خوشی کے ساتھ گذر جائیں تو بچہ زندگی کے نسبتہً آسان تر راستہ پر پڑ لیتا ہے چلنے اور بات چیت کرنے سے آزادی کے نئے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اور اس عمر میں تجسس لامحدود ہو جاتا ہے۔ ان چیزوں سے معلم کو نئے مواقع ہاتھ آتے ہیں۔ بچہ ہر لمحہ معمولی فطری اصول اپنے قوی اور دائرۂ نظر کو بڑھاتا رہتا ہے اور معلم مناسب موقعوں سے فائدہ اٹھا کر فیاضانہ اثر آفرینی اور پُرخلوص ہمدردی کے ذریعے اچھی عادتوں کو ترقی دیتا ہے لیکن اپنی ان نئی جولانیوں میں اگر بچہ کا ڈر ہوتا ہے، جیسے جیسے اس کی نازک قوتیں فطرت کی قوتوں سے متصادم ہوتی ہیں اس میں بعض اور قسم کے ڈر بھی پیدا ہو جاتے ہیں مثلاً اندھیرے اور پرچھائیوں کا خوف، شور کا خوف، متحرک اشیاء کا خوف، اجنبی اشخاص اور پراسرار اور غیر المعقول حالات کا خوف وغیرہ۔ زندگی کے اس دور میں تربیت کا بنیادی اصول یہ ہونا چاہئے کہ ہر قسم کے خوف کو بچہ کی زندگی سے خارج کر دیا جائے۔ اس کی مسرتوں اور خوشیوں کو روزانہ آغوش فطرت میں نشوونما پانی چاہیے، لیکن جب یہ معلوم ہو جائے کہ کسی قسم کا خوف بھی اس کی سطح شعور کی تہہ میں سرایت کر گیا ہے تو اس کے خلاف تمام حربے اور تمام حکمتیں مثلاً تعریف، الزام، اثر آفرینی، ہمسنوں کی صحبت وغیرہ خوف کی بیخ کنی کے لیے استعمال کئے جائیں اور جب تک اس بات کا کامل یقین نہ ہو جائے کہ خوف تحلیل ہو چکا ہے، اور اب بچہ کی طبیعت اور اس کی روح، سب خوف کی طرف سے پوری طرح مطمئن اور پُرسکون ہے، اس وقت تک تدبیر میں کمی نہ کی جائے۔ اس حالت کی تدریج اصلاح کرنے میں اگر کئی دن بلکہ کئی مہینے بھی صرف ہو جائیں تو بھی کوئی مضایقہ نہیں۔ خوف کے تمام اسباب کا سدباب اسی طریقے سے کرنا چاہیے۔ خوش قسمتی سے اس عمر کے خوفوں میں سے بیشتر مکتسب، اور بہت کچھ جبلی ہوتے ہیں لیکن خوف مکتسب ہو یا جبلی، نوخیز زندگیوں سے خوف کی بیخ کنی ہر ممکنہ طریقے سے کرنی چاہیے۔ غیر عقلی خوفوں کو ختم کر دینا چاہیے۔ سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ مدرس یا اور کوئی شخص جو بچہ کا ذمہ دار ہو خود بھی کسی قسم کے خوف کا اظہار نہ کرے ورنہ اس کے جذبہ کا عکس بچہ پر ضرور پڑے گا۔ سیرت کے ہر قسم کے اختلال کی اساسی وجہ خوف کا وجود ہی ہوا کرتی ہے، بلکہ جہاں خوف ہو، وہاں سیرت پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ ہمہ قسم کے توہمات، مجہولیت کے اسباب

دماغ کی غیر عقلی کمزور حالتیں ان سب کی جڑیں جذبۂ خوف ہی کے اندر پائی جاتی ہیں۔ معاشرہ میں اندرونی کشاکش کی جو بعید از فہم رودیں نظر آتی ہیں۔ نیز بنی نوع انسان کے مظالم اور جنگ و جدال، ان سب کی آخری اساس خوف ہی ہے۔ اس علت کو دور کر دیا جائے تو جرات، جانداری، حوصلہ مندی اور ذہانت کے نشو ونما کے موافق حالات پیدا ہو جائیں گے، اور انہی چیزوں کا پیدا کرنا دراصل تعلیم کا اصل مقصد ہونا چاہیے۔ جرات جیسے جملہ اجزائے سیرت پر فضلیت حاصل ہے، ضبط نفس اور ارادی قوت کے تحت استعمال ہونی چاہیے، اور وہ ہر حالت میں ایک اچھی صفت ہے لیکن جو جرأتِ ضبط نفس کے علی الرغم ہو وہ عصبی اختلال پیدا کرتی ہے، کوشش یہ ہونی چاہیے کہ بچہ کی سیرت میں اچھی عادتوں اچھے افعال کی تدریجی نشوونما سے جرات ذہنی پیدا کی جائے، لیکن اس کی آزادی یا اس کی والہانہ فعلیت میں کسی قسم کی خلل اندازی نہ ہونے پائے۔

بتدائی مدرسہ شروع کے چھ سال کا زمانہ مدرسہ کی عمر میں داخل نہیں ہوتا۔ تعلیمی نظاموں میں اس کی کوئی رعایت نہیں رکھی جاتی، اس عمر میں گھر کا اثر ہی کافی سمجھا جاتا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بہترین خاندانوں کو اس بارے میں بڑے موقع حاصل ہوتے ہیں جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ گھر میں فراست اور جدید معلومات کے ساتھ بچہ کی دیکھ بھال محبت کے ساتھ کی جائے۔ غالباً خوش حال گھرانوں میں اس بارے میں بہت کچھ کیا جا سکتا ہے، لیکن کچھ قدرتی مشکلات بھی ہوتی ہیں ممکن ہے کہ والدین سمجھدار ہوں، اور ضروری معلومات بھی رکھتے ہوں، لیکن عدیم الفرصت ہوں، یا گھر میں ہمسنوں کی صحبت میسر نہ آسکے۔ چھوٹے گھرانوں میں اس کا خطرہ ہوتا ہے کہ بچہ لاڈ پیار سے خراب نہ ہو جائے۔ علاوہ بریں والدین سے جزئیات کی اس مہارت، واقفیت اور تجربہ کی امید بھی نہیں کی جا سکتی جو اس عمر میں تربیت کے لیے ضروری ہوتا ہے اس زمانۂ عمر میں جو بچہ کی زندگی میں بے حد اہم ہوتا ہے مسلسل صبر، چوکسی اور سمجھ بوجھ کر اثر آفرینی کی ضرورت ہوتی ہے۔ تب کہیں جا کر بچہ میں مسرت بخش اور مفید عادتیں قائم ہوتی ہیں۔

اس عمر کے لیے جو تعلیم ضروری ہے وہ ان مدارس میں حاصل کی جا سکتی ہے جنھیں "ابتدائی مدارس" کہتے ہیں دو سے چھ سال کی عمر تک کے بچے ایسے مدارس میں پورا دن یا دن کا کچھ حصہ گزارتے ہیں وہاں ان کی صحت، غذا، آرام، کھیل، مہارت، ذہانت غرض کہ علمی اصولوں پر ہر جہتی نشو ونما کا

انتظام کیا جاتا ہے بعض ممالک میں اس قسم کے مدارس سے نہایت اچھے نتائج رونما ہوئے ہیں اور بہت غریب گھرانوں کے بچے بھی عمدہ اور اچھے ہاتھ پاؤں والے بنا دیے گئے ہیں۔ "ایسے مدارس میں تعلیم پائے ہوئے بچے' بیدار ذہن، ملنسار اور زندگی اور نئے تجربات کے شوقین ہوتے ہیں،" وہ باغبانی پودوں اور جانوروں کی حفاظت سے بھی تھوڑے بہت واقف ہوتے ہیں، وہ نہ صرف اپنی، بلکہ اپنے سے کم عمر والے بچوں کی بھی مدد کرتے ہیں، کھیلتے کودتے، اور بچپن کی مسرتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بعد میں چل کر تعلیم کی مبادیات سے انھیں روشناس کرایا جاتا ہے اور اس سے بہت حوصلہ افزا نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔ چونکہ بستانی مدارس کی پرداخت سے بچوں کے ذہنی اور جسمانی قویٰ بیدار ہو جاتے ہیں اس لیے وہ آیندہ عمر میں مدرسہ کے باقاعدہ نصاب کی تکمیل کے لیے بھی زیادہ تیار رہتے ہیں۔ اس سے متعلمانہ زندگی کے ہر درجہ میں سیرت اور تحصیل تہذیب کے معیار بھی جلد بلند ہو جاتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ ہوگا کہ "بیماریوں کی مصیبت و نکبت" دور ہو جائے گی۔ سدو جبلت اور ذہنی نقص کے مضر اثرات مٹ جائیں گے' اور مسرت اور صحت کی زندگی حاصل ہوگی۔ اس قسم کے مدارس کچھ ایسے بیش خرچ بھی نہیں ہوتے۔ ان کی ابتدا اس طرح ہوی کہ مناسب اور موزوں مکانات میں غریب گھرانوں کے بچوں کے لئے بڑے بڑے کمرے مختص کر دیے گئے اور بچوں کی نگرانی کے لیے ایسے اشخاص متعین کیے گئے جو ان سے محبت کرنے کے علاوہ ضروری معلومات اور فراست بھی رکھتے تھے۔ اس طرح جو نتائج رونما ہوئے اُن سے یہ حقیقت ثابت ہوگئی کہ اگر ابتدا ہی سے احتیاط کی جائے تو ایسے گھرانوں کے جسمانی اور ذہنی نقائص کی تلافی بھی ممکن ہے۔ جو کسی طرح سے بھی اعلیٰ معیار کے نہیں کہے جا سکتے۔ نوخیز ذہنوں کی تشکیل کی جو قوت سائنس اور علوم جدیدہ کی بدولت انسان کو حاصل ہوئی ہے وہ ایک پرہیبت قوت ہے اور اچھے اور بُرے دونوں طرح کے نتائج رکھتی ہے۔ اس قوت کے ذریعے موجودہ انسانوں سے بھی زیادہ سنگدل اور بے رحم انسان پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ یہ امر نہایت ضروری ہے کہ یہ قوت موزوں لوگوں کے ہاتھوں میں دی جائے۔ "تعلیم محبت پر مبنی ہونی چاہیے اور اس کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ بچوں میں بھی محبت کا سرچشمہ جاری ہو جائے۔" ایک اوسط مرد میں خرد سال بچوں کے ساتھ نرمی، محبت اور تحمل کیساتھ پیش آنے کی ضروری قابلیت غالباً نہیں ہوتی، پس عورتوں کی اعلیٰ اور مکمل تعلیم کے لیے قوی وجوہات

موجود ہیں۔ مختصر یہ کہ اوائل عمر میں جبلتوں کی تربیت سے تشکیل سیرت کے بارے میں اہم نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں صحیح عادتیں، اور صحیح مہارتیں پیدا کر کے بچوں کی جبلتوں کو خود بخود سود مند افعال کا محرک بنایا جا سکتا ہے۔ اس طریقۂ عمل میں کسی قسم کا تشدد، سزا، تسدید اور مزاحمت نہیں ہوتی بلکہ دوران تربیت میں بچہ کو کامل آزادی اور والہانہ فعلیت کا احساس ہوتا ہے۔ اس سے نسل انسانی کے لیے عجیب وغریب ممکنات کے دروازے کھل جاتے ہیں، "صحت، مسرت، آزادی، محبت اور ذہانت کا حصول یہ سب فطرت کے عمومی اجزا بن سکتے ہیں اور تمام نوخیز زندگیوں کی سطح میں پیوست رہ سکتے ہیں۔" "اگر ہم چاہیں تو ایک قرن کے اندر ہی عہد زرین پیدا ہو سکتا ہے" نسل انسانی کی جس پشت کی تعلیم بے خوف آزادی، اور زندگی کی باطنی مسرت کے ساتھ ہوگی، وہ وسیع تر اور اعلیٰ تر زندگی بسر کرے گی۔ تربیت، جبلت، اور ابتدائی مدرسہ سے یہ نتیجہ حاصل ہو سکتا ہے۔

مدرسہ کی تعلیم کا زمانہ

اس عمر کے بعد بچہ کسی مناسب مدرسہ میں داخل کیا جاتا ہے، اب دنیا کے تعلیمی نظام اسے اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں تعلیم کے آخری مدارج کے حالات سے ہم سب اچھی طرح واقف ہیں۔ ہم سب ان نظامات کے تحت رہ چکے ہیں۔ یہاں اور ہر جگہ ہزارہا بچوں کی تعلیم اسی لیے ہو رہی ہے کہ وہ بھی انہی مدارج سے گزر سکیں تعلیم کے مکتبی یا مدرسہ کے دور کے متعلق بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے، اور جن اغراض ومقاصد کا تعلق نصاب تعلیم کے بعد کے حصول سے ہے ان کی تکمیل کے لیے سرگرمی کے ساتھ کوشش جاری ہے، اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس میں بہت کچھ کامیابی بھی ہوئی ہے۔ اس بارہ میں میرا اظہار خیال صرف ان مشاہدات اور اشارات کی حد تک ہوگا جو تعلیمی زندگی کے بعد کے دوروں میں متضمن ہیں۔ جیسے جیسے حالات اور مواقع اجازت دیں تعلیم بغرض خواندگی کو بچہ کی زندگی میں زیادہ دور تک وسیع کرنا چاہیے خاص طور پر اس منزل میں معلومات، اشیا، اور حالات کے توسط سے حاصل ہونا چاہیے، ان سے الگ نہ کیے جائیں۔ بچپن کی سرگرمی اور مسرتوں کو تازہ رکھنا چاہیے، اور تفریحی مشاغل میں اجتماعی شرکت عمل کو تقویت پہونچائی جائے ثانوی اور بعد کے مدارج کی تعلیم کے لیے تو مفید مطلب اور خاصے اچھے مدارس موجود ہیں، لیکن مدارس تحتانیہ جیسے ہونے چاہئیں، ویسے نہیں ہیں، ان پر نسبتہً بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ نظام تعلیمی کے اس جزء پر روز افزوں توجہ کریں۔

اس کی جو غرض اشاعت خواندگی کی ہے وہ مناسب طریقے پر پوری ہونی چاہئے۔ حال میں جو تحقیقاتی کمیشن بٹھائے گئے ہیں، ان میں سے ایک نے ہندوستانی نظام تعلیم کے اس درجہ کے متعلق حسب ذیل الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے۔ "خواندگی کے معیار سے جانچا جائے تو مدارس تحتانیہ زیادہ تر اپنے مقصد میں ناکام نظر آتے ہیں" اس لئے کہ "متعلمین کی وہ تعداد جسے تکمیل نصاب کے بعد خواندہ ہو جانا چاہئے، کل تعداد شرکا کے مقابلہ میں بہت حقیر ہوتی ہے"۔ تحتانی درجہ ہی ملک کی آیندہ جد وجہد کے لیے معاون کا حکم رکھتا ہے، اس لیے حالات کا اقتضا یہی ہے کہ خواندگی کی درسگاہوں کو زیادہ موثر اور زیادہ عام کر دیا جائے چودہ سال کی عمر تک ایسے مضامین کی تعلیم دی جائے جن سے ہر شخص کو واقف ہونا چاہئے، اور بعد میں خصوصی مہارت ہونی چاہیئے۔ عموماً صرف ایسی ہی باتیں سکھائی جائیں اور دلچسپ بنا کر سکھائی جائیں جو براہ راست مفید ہوتی ہیں۔ لیکن یہ اصول بہت زیادہ دور تک کام نہیں دے سکتا۔ طلبا کو تعلیم کے سخت گیر ضبط کا عادی بنانا چاہئے، وہ چیزوں سے محض اس وجہ سے ہاتھ نہ اٹھا بیٹھیں کہ وہ مشکل ہیں اس زمانے میں تعلیم کا ایک مقصد یہ بھی ہونا چاہیئے کہ طلبا کے خاص خاص رجحانات معلوم کئے جائیں۔ اس امر کی ضرورت ہے کہ عرفی اور صوری تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبا کو کسی مفید فن یا ہنر میں ہاتھ سے کام کرنے کے مواقع بھی دے جائیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ خالص علم کے اجزا بھی وہی طلبا زیادہ بہتر طریقہ پر ذہن نشین کر سکتے ہیں جن کے صوری مطالعہ اور دستی کام میں مناسب ترتیب اور ربط پیدا کیا جائے۔ دستی کام سے پڑھنے لکھنے کے کام کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ ایسے طلبا کو دوسروں پر یہ فوقیت حاصل ہوتی ہے کہ وہ اپنے علم کو اشیا اور حقائق پر منطبق کر سکتے ہیں۔ آج سے بہت زمانہ قبل جو خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ "ہر تصور کا مقصد یہ ہے کہ کچھ کیا جائے"۔ مجھے اس سے پورا اتفاق ہے۔ ہماری تعلیمی تجاویز میں اس اصول کی اہمیت بخوبی ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ جو بچے اپنے ذہنوں سے کام لیتے ہیں وہ اپنے ہاتھ سے بھی کچھ کریں۔ اس سلسلہ میں، میں دارالضرب کے ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ کے اسکول کا ذکر کر سکتا ہوں جہاں طلبا عرفی تعلیم کے ساتھ کارخانہ کے حالات کے تحت دن کا کچھ حصہ پیدایشی کاموں میں بھی صرف کرتے ہیں خود اس درسگاہ میں بھی جہاں یہ کانفرنس منعقد ہو رہی ہے نجاری، آہنگری، اور اسی قسم کی دستی تعلیم روز افزوں ہے۔ دستی تعلیم کی تدریجی توسیع کو میں اس ریاست کی تعلیمی

پالیسی میں ایک مبارک اقدام تصور کرتا ہوں۔ اسی سلسلہ میں مجھے اس وقت یہ یاد کرکے مسرت ہوتی ہے کہ کسی زمانے میں میں نے سٹی انٹرمیڈیٹ کالج میں خراد کا کام شروع کرنے میں مدد دی تھی جو کسی مقام میں دستی تعلیم کے امکانات کو ترقی دینے کا ایک ضروری اور اہم جز ہوتا ہے۔

ابھی حال میں مدرسہ کے زمانے کے آخری سالوں کو بہت کچھ اہمیت دی گئی ہے۔ ان کا تعلق ایسے طلباء سے ہوتا ہے جو عمر میں بڑے، تربیت فکری پائے ہوئے، اور تجربہ کے اعتبار سے مقابلتہً پختہ ہوتے ہیں۔ انھیں ان کے درسی مشاغل میں نسبتاً زیادہ آزادی دی جائے، اور آیندہ کی خصوصی واقفیت کے بیج اسی زمانے میں بوئے جائیں متعلمین کو تنہا انفرادی کام کے لئے وقت دیا جائے اور ان کے مطالعہ اور ہنر کے کاموں میں اُپج اور تجربہ کی روح پیدا کی جائے مدارس میں مناسب ساز و سامان سے آراستہ بڑے بڑے ہال ہونے چاہئیں جہاں جاکر طلبار بطور فرض خاموشی کے ساتھ اور انفرادی طور پر مطالعہ کریں۔ اس منزل پر علوم انسانیہ اور سائنس دونوں مطالعہ کے نصاب میں داخل ہونے چاہئیں۔ جدید حالات کے نشو و نما کے لحاظ سے تعلیم کا نیا دور خاص اہمیت رکھتا ہے۔ عام طور پر یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اعلیٰ ثانوی تعلیم کی خاص غرض یہ ہونی چاہیے کہ وہ بلندی سیرت، کارکردگی، اور قابلیت کے صفات پیدا کرے، اس لیے کہ مستقبل قریب میں انتظام ملکی کی تفصیلی ذمہ داریوں کا بوجھ زیادہ تر اعلیٰ ثانوی مدارس کی پیداوار ہی کو اٹھانا پڑے گا۔ اس سے ایسے ادارات کے قائم کرنے کا جواز نکلتا ہے جن میں تعلیم صرف "برائے نام چند باتیں اور چند خیالات سیکھنے کا نام نہ ہو بلکہ اپنے پورے معنوں میں انسان کی ہرجہتی تکمیل سمجھی جائے" مطلوبہ صفات پیدا کرنے کی غرض سے اس دور کی تربیت کو زیادہ موثر اور نتیجہ خیز بنانے کے لیے یہ تحریک پیش کی گئی ہے (اور تعلیمی نیز دوسرے وجوہات کی بنا پر بھی یہی تحریک ہوئی ہے) کہ اعلیٰ ثانوی منزل پر مدت نصاب بڑھا دی جائے اور طلبار نسبتہً چھوٹی عمر میں جامعہ میں داخل ہونے کے لیے بیتاب نہ ہوں۔ اس سلسلہ میں ذیل میں حالیہ رپورٹوں میں سے ایک رپورٹ کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

"ہمیں اس امر کے متعلق کافی اطمینان نہیں ہوا ہے کہ طلبار کو ان مضامین کی جنہیں مدرسہ کی تعلیم کے بنیادی مضامین کہا جاتا ہے، ہمیشہ قرار واقعی گہری تعلیم دی جاتی

ہے یا نہیں۔ علاوہ اس کے ہماری رائے میں اس قسم کی تعلیم ایک اچھے اور باقاعدہ مدرسہ میں ہونی چاہیئے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر طلبا ۱۵ برس (بلکہ اس سے بھی کم عمر میں) میٹرک پاس کر کے کالج کا رخ کرتے ہیں اس طرح وہ مدرسہ کی زندگی کی صحت بخش تحریک سے مستفید نہیں ہونے پاتے، اور ان صفات کی مناسب تربیت سے بھی محروم رہ جاتے ہیں جو کامیاب زندگی کے لیے نہایت اہم ہیں۔ کالج کی تعلیم خواہ دوسری حیثیتوں سے کتنی ہی سودمند کیوں نہ ہو، یہ امر واقعہ ہے کہ وہ ایسے لڑکوں کے لیے جو کسی پیشہ کی تحصیل کی تیار کر رہے ہیں، مدرسہ کی تعلیم کا بدل ہرگز نہیں ہو سکتی، جہاں مدرسہ کا ضبط مدرسہ کے کھیل اور مدرسہ کے کام کے طریقے موجود ہوتے ہیں"۔

تعلیم کی تنظیم جدید کی تمام تجویزوں میں بھی تعلیمی زندگی کے اسی دور کو خاص اہمیت دی جاتی ہے اور اس منزل پر پہنچ کر صنعتی اور دوسری حرفتوں کی تربیت کے لیے الگ الگ شاہراہیں نکالی جاتی ہیں۔

اس درجہ میں جامعہ کی زندگی کے لئے بھی حقیقی معنوں میں تیاری کی جاتی ہے۔ جامعہ کے استاد کو ہر جگہ یہ شکایت ہوتی ہے کہ طلبا، جامعہ میں اعلیٰ مطالعہ کے لئے ناکافی ساز و سامان کے ساتھ داخل ہوتے ہیں۔ اگر مناسب استعداد فراہم کی جائے تو اس نوبت پر طریق تعلیم کے معیار کو بلند کر کے کچھ اصلاح کی جا سکتی ہے۔ نظامات تعلیم میں تعلیم المعلمین کیلئے بھی کافی سہولتیں بہم پہنچائی گئی ہیں، اور اس بارے میں جو کوشش اور روپیہ صرف ہوتا ہے، حاصلہ نتائج سے اس کی کافی تلافی ہو جاتی ہے۔ ہر ریاست میں اس چیز کو قطعی طور پر تعلیمی پالیسی قرار دینا چاہیئے کہ اساتذہ انھیں اصولوں پر (جن پر کہ کلیۃ المعلمین میں ان کی تعلیم ہوئی ہے) مختلف مضامین میں جامعہ میں شریک ہو کر گریجویٹ ہونے کے بعد بھی مطالعہ جاری رکھ سکیں۔ باعتبار قوت و کارکردگی، ہندوستانی جامعات کے ایم۔ اے یا ایم۔ ایس۔ سی کامیاب طلبا، باعتبار قابلیت محض بی۔ اے اور بی۔ ایس۔ سی کامیاب کرنے والوں پر نمایاں تفوق رکھتے ہیں۔ ٹریننگ سے ایک معمولی گریجویٹ کو بڑی حد تک بیشک مدد ملتی ہے لیکن جو مضمون وہ پڑھاتا ہے، اس میں اس کی ناقص واقفیت کی اصلاح ٹریننگ سے نہیں ہو سکتی۔ اگر اعلیٰ ثانوی تعلیم کے ذہنی معیاروں کو بلند کرنا مقصود ہے تو ایسے مدارس کو ٹرینڈ

ایم۔ اے اور ایم ایس۔ سی کامیاب اساتذہ کی نگرانی میں رکھنا چاہیے۔ اس سے مدرسہ کی تعلیم کے آخری سالوں میں علمی ترقی اور اعلیٰ معیار پیدا ہوں گے، اور جامعات میں ایم۔ اے، ایم۔ ایس۔ سی کے کام میں بھی زیادہ نشو و نما ہوگی، جس سے سارے تعلیمی نظام کو ترقی اور تقویت ہوگی۔ انٹرمیڈیٹ کی جماعتوں کو مدارس سے ملحق کر دینے کی تجاویز میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ مدارس کی تعلیمی سطح (جو تمام و کمال اساتذہ کی اعلیٰ قابلیت پر منحصر ہوا کرتی ہے) اتنی بلند نہیں ہوئی کہ وہ اس اعلیٰ تعلیم کا بار برداشت کر سکے جو (انٹرمیڈیٹ جماعتوں کی منتقلی سے) مدارس پر عائد ہوتا ہے۔

جامعہ

ہندوستان کی جامعات شروع میں بجائے تعلیم گاہیں ہونے کے، ایسے ادارات کی حیثیت رکھتی تھیں جن میں کسی دوسری جگہ دی ہوئی تعلیم کی قدر و قیمت جانچی جاتی تھی۔ وہ لندن یونیورسٹی کے نمونہ پر محض ایک امتحان لینے والا اور الحاق کرنے والا ادارہ تھا۔ ۱۹۰۰ء میں لندن یونیورسٹی کی حیثیت میں ترمیم کی گئی، اور امتحان لینے کے فرائض کے ساتھ ساتھ تعلیم دینے کے فرائض بھی اس پر عائد کیے گئے۔ اس صدی کے شروع میں نظام جامعہ کے نقائص پر سختی کے ساتھ تنقیدی نظریں پڑنے لگیں۔ سخت اور بے اوج نصاب ہائے تعلیم، مضامین نصاب کی یکرنگی، معیار تحصیل کی پستی، اساتذہ اور عمارات کی غیر موزونیت، خارجی اور رسمی امتحانات کے غیر مفید اثرات، تحقیقی کام اور فنی معلومات حاصل کرنے کی سہولتوں کا فقدان، ملحقہ کلیات پر جامعہ کی طرف سے نگرانی کی کمی، یہ اور ایسی ہی دوسری خامیاں محل اعتراض بنیں اور اصلاح جامعہ کی طرف توجہ مبذول ہوئی۔ ایک یونیورسٹی کمیشن مقرر کیا گیا اور اس کی سفارشات کی بنا پر ۱۹۰۴ء کا یونیورسٹی ایکٹ (قانون جامعہ) نافذ ہوا، لیکن کمیشن کو جو ہدایات دیے گئے تھے اُن کی رو سے وہ مدارس کے حالات پر کسی قسم کا غور نہ کر سکتا تھا، اور اس نے اپنی توجہ نظم و نسق جامعہ ہی کی نئی ترتیب تک محدود رکھی۔ کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کا دائرۂ تحقیقات وسیع تر تھا، اس نے یونیورسٹی سے انٹرمیڈیٹ کی تعلیم نکال کر اور انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن بورڈ کے زیر انتظام انٹرمیڈیٹ کالج قائم کر کے مدارس کی از سر نو تنظیم کی سفارش کی۔ ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کی بہت کم کوششیں کی گئیں اور بعض صوبوں نے جو تدبیریں اس مسئلہ میں اختیار کیں وہ نامکمل اور باعتبار نتائج امید سے کم ہیں

اس کمیشن کی سفارشات سے جو خاص نتیجہ نکلا وہ متعدد وحدانی جامعات کا قیام ہے لیکن چونکہ ان جامعات کی بنیاد غلط نظامات مدرسہ پر رکھی گئی ہے اس لئے ان کو بھی بہت محدود کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ ہارٹوگ کمیٹی نے نظام تعلیم پر سیاسی حیثیت سے نظر ڈالی ہے۔ اس کمیٹی نے یہ دکھایا اور ثابت کیا ہے کہ نظام تعلیم کے مختلف مدارج میں کس قدر کثیر اضاعت ہوتی ہے۔ اس نے مدرسہ اور کالج کی جماعتوں کو ایسے طلبا سے بھرا ہوا پایا جن کا رجحان ادبی تعلیم کی طرف مطلق نہ تھا، اس کی رائے میں مروجہ طرق تدریس و مطالعہ سے وہ علم اور تربیت حاصل نہیں ہوتی جو قابل تر طلبا حاصل کر سکتے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی انکوائری کمیٹی (مجلس تحقیقات جامعہ پنجاب) نے موجودہ تعلیمی حالت پر زیادہ تفصیلی نظر ڈالی ہے اس کی رائے یہ ہے کہ وحدانی جامعات کے قیام سے جو امیدیں وابستہ تھیں وہ پوری نہیں ہوئی ہیں۔ تعلیم اور امتحانات کے اعلیٰ معیار قائم رکھنے کیلئے اس قدر صرف کثیر برداشت کرنا پڑتا ہے جو ہندوستان کی استطاعت سے باہر ہے۔ علاوہ بریں چونکہ ہندوستان میں مختلف مقامات کے درمیان فاصلے بہت زیادہ، اور وسائل نقل وحمل محدود ہیں اس لیے وحدانی جامعات سے بجائے خود اس قدر کثیر آبادی کی روزافزوں تعلیمی ضروریات کی کفالت نہیں کر سکتیں۔ کمیٹی نے یہ رائے بھی ظاہر کی کہ "ہمیں اس میں شک ہے کہ اس قسم کی جامعات سے جو فوائد حاصل ہوئے ہیں وہ کالج کی ان روایات کی تلافی بھی کر سکتے ہیں یا نہیں جو ان کی وجہ سے مٹ گئے ہیں" اس کمیٹی نے وفاقی قسم کی جامعہ کی سفارش کی ہے جو کالجوں کی روایات برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ ان کی تدریسی اور تحقیقی کام کی سہولتوں، نیز دیگر ذرائع کو ایک رشتہ میں مربوط کردے اور جامعہ کی نگرانی زیادہ ہوجائے چنانچہ جامعہ دہلی کا دستور اسی نہج پر مرتب کیا گیا ہے لیکن اس کمیٹی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جامعات کی اصلاح صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ نظام مدارس کو اس طرح ازسرنو مرتب کیا جائے کہ جامعات کو اپنے ذرائع اور اپنے تدریسی وسائل صرف ایسے طلبا ہی پر صرف کرنے پڑیں جو اس سے مستفید ہونے کے اہل ہوں تعلیم یافتہ طبقہ کی بے روزگاری کے روزافزوں اہم مسئلے نے ناگزیر اور نازک صورت حالات اختیار کرکے " اصلاح کی جبری تحریک" پیدا کر دی ہے اصلیت یہ ہے کہ ایک مسلسل

نظام کے صرف اجزا کی اصلاح کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اس کو بحیثیت مجموعی کھول کر دیکھنے اور نئی ترتیب پیدا کرنے کی ضرورت ہے تنظیم جدید کی تجاویز اور بھی کئی حلقوں کی طرف سے پیش کی گئی ہیں، جو بنیادی حیثیت سے باہم متفق ہیں، اور اس موقع پر محتاج تعارف نہیں۔

یہ زمانہ نئی جامعات کا ہے، اور وہ دنیا کے ہر حصہ میں حیرت انگیز سرعت کے ساتھ قائم ہوتی جارہی ہیں۔ اندازاً ان کی تین قسمیں کی جاسکتی ہیں جو اپنی اپنی امتیازی خصوصیات رکھتی ہیں۔ انگلستان کی جامعات کی خصوصیت "گہری علمیت" کی قدیم روایات ہیں۔ جرمنی اور براعظم یورپ کی جامعات کی خصوصیت خاصہ تحقیق کا شوق ہے، اور نئے قسم کی امریکی جامعات میں جامعہ کے فرائض کا وسیع تر تصور کارفرما نظر آتا ہے۔ انگلستان میں جدید شہری جامعات بھی قائم ہوئی ہیں جن کے مقاصد اور مشاغل حیات ملّی کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ ان جامعات میں یہ کمی محسوس ہوئی ہے کہ وہ "الگ تھلگ" نہیں ہیں، کیونکہ تفکر جو جامعہ کا خاص الخاص فرض ہے صرف تنہائی میں کارفرما ہوسکتا ہے۔ لیکن ان شہری جامعات کو دوسری حیثیتوں سے بعض فوائد بھی حاصل ہیں۔ ان کو زندگی اور فکر، نظریہ اور عمل کے تعلق کے زیادہ مواقع حاصل ہوتے ہیں، شہر کے قائدین فکر و قائدین عمل جامعہ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ تعلقات قائم کر کے شہری جامعہ میں قوت، ترقی، اور وقار پیدا کرسکتے ہیں۔ اس حیثیت سے دیکھا جائے تو وہ جامعات جو شہری مراکز سے فاصلے پر واقع ہیں یکہ و تنہا رہ کر نقصان میں رہتی ہیں۔ ۱۹۲۰ء میں یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی تھی کہ جملہ ہندوستانی جامعات میں نقائص، اور کارکردگی کی خامیاں موجود ہیں، اور فوری اصلاحات کی طرف توجہ کرنے کی کافی دلیل موجود تھی۔ جامعہ بمبئی نے اس وقت یہ دعویٰ کیا تھا کہ اس کا تعلیمی نظام ان خرابیوں سے پاک ہے، اور کمیشن نے بھی اس امر کو تسلیم کرلیا تھا کہ جامعہ بمبئی میں معیار تعلیم کے تحفظ کی خاص وجہ یہ تھی کہ شہر کے معتدد اور تجربہ کار اصحاب نے اپنا وقت اور اپنی قوت جامعۂ بمبئی کی فلاح و بہبود کے لئے خرچ کر کے اس کے عام رنگ اور کام کو اعلیٰ معیار پر قائم رکھا تھا، علیٰ ہذا ہر جامعہ میں اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ کاروباری حضرات اور مفاد عامہ کا اعلیٰ احساس رکھنے والے افراد اس کے معاملات میں زیادہ دلچسپی لیں۔ علاوہ بریں شہری جامعات میں یہ فائدہ کیا کم ہے کہ

مثلاً قانون پڑھنے والے طلبا، وکلا کے ساتھ روابط پیدا کر سکتے ہیں، اور معاشیات کے طلبا اپنے نظریات کو کاروباری افراد کے ساتھ ملکر آزما سکتے ہیں۔ زندگی کے ہنگامے بھی اپنی خاص خوبیاں رکھتے ہیں لیکن شہروں کی موسیقیت اور ڈرامہ شہری جامعات ہی کے قریب میں مل سکتا ہے۔

جملہ جامعات خواہ قدیم ہوں یا جدید، ایسے ادارات ہوتے ہیں جن میں ہماری میراث علم کی توفیر اور اس کا تحفظ کیا جاتا ہے۔ معیارات تعلیم اور مضامین زوال پذیر چیزیں ہیں انکی تجدید کی ضرورت ہوتی ہے۔ جامعہ کو پوری چوکسی کے ساتھ متروک طریقوں کو خارج کرنے، اور نئے مضامین اور نئے زاویہ ہائے نظر کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ اسے سرحد علم کے جملہ حالات سے پوری طرح باخبر رہنا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام صرف موزوں حضرات اور خواتین کی مدد سے انجام پاسکتا ہے۔ یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جامعہ میں کس قسم کے لوگوں کو داخل کیا جائے جامعات ہمیشہ سے خالص علم اور تحقیق کا گہوارہ سمجھی جاتی ہیں۔ حال میں خالص علوم اور معرفت کی ان حدود میں بعض ہنروں اور صنعتی مضامین نے بھی اپنا عمل دخل کر لیا ہے جیسے جیسے زندگی پیچیدہ تر اور صنعت زیادہ با اصول ہوتی جاتی ہے، حرفتی اور صنعتی ماہرین کی بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور جامعات کو انھیں بھی تیار کرنا ہوگا۔ اس رجحان کا اس طرح بغیر کسی قید و بند کے بڑھتے رہنا افسوسناک ضرور ہے، لیکن اب اس کا روکنا ہمارے بس سے باہر ہو چکا ہے حالات زمانہ کا مقتضا جو قوی دلائل پر مبنی ہے، یہی ہے کہ یہ چیز پوری قوم کے عام مفاد کی خاطر جاری رہے۔ پس آیندہ جامعات دو مقاصد کی تکمیل کے لیے ہونگی، یعنی ایک تو مردوں یا اور عورتوں کو مختلف پیشوں کے لیے تیار کرنے کے لئے، مثلاً وکلا، اطباء، انجنیر، اور دیگر صنعتی ماہرین وغیرہ اور دوسرے "قریبی افادیت سے قطع نظر کر کے حصول علم اور تحقیق کے لئے" اگر جامعہ میں شریک ہونے والے افراد کا انتخاب سوائے تعلیمی معیار کے کسی اور وجہ سے کیا گیا، تو ان دونوں مقاصد میں سے ایک بھی پورا نہ ہو سکیگا۔ عقلی کام کے اعلی معیاروں کا تحفظ صرف اسی مذکورہ بالا صورت سے ممکن ہے جو جامعہ ایسے طلبا کو جن میں علمی رجحانات نہیں ہوتے داخل کر کے مشقت سے اور خاص طور پر انکی مدد کر کے اپنے نصاب پڑھاتی ہے، وہ کوئی کام انجام نہیں دیتی، بلکہ الٹا نقصان پہنچاتی ہے "وہ گویا گھٹیا چیزیں بڑی مقدار میں پیدا کرنے اور ان پر ایک قدیم اور قابل عزت مہر ثبت کرنے کی مشین بن کر رہ گئی ہے"۔ زندگی کے ہر شعبہ میں کارکردگی کا اضافہ اس صورت میں ممکن ہے کہ

صرف ہنرمند اشخاص ہی کو باقاعدہ اور منضبط معاشری نظام کے کسی اہم کام میں حصہ لینے دیا جائے اور ہنر صرف انہی کو سکھایا جائے جو اس کی زیادہ سے زیادہ اہلیت رکھتے ہوں۔ جامعات میں کام کے طریقوں پر کامل غور و خوض کی ضرورت ہے۔ طلبا کو انفرادی کام کی زیادہ سہولتیں ملنی چاہئیں۔ لکچروں کی تعداد میں کمی کی جائے۔ اساتذہ اپنی جماعتوں کے لئے پرچہ سوالات بنائیں اور ایسی کتابوں کی فہرست مرتب کر کے ان کے حوالہ کریں جن کی مدد سے وہ سوالات بخوبی حل کئے جاسکیں۔ جب طلبا جوابات تیار کر چکیں تو استاد ان سے انفرادی طور پر ملے۔ استاد اور شاگردوں کے غیر رسمی طور پر ملنے کے مواقع زیادہ فراہم کئے جائیں، جو طالب علم کام نہ کرے اور تضیع اوقات کر رہا ہو وہ جامع سے خارج کر دیا جائے اس لئے کہ جامعہ کی بجائے وہ کسی دوسری جگہ زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ یہ چیز بھی نہایت ضروری ہے کہ جامعہ کے تمام اساتذہ خود بھی تحقیقی کاموں میں مصروف رہیں اور اس کے لیے ان پر سے لکچر کا بار کم کر دیا جائے۔ انھیں چھ یا سات سال کی مدت کے بعد دوسرے علمی مراکز میں جا کر اپنی معلومات تازہ کرنے کی سہولتیں دی جائیں واقعہ یہ ہے کہ تحصیل کی ذہنیت، تدریس کی ذہنیت سے بدرجہا بہتر ہے معلمین اور متعلمین کا خشک فرق مٹ جانا چاہیئے اور جامعات میں صرف "محصلین" ہوں، بعض اعلیٰ پایہ کے، اور بعض ان سے کم، یہ سب جامعات کے حزمن علم و حکمت کی خوشہ چینی میں مصروف ہوں، اور ہر شخص اپنی بساط کے مطابق حقائق اور نئی معرفت کے تخیلات میں اس نیت سے ڈوبا رہے کہ انھیں متشکل اور مستقل کر دکھانا ہے سچی طبیعتیں ہمیشہ ان حالات کے ساتھ جو ان کا مبداء ہوں وفادار رہا کرتی ہیں۔ "قدیم طلبا" کو ہمیشہ اپنے ان ایام زندگی کے ساتھ جو مدرسہ یا جامعہ میں گذرے، اور جہاں ان کے عقلی وجود کا ہیولیٰ بنا، ایک خاص تعلق خاطر ہوتا ہے۔ یہ ارتباط دونوں کی زندگیوں میں باقی رہتا ہے۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد یہ تعلقات منقطع ہو جائیں۔ وہ رسالوں، کتب مطالعہ کی فہرستوں خانگی مطالعہ کے حلقوں وغیرہ کی مدد سے قائم رکھے جاسکتے ہیں اور اس طرح تعلیم کا سلسلہ مادر علمی کے ان فرزندوں کی زندگیوں میں جنھیں اسے جاری رکھنے کی خواہش اور فرصت ہو، دور تک جاری رہ سکتا ہے۔ جامعات کے لئے صرف اسی بات کا خیال رکھنا کافی نہیں ہے کہ ان کی پیداوار دنیا میں کیا مقام اور حیثیت رکھتی ہے، بلکہ ساتھ ہی ان کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ انھیں دنیا میں ایک

مقام حاصل کرنے میں مدد بھی دیں۔ مجلس تحقیق بے روزگاری **Unemployment Committee** نے، جو رائٹ آنریبل سرتیج بہادر سپرو کی صدارت میں قائم کی گئی تھی یہ سفارش کی ہے کہ جامعات میں مجالس فراہمی ذرائع معاش **Employment Board** قائم کی جائیں تاکہ وہ اندرون مملکت طلبا رجامعہ کے لئے راہیں پیدا کرنے کے بارے میں سہولتیں بہم پہنچا سکیں۔ اس مجلس کی یہ بھی سفارش ہے کہ "ایسی مجالس فراہمی ذرائع معاش، ثانوی مدارس نیز حرفتی درس گاہوں میں بھی قائم کی جائیں اب تک جامعات اس قسم کی ذمہ داریوں کو اپنے دائرہ عمل کے باہر سمجھتی رہی ہیں کیونکہ وہ انھیں ان کے حقیقی دائرہ کار سے ہٹا کر دوسری طرف لیجاتی ہیں بعض جامعات میں ادارہ فراہمی معاش کا کام کچھ زیادہ کامیاب بھی نہیں رہا ہے۔

آکسفورڈ اور کیمبرج کے جامعات میں مجالس فراہمی معاش خاص خاص موثر اصولوں پر قائم کئے گئے ہیں، اور ان سے اچھے نتائج رونما ہوئے ہیں۔ طلبا کی بہبودی کا خیال اس بات کا متقاضی ہے کہ اس بارے میں غور و خوض کے بعد کوئی تعمیری پالیسی اختیار کی جائے "قدیم طلبا" کے تعلقات جامعات کے حق میں بہت تقویت بخش ثابت ہوتے ہیں امریکی جامعات اس حیثیت سے بہت خوش قسمت ہیں۔ "قدیم طلبا" کی اپنی انجمنیں، کلب گھر، حلقہ ہائے مطالعہ وغیرہ ہوتے ہیں۔ وہ بحیثیت ثالث بڑی خدمت انجام دیتے ہیں، یعنے جامعہ کی ترجمانی دنیا کے سامنے، اور دنیا کی ترجمانی جامعہ کے روبرو کرتے ہیں۔ طلبا زیر تعلیم کی انجمنوں کی کارروائیوں میں "قدیم طلبا" کی موجودگی سے ایک ایسا احساس حقیقت پیدا ہو جاتا ہے جو ویسے عموماً ان میں نہیں ہوتا۔

تجاویز دربارہ تنظیم جدید

ہندوستان میں کچھ زمانہ سے تنظیم جدید کی تجاویز پر غور ہو رہا ہے۔ اس موقع پر ان پر تفصیلی تبصرہ کرنا مقصود نہیں ہے ان میں نصاب ہائے تعلیم کی جدید تنظیم حسب ذیل مدارج کے تحت تجویز کی جاتی ہے:-

تحتانیہ، ثانوی پیشہ ورانہ، اعلیٰ ثانوی (حرفتی)، جامعاتی (طلبائی نصاب)، یہ سب ایک خاص مقصد کے پیش نظر اور علحدہ انتظام کے تحت تجویز کئے گئے ہیں۔ نصابوں کی اس تقسیم کی ضرورت موجہ اور شدید ہے اس پوری اسکیم کے متعلق سنجیدہ اور فہمیدہ رائے پختہ ہو جانی چاہئے، اور اس بارے میں جسارت کے ساتھ اقدام ہونا چاہیے۔ اس اسکیم پر کچھ تبصرات (اس موقع پر

کئے جا سکتے ہیں مختلف مدارج میں سنین کی ترتیب اس طرح ہونی چاہیئے کہ ڈگری کے درجہ تک
کل مدت تعلیمی میں کوئی اضافہ نہ ہو تعلیم کی مساعی کا رخ ایسا ہو کہ موجودہ مدت سے کم میں حالیہ
معیاروں سے بلند نہیں تو ان کے برابر معیار حاصل کئے جا سکیں۔ حیات انسانی کے بارے
میں انتہائی کفایت اور تحفظ کی ضرورت ہے۔ اس کی بھی احتیاط ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ تعلیمی نظام کے
مختلف مدارج میں جو مختلف مقاصد پیش نظر رکھے جائیں ان کے حصول کے ضمن میں تسلسل علم میں
خلل واقع نہ ہو۔ رشتۂ علم ایک "مکمل تسلسل" ہے، اور سہولت انتظام کے لئے جو "تجربے" ضروری ہیں، وہ
نوعیت و مواد علم کے تسلسل پر اثر انداز نہ ہونے چاہئیں۔ نصاب کے ایک یا دو برس ایک انتظام سے
دوسرے انتظام کے تحت منتقل کر کے تنظیم تعلیم سے بہت کچھ نتائج حاصل ہو سکتے ہیں، لیکن تنظیمی تجاویز کی
خاص تعریف یہ ہے کہ کسی خاص مقام کے نظام تعلیم میں پیشوں کے متعلق اور حرفتی مضامین داخل کئے جائیں ملک کی خوشحالی
اسی قسم کی تعلیم سے ہو سکتی ہے۔ یہ مسئلہ خاص طور پر غور و خوض کا محتاج ہے کہ صنعتی اور حرفتی تعلیم نظام تعلیم کے مختلف
مدارج میں سے کن مدارج میں داخل کی جائے، اور کس حد تک داخل کی جائے، نیز یہ کہ کیا ایسی تعلیم کے عناصر
ہر درجہ میں دوسرے عرفی مضامین نصاب کے دوش بدوش داخل کئے جائیں، یا صنعتی اور حرفتی تربیت
دینے والی درسگاہیں دوسری تعلیمی درسگاہوں سے بالکل علٰحدہ رکھی جائیں۔ علیٰ ہذا ہر ملک کی خاص ضروریات
اور وسائل کے اعتبار سے اس امر کا تعین بھی ضروری ہے کہ کسی خاص مقام پر کس قسم کے مضامین (اور کن
صنعتوں کے متعلق) بتدریج شروع کئے جائیں۔ اس تحقیقات کا دائرہ بہت وسیع ہے، اور عام طور پر یہ محسوس
کیا جاتا ہے کہ صحیح عملی نتائج حاصل کرنے کے لئے ماہرین فن کی رائے، اور وسیع بنیاد پر اغراض و اسباب متعلقہ
کا مشورہ نہایت ضروری ہے جاپان ایک ایسا ملک ہے جہاں حرفتی تعلیم کے بارے میں عظیم الشان نتائج
حاصل کئے جا چکے ہیں۔ وہاں مدارس تحتانیہ کے ابتدائی چھ سالوں میں بھی ادبی مضامین کے ساتھ ساتھ
حرفتی کام کے مبادیات بھی شریک رہتے ہیں۔ ایسے تحتانیہ مدارس کی خاصی تعداد موجود ہے جن میں زراعت
اقتصاد اور صنعت کی تعلیم حاصل کی جا سکتی ہے۔ معمولی وسطانیہ مدارس میں عملی کاروبار نیز اعلیٰ تر تعلیمی کام دونوں
کی تعلیم دی جا سکتی ہے۔ ایک معمولی وسطانیہ مدرسہ میں فراغت تحصیل کے لئے پانچ سال کی مدت درکار ہوتی ہے
چوتھے سال سے متعلم یا تو کوئی خاص حرفتی نصاب لے سکتا ہے یا پھر مقامی ضروریات کے اعتبار سے پوری
مدت میں حرفتی مضامین باقاعدہ نصاب کے ساتھ ساتھ پڑھائے جاتے ہیں۔ مدارس ابتدائی کے تحت مدارس

کارآموزی (Apprentices' Schools) بھی ہوتے ہیں جہاں ابتدائی قسم کے متعدد فن، ہنر، کام وغیرہ کے کم سے کم ششماہی، اور زیادہ سے زیادہ چار سالہ نصاب بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ رائے یہ ہے کہ تجاویز تنظیم میں اس بات کا مناسب انتظام کیا جائے کہ ابتدائی حرفتی تربیت، ابتدائی مدارج تعلیم ہی میں دیجا سکے کسی ملک کے نظام تعلیم کی تنظیم جدید ایک مہتم بالشان مسئلہ ہے جاپانی قوم نے اپنے نظام تعلیم طے کرنے سے پہلے ایک تحقیقاتی کمیشن یورپ اور امریکہ روانہ کیا تھا، اور اس کی واپسی پر فرانس کے نمونوں پر ایک وسیع اسکیم تیار کی گئی تھی اس لیے کہ کمیشن کی رائے میں فرانس کا نظام ہی نمایاں طور پر مکمل اور متناسب تھا" جاپان کا تعلیمی نظام کئی پہلوؤں سے سبق آموز اور دلچسپ ہے۔ "عود شاہی" کے موقع پر جاپان کی پالیسی کا اعلان ان الفاظ میں کیا گیا تھا۔

"اب سے تعلیم کی اشاعت اس طرح کی جائے گی کہ کسی دیہات میں کوئی خاندان اور کسی خاندان میں کوئی فرد جاہل نہ رہے گا۔"

اس پالیسی پر کچھ اس طرح عمل کیا گیا ہے کہ تقریباً تیس سال کی مدت میں جاپان سے ناخواندگی بالکل اٹھ گئی ہے، اور مختلف درسگاہوں میں شرکت چاہنے والے طلبا کی تعداد گنجائش سے اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ثانوی مدارس کے اوپر کے تمام سرکاری مدارس اور کلیات میں داخلہ امتحان مقابلہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔

کثیر حرفتی Polytechnic ادارات کسی ملک کو خوشحال بنانے کے لیے کثیر حرفتی قسم کی تعلیم ضروریات ملک کے لیے بہت موزوں ہوتی ہے۔ لندن کا کثیر حرفتی مدرسہ (جس کی شاخوں کا ایک جال سا پھیلا ہوا ہے) ایک حیرت انگیز اور عظیم ادارہ ہے جو انگریزی قوم کی صنعتی اور اقتصادی ترقی کا بڑی حد تک کفیل ہے۔ کثیر حرفتی ادارات کا عام مقصد یہ ہوتا ہے کہ نسبتہً غریب تر طبقوں کے نوجوان مردوں اور عورتوں کی صنعتی ہنرمندی، معلومات عامہ، صحت اور فلاح کو بڑھایا جائے۔ ریجنٹ اسٹریٹ کے "پولی ٹکنک" کی آفرینش کوئن ٹن ہاگ کے معاشرتی نصب العین سے ہوئی، یہ شخص ایٹن (Eton) کا قدیم طالب علم تھا، اور اس نے دریائے

: جن میں متعدد مختلف حرفتوں کی تعلیم دیجائے۔ ۱۲

ٹیمز کے کنارے اڈلفی کی محرابوں کے نیچے گلی کوچوں کے آوارہ گرد لڑکوں کے لیے جماعتیں شروع کیں اس کا خیال تھا کہ نوجوانوں کی زندگی کے چار پہلو خاص طور پر قابل نشو نما ہوتے ہیں: ذہنی، جسمانی روحانی، اور معاشری؛ چنانچہ اس پولی ٹکنک میں ان چاروں کے لیے گنجائش رکھی گئی ہے، اور اس طرح تعلیمی اور معاشری ترقی کی متعدد اشکال کو فروغ دینے کے لیے منظم اور مرتکز کوششیں کی گئی ہیں۔ یہ پولی ٹکنک غالباً سلطنت برطانیہ کا عظیم ترین حرفتی مدرسہ ہے۔ اس کے طلبا کی تعداد اٹھارہ ہزار اور اراکین کی آٹھ ہزار ہے۔ اس کے دن کے وقت کام کرنے والے شعبوں میں معماری مساحت عمارت سازی، فنون لطیفہ، کیمیا، اقتصاد، انجنیری، ریاضی، طبعیات، نیز السنہ جدیدہ تصویر کشی، مو تراشی، موٹر کا ڈھانچہ بنانا، اور خیاطی کی تعلیم دیجاتی ہے۔

شبینہ شعبوں میں ہر ہفتہ ایک ہزار درس ایک سو سے زیادہ مضامین پر دئے جاتے ہیں، جو سائنس، فنون، اقتصاد، صنعتی نظم و نسق، السنہ جدیدہ، ادبیات تربیت گفتار، گھریلو اور دست ورزی کے کاموں پر حاوی ہوتے ہیں۔

انسانی فعلیت کا دائرہ وسیع اور متنوع ہوتا ہے۔ یہ فعلیت پیدائش سے شروع ہو کر زندگی بھر جاری رہتی ہے تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کے ہر زمانے میں فعلیت کی ہر قسم کی تربیت کی جائے اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ نسل انسانی کی قسمت کی تشکیل میں تعلیم کا کیا رتبہ ہے۔ اس نیرنگ خانہ تخلیق میں بنی نوع انسان کا ایک خاص اشن ہے، اور اس کی فعلیت کا جو منشا رکھا گیا ہے اس کی تکمیل صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ عقل اور علم کی قوت سے اس کی رہبری کی جائے۔ بنی آدم اس کرۂ ارض پر اپنا پارٹ جس طرح ادا کر رہا ہے، اس میں تفوق کا کوئی خاص پہلو نظر نہیں آتا۔ قوی دستوں کے ہاتھوں کمزوروں کا منظم طریقہ پر استیلا؛ انسانوں کی ایک دوسرے کے ساتھ دل کی گہرائیوں تک پہنچی ہوی رقابت اور بدظنی، مستقبل کی تباہ کاریوں کے پروگرام کے لیے ابھی سے دنیا کے حالات کا تیار کیا جانا؛ ایک ہی مقام کے باشندوں کے دلوں میں فرقہ وارانہ عناد اور نفرت کے بیج ـــــ یہ اور ایسی ہی بے شمار دوسری باتیں، انسانیت کی روح پر ایک ایسا دھبا ہیں جن کا بیان بھی انتہائی تکلیف دہ ہے نسل انسانی کے کج طبائع بنی نوع انسان کے گم کردہ راہ مقاصد انسان کے ہاتھوں طبیعی قوتوں کا ناجائز استعمال، یہی سب چیزیں بڑی حد تک موجودہ شر کی ذمہ دار ہیں۔

آنے والی نسلوں کے متعلق ہماری امیدیں اور خوش خیالیاں صرف اسی صورت میں صحیح ثابت ہوسکتی ہیں کہ انسان کی جبلت اور فطرت کی، جو افعال قبیحہ کے ارتکاب کی محرک ہوتی ہے، صحیح طور پر تربیت کی جائے۔ اس بحث سے ہم پھر کمرۂ درس اور استاد کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ انسانوں کی قسموں کی تشکیل میں تعلیم کا جو کچھ حصہ ہے، اس پر بنی نوع انسان کا اعتقاد پختہ ہوتا جائے گا۔ انسان کی سیرت اور طبیعت پر معلّم کی قدرت اور نگرانی رفتہ رفتہ اپنا سکہ جماتی جائے گی۔ اور تعلیم کے شریفانہ نصب العین کے بابرکت اثر سے قلب انسانی، ناتفاقیوں سے پاک ہو جائے گا۔

اب میں اتنا اور کہنا چاہتا ہوں کہ ایک سرزمین ایسی ہے جہاں سائنس اور فنوں کے اعلیٰ خیالات اس ملک کی زبانوں میں سے ایک زبان میں منتقل کیے جا رہے ہیں اور یہ ایک ایسا مظہر ہے جس سے اس سرزمین سے سچی محبت رکھنے والے دل میں مسرت اور فخر کی ضیا پیدا ہو جانی چاہیئے، جہاں کے نوجوان یعنی آنے والی انسانیت کے متعلق ہماری امیدوں کا سرمایہ، بجائے اس کے کہ ہر قسم کے اقتدار کے خلاف تشدد اور تباہی کے پروگرام تیار کریں، روزانہ فن زندگی، اور ادبیات کے صفحات میں اپنا جزو خدمت بھی شریک کرتے اور ملک کی عام اور ذہنی سطح بلند کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ جہاں علم کی سرپرستی اپنی نفع رسانی کی قوت کی مدد سے ملک و ہر مقام کی حدیں پار کر گئی ہے، اور اس انداز سے ہوتی ہے جس کی نظیر کہیں اور نہیں مل سکتی، جہاں اعلیٰ ترین انتظامی قوت کی محبت میں ڈوبی ہوی فیاضی، مالیات کی روشن خیال نیکی اور غیر محدود قوت تعلیمات کے اعلیٰ ترین اقتدار کا شریفانہ اثر اور حسن تدبیر سب کے سب حقیقی علم و تہذیب کے شریف ترین نصب العین کی پرستش کے لیے وقف کر دیے گئے ہیں پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ جہاں انسانوں کے قلوب ایک ایسی یگانگت کا مسکن ہیں جس کے بغیر تحصیل علم اور ترقی قطعاً ناممکن ہے یہ سرزمین حیدرآباد ہے جہاں آج نشاۃ ثانیہ کی زیبائی اور شان دیکھنے میں آ رہی ہے ایک غیر معروف شخص جس کے دل میں صرف فلاح و بہبود دیکھنے کی امنگ تڑپ رہی ہے، اس سرزمین میں کھڑا ہو کر یہ پیش گوئی کرتا ہے کہ اگر موجودہ حالات سلامت ہیں، اور انسانوں کے دل میں یگانگت باقی ہے تو اے حیدرآباد "تیری تقدیر میں بنی نوع انسان کی قیادت جلی قلم سے لکھی ہوی ہے"۔

آخر میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ گویا میرا سارا وجود اس مملکت کے سریر آرا کے لیئے دست بدعا ہے، جس کی بخشش و عطا نے قلوب انسانی کو زندگی اور تہذیب کی مسرتوں سے نہال کر دیا ہے۔ خدا کرے کہ صداقت معرفت اور یگانگت کی یہ سلطنت ابدالآباد تک قائم و دائم رہے آمین

رپورٹ سالانہ انجمن اساتذہ مستقر بلدہ بابتہ ۱۳۴۵ف

میرزا ضیاء الدین بیگ صاحب بی۔ اے، بی۔ ٹی علیگ معتمد عمومی

جناب صدر محترم معزز خواتین و حضرات۔

سال زیر رپورٹ بہت ہی مہتم بالشان ہے اس کا آغاز اس سالانہ نویں کانفرنس سے ہوا جسکی صدارت عالیجناب نواب مہدی یار جنگ بہادر ایم اے (آکسن) صدر المہام تعلیمات و سیاسیات نے فرمائی تھی جناب ممدوح نے انجمن کی کارروائی میں شرکت فرما کر جس گہری دلچسپی کا اظہار فرمایا تھا اور جن حوصلہ افزا الفاظ میں اپنی اختتامی تقریر میں اظہار پسندیدگی فرمایا اس نے انجمن کے کاروبار میں نئی روح پھونک دی۔ حضرات یہ امر باعث مسرت ہے کہ سالانہ نظام العمل نہ صرف کامیاب ثابت ہوا بلکہ اس انجمن کے مشاغل اور دلچسپیاں وسیع سے وسیع تر ہو گئیں جس کا بین ثبوت حالیہ قائم شدہ کلب اساتذہ اور زائد از نصاب مصروفیات کی کمیٹی ہے۔ سال حال مدرسہ اعزہ کو ذیلی شاخ انجمن مقرر کرنے کی وجہ سے انجمن کی شاخوں میں ایک کا اضافہ ہوا اور بمقابلہ سال گزشتہ بجائے ۱۲ کے انجمن کی ذیلی شاخیں ۱۳ قرار دی گئیں۔ انجمن اساتذہ سکندرآباد انجمن ہذا سے بدستور ملحق رہی۔ اراکین انجمن کی تعداد (۸۱۰) ہے۔

سال زیر رپورٹ میں مرکزی انتظامی کمیٹی کے (۷) جلسے منعقد ہوئے جن میں علاوہ دیگر امور کے حسب ذیل کام انجام پائے۔

۱۔ زاید از نصاب مصروفیات کے شعبہ کا قیام۔

۲۔ ضبط مدرسہ کے متعلق تیاری رپورٹ کے لئے ایک کمیٹی کا قیام۔

۳۔ ذیلی شاخوں کے ماہانہ جلسوں کے لیئے مضامین کا نظام العمل۔

۴۔ اساتذہ کے کلب کے انتظامات کے لیئے ایک ذیلی کمیٹی کی تشکیل۔

۵۔ دسویں سالانہ کانفرنس کے انتظامات۔

شعبہ زائد از نصاب مصروفیات اس شعبہ کا قیام ان سفارشات کی حتی الامکان تکمیل کے لیے عمل میں آیا۔ جو زائد از نصاب مصروفیات کی رپورٹ میں گذشتہ کانفرنس میں ظاہر کی گئی تھیں اور جس کا مقصد عوام کو زائد از نصاب مصروفیات کی جانب راغب اور متوجہ کرنا ہے۔

اس شعبہ کے ارکان حسب ذیل ہیں۔

(۱) ریورنڈ ایف سی فلپ۔ صدر نشین۔ (۲) جناب جی اے چندرا ودکر صاحب معتمد۔ (۳) جناب مولوی نور الحسن صاحب۔ (۴) جناب ین پارتھا سارتی صاحب (۵) جناب مولوی مرزا محمود علی بیگ صاحب (۶) ریورنڈ جی سندرم۔

چنانچہ آج چار بجے اس شعبہ کی ضمنی کمیٹی بھی منعقد ہوگی۔

ضبط مدرسہ کی ذیلی کمیٹی اس کی تشکیل گذشتہ سالانہ کانفرنس کے ایک رزولیوشن کی بنا پر ہوی تھی۔ اور جناب مولوی عبد الستار صاحب سجانی اس کے صدر نشین مقرر ہوے تھے کام کا آغاز ہی ہوا تھا کہ صاحب موصوف کا نانڈیڑ تبادلہ ہوگیا۔ اور جناب مولوی مرزا محمود علی بیگ صاحب کی نامزدگی عمل میں آئی۔ اس کمیٹی کے دیگر اراکین جو انجمن کی ذیلی شاخوں سے منتخب ہوے تھے حسب ذیل ہیں۔

جناب مولوی محمد یوسف صاحب معتمد جناب مولوی محمد سلطان صاحب۔ جناب مولوی غلام دستگیر رضا صاحب جناب ڈنکر نارائن صاحب۔ جناب ین وی ایر صاحب۔ جناب مولوی سید غوث الدین صاحب جناب مولوی غلام غوث خاں صاحب جناب مولوی سید صدر الدین صاحب۔ جناب مولوی حفیظ اللہ میر صاحب۔ جناب مولوی محمد حسین صاحب اور جناب گنیش چند صاحب۔

اس کمیٹی نے جو رپورٹ تیار کی ہے اس پر آج دوپہر کو اور کل صبح ضمنی جلسہ میں بحث و مباحثہ ہوگا۔ عالیجناب مولوی سجاد مرزا صاحب پرنسپل عثمانیہ ٹرینگ کالج اور عالی جناب مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری نائب ناظم تعلیمات علی الترتیب اس کی صدارت فرمائیں گے اور کل دوپہر کو منظوری کے لیے اس کو کانفرنس میں پیش کیا جائے گا۔

ماہانہ جلسے ضبط مدرسہ سے متعلق حسب ذیل مضامین پر انجمن کی مختلف شاخوں میں ماہانہ

جلسوں میں مباحث ہوئے۔

(۱) قیام ضبط پر صدر مدرس اور اسٹاف کے تعاون کا اثر۔

(۲) ضبط جماعت۔

(۳) ضبط خارج از جماعت۔

(۴) ضبط بذریعہ سزائے جسمانی۔

(۵) ضبط غیر از سزائے جسمانی۔

(۶) اساتذہ اور اولیا طلبا کے اتحاد عمل کا اثر ضبط مدرسہ پر

(۷) انتظام طلبا بحیثیت معاون ضبط مدرسہ۔

(۸) انعامات و تحائف کا اثر ضبط مدرسہ پر۔

(۹) استاد کی شخصیت کا اثر ضبط مدرسہ پر۔

ان ماہانہ جلسوں کو مزید مفید بنانے کی کوشش اس طرح عمل میں لائی گئی کہ بحث کا آغاز کرنے کے لئے قبل از قبل ایک رکن کو نامزد کیا جانے لگا۔ ان جلسوں میں جو مضامین پڑھے گئے تھے وہ رسالہ حیدرآباد ٹیچر کے اردو حصہ میں شائع کئے گئے ہیں۔

اساتذہ کا کلب عالیجناب مولوی سید علی اکبر صاحب نے گذشتہ کانفرنس میں اپنے مضمون "مدرس اور اس کے لمحات فرصت" میں اساتذہ کے کلب کے قیام کی جو تحریک فرمائی تھی اور جس کا خیر مقدم محترم صدر نشین صاحب نے فرمایا تھا) مرکزی انتظامی کمیٹی نے اس پر فوراً توجہ کی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کلب کا قیام عمل میں آگیا۔ اس کی شدید ضرورت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ (۱۰۰) سے زیادہ اساتذہ صاحبان اور عہدہ دار صاحبان تعلیمات نے افتتاح کلب تک اس کی رکنیت قبول فرمائی۔ سردست کلب دفتر صدر مہتمم تعلیمات مستقر بلدہ میں قائم ہے جہاں نہ صرف دارالمطالعہ اور ریڈیو موجود ہے بلکہ شطرنج پنگ پانگ برج اور فنگر بلیرڈ وغیرہ کا بھی انتظام ہے اراکین کلب اس روز سعید کے منتظر ہیں جبکہ سرکار عالی کی توجہ اور امداد سے کلب کی اپنی عمارت ہوگی اور جس میں بلیرڈ ٹیبل اور ٹینس کورٹ ہوگا۔

کانفرنس کی تعلیمی ہفتہ میں کلب کے مختلف کھیلوں کے ٹورنمنٹ ہوئے اور گذشتہ رات کلب کا

بہلاڈ زبھی تھا۔ کلب کی کامیابی کا سہرہ جناب مولوی انصار احمد صاحب کے سرہے جو اس کے ایک مستعد اور جوشیلے معتمد ہیں اس موقع پر جناب مولوی عبد الجبار صاحب سبحانی سابق مددگار معتمد کا ذکر بے محل نہ ہوگا جنہوں نے اپنے تبادلہ سے قبل کلب میں قابل قدر کام انجام دیا ہے۔

عام تقاریر انجمن ہذا کی زیر سرپرستی بتاریخ ۲۳ رجولائی ۱۹۳۶ء جناب کے جی سیوا سوامی صاحب سکرٹری رُورل سنٹر سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی نے اخلاقیات شہریت پر تقریر فرمائی اور از راہ کرم عالی جناب مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری بی اے (آکسن) نائب ناظم تعلیمات نے اس کی صدارت قبول فرما کر ہمیں ممنونیت کا موقع عطا فرمایا۔

مدارس کی باغبانی کا مقابلہ ان مدارس کی تعداد جو سال حال باغبانی کے مقابلہ میں شریک تھے مقابلہ سال گذشتہ جس میں (۹) مدارس نے حصہ لیا تھا۔ صرف آٹھ تھی یہ دوسرا سال ہے کہ مکرر مدرسہ فوقانیہ نامپلی کو کپ دیا جانے والا ہے۔ گو تحتانیہ مثنی خیرت آباد نے بھی جس کا درجہ دوسرا تھا امتیاز کے حاصل کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ ویویکہ وردھنی ہائی اسکول اور ماڈل پرائمری سکول نے بھی بہتر کام انجام دیا اور بلحاظ امتیاز ان کا درجہ تیسرا رہا۔

آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس اور نمائش انجمن ہذا کا الحاق آل انڈیا فیڈریشن آف ایجوکیشنل اسوسی ایشنس سے بدستور قائم رہا۔ ڈسمبر ۱۹۳۵ء میں ریاست حیدرآباد دکن کے سرکاری نمایندگان کی حیثیت سے عالیجناب مولوی سید علی اکبر صاحب اور مس نندی نے آل انڈیا فیڈریشن آف ٹیچرز اسوسی ایشنز کی گیارہویں سالانہ کانفرنس میں جو بمقام ناگپور منعقد ہوئی تھی شرکت فرمائی۔ اور جناب مولوی نذیر حسین شریف صاحب اور جناب ایشور رنگھ صاحب نے انجمن ہذا کی جانب سے نمایندگی کی۔ کانفرنس کے ضمن میں ناگپور میں تعلیمی نمائش بھی منعقد کی گئی تھی جس میں سررشتہ تعلیمات نے مستقر بلدہ کے مختلف مدارس سٹی کالج ہولی روزری کانونٹ اور مدارس پست اقوام سے ۵۰ سے زیادہ نمائشی اشیاء بھیجی تھیں۔ یہ امر باعث امتنان ہے کہ (۱۴) انعامات متذکرہ بالا کالج و مدارس نے حاصل کئے۔

کتب خانہ سال زیر رپورٹ میں انجمن کے کتب خانہ کو سررشتہ تعلیمات سے حسب سابق سالانہ

(مالہ) کی امداد ملی اور کتب کی تعداد میں اضافہ ہوا چنانچہ اس وقت انگریزی کتب کی تعداد (۴۴۶) اور اردو کتب کی (۶۰) ہے سالِ زیر رپورٹ میں (۲۲) کتب اراکین انجمن کو مطالعہ کے لئے دی گئیں۔ سال گذشتہ (۲۱۰) کتب دی گئی تھیں۔ ناظرین کی تعداد بخلاف ۱۳۴ کے جو سال گذشتہ تھی سال زیر رپورٹ میں (۱۵۲) رہی۔ انجمن ہذا عالیجناب مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری بی اے۔ (آکسن) نائب ناظم تعلیمات کی بیحد ممنون ہے کہ جناب ممدوح نے تقریباً (۱۰۰) قیمتی کتب عطا فرما کر اپنی فیاضی اور علم دوستی کا عملی ثبوت دیا جس کی بناء پر انجمن نے جناب ممدوح کو دوامی رکن قرار دے کر اپنے جذبات تشکر و احسان مندی کا اظہار کیا انجمن ریورنڈ ایف سی فلپ کی بھی ممنون ہے جنہوں نے تین کتابیں عطا فرمائی ہیں نیز مسٹر ویبر اور عالیجناب مولوی سید علی اکبر صاحب نے پانچ پانچ کتب عطا فرمائیں جس کے لئے انجمن ہدیۂ تشکر پیش کرتی ہے۔

رسالہ حیدرآباد ٹیچر

اس رسالہ نے اب گیارہویں سال میں قدم رکھا ہے حال میں اس کے حلقۂ ادارت میں دو تبدیلیاں ہوئیں۔ سال زیر رپورٹ کے اختتام پر جناب مولوی عطاء الرحمن صاحب نے طویل رخصت حاصل کی اور انگلستان روانہ ہوئے۔ موصوف کی جانشینی قبول کرنے کے لئے۔ جناب مولوی سالم بن سعید صاحب بی اے، بی ٹی ایم ایڈ لکچرار عثمانیہ ٹریننگ کالج نے ازراہ عنایت اظہار رضامندی فرمایا ہے۔ جناب مولوی سید اللہ بخش صاحب کی دوسرے سررشتہ میں منتقلی عمل میں آنے کی وجہ سے بجائے موصوف کے جناب مولوی سعید الدین خان صاحب اردو حصہ کی ادارت فرما رہے ہیں۔

انجمن کی مالی حالت

گوشوارہ جمع و خرچ حسب ذیل ہے:۔

تفصیل جمع

سلک گذشتہ	(صماللعہ ۳ ر ۵ ر ۳)
چندہ مدارس بلدہ	(لکعہ ۶ ر ۶ ر ۳)
عطیہ	(اعہ)

الـ ۱۰ ر ۱ ر ۱۱

تفصیل اخراجات خرچ

اخراجات سالانہ کانفرنس ودیگر (صما یوعہ) ۱۳ر۸ر اخراجات مشاعرہ (سہ)

(سما لوعہ) ۱۳ر۸ر ﺟﻤﻠﮧ

" " الونس کارکنان انجمن (ﻣﺎﺭﮮ ۵ر۶ر)

" " صادر (اعہ)

" " آل انڈیا کانفرنس (سعہ) ۸ر۳ر + (لعہ) ۱۳ر سکہ کلدار

سلک موجودہ (صما عہ) ۱۵ر۶ر

الہکعہ

۱۰ر۱۱ر

۱۳۴۴ف کے حسابات کی تنقیح جناب مولوی عبدالوہاب صاحب نے فرمائی جن کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ جناب مولوی سید خیرات علی صاحب نے انجمن کی خزانہ داری کے فرائض بدستور انجام دئے۔ جن کی انجمن ممنون ہے۔

اختتام معزز خواتین اور حاضرین انجمن کے اس پہلے تعلیمی ہفتہ کی کامیابی حوصلہ افزا ہے اور مجھے یقین کامل ہے کہ یہ آیندہ ہر سال تعلیمی ہفتہ کے لئے رہبر ثابت ہوگی۔ علیا حضرتہ شہزادی درشہوار دروانہ بیگم صاحبہ نے ازراہ عطوفت کل نمائش کا افتتاح فرماکر جو عزت افزائی فرمائی وہ اراکین انجمن کے لئے باعث فخر ومباہات ہے۔ تعلیمی ہفتہ کی دوسری دلچسپ خصوصیات یہ تھیں (۱) اسکوٹ ڈے ریلی جس کا انتظام گذشتہ شنبہ کو جناب آرگنائزنگ کمشنر صاحب بائز اسکاوٹس نے فرمایا تھا (۲) مسٹر دیبر کی فانوسی تقریر (۳) مشاعرہ جو جناب مولوی غلام محمود صاحب معتمد اور دیگر اراکین مشاعرہ کمیٹی نے زیر صدارت جناب مولوی شوکت علی خان صاحب فانیؔ منعقد کیا تھا (۴) ایورنڈ ایف سی فلپ اور جناب مولوی مرزا محمود علی بیگ صاحب کی لاسلکی تقاریر (۵) اساتذہ کے لئے خصوصی اسباق جو گذشتہ شنبہ کو اور کل ہوئے اور اکثر کل بھی ہوں گے۔

انجمن ان تمام خواتین وحضرات کی ممنون ہے جنہوں نے تعلیمی ہفتہ کو کامیاب بنانے میں اعانت فرمائی ہے اور خصوصاً عالیجناب مولوی قاضی محمد حسین صاحب کا شکریہ ادا کرتی ہے کہ جناب ممدوح نے ازراہ عنایت کانفرنس کی صدارت فرماکر انجمن کو ممنونیت کا موقع عطا فرمایا

انجمن عالیجناب خان فضل محمد خان صاحب ناظم تعلیمات کی ممنون ہے کہ جناب ممدوح نے اس کی ہر طرح اعانت اور حوصلہ افزائی بدستور فرمائی نیز انتظامی کمیٹی اور دوسری کمیٹیوں کے اراکین کا اتحاد عمل باعث ممنونیت ہے۔

حضرات عالیجناب مولوی سید علی اکبر صاحب میر مجلس انجمن کا شکریہ ادا کرنے سے میری زبان قاصر ہے۔ انجمن نے جس قدر ترقی کی ہے وہ بڑی حد تک جناب ممدوح کی ترغیب وتحریص کوشش اور رہبری کا نتیجہ ہے۔

روداد دسویں سالانہ کانفرنس انجمن اساتذہ مستقر بلدہ

از

مرزا ضیاء الدین بیگ بی اے بی ٹی معتمد عمومی انجمن اساتذہ بلدہ

انجمن اساتذہ مستقر بلدہ نے بخلاف سنین گذشتہ سال حال دسویں سالانہ کانفرنس کے موقع تعلیمی ہفتہ منایا جو ۵ آذر ۱۳۴۶ف شروع ہوکر ۱۲ آذر ۱۳۴۶ف کو کامیابی کے ساتھ ختم ہوا لاسلکی تقاریر، اسکوٹس کے مظاہرے، قانونی تقریر، مشاعرہ، اساتذہ کے لئے خصوصی جماعتیں، نمائش تعلیمی، ٹیچرز کلب کے ٹورنمنٹ، ذیلی کمیٹیوں کے مباحث اور مختلف دلچسپ ومفید عنوانات پر عام جلسوں میں تقاریر وغیرہ اس ایک ہفتہ کی مصروفیات سے جو نتیجہ خیز اور عملاً رہنما ثابت ہوسکتے ہیں کانفرنس کی کامیابی کا اندازہ ہوسکتا ہے یہ کامیابی انجمن کے روح رواں جناب مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے (کنٹب) میر مجلس انجمن کی دلچسپی اور رہبری کوشش اور غیر معمولی مصروفیات کا نتیجہ ہے۔

لاسلکی تقاریر بتاریخ ۵ آذر ۱۳۴۶ف بوقت ۸ ساعت ۵۳ منٹ جناب مولوی مرزا محمود علی بیگ صاحب پرنسپل مدرسہ فوقانیہ دارالعلوم نے یہ عنوان (مدرسے

والدین کا تعاون) بہ زبان اردو لاسلکی نشرگاہ سرکار عالی سے تقریر فرمائی۔ عام طور پر والدین کو مدرسہ سے تعاون کے متعلق معلومات بہم پہونچانے کی ضرورت ہے اور اس قسم کی تقاریر نہایت کارآمد ثابت ہوتی ہیں قابل مقرر نے نہایت وضاحت سے تقریر کی ہے اس تقریر کو علحدہ نمبر میں شائع کیا جائے گا۔ بتاریخ ۹ آذر ۱۳۴۶ف بوقت شب ریورنڈ ایف سی فلپ وارڈن سینٹ جارجز گرامر اسکول نے بہ عنوان (چند جدید رجحانات تعلیم) بہ زبان انگریزی تقریر کی۔ مضمون کی اہمیت اس کے عنوان سے ظاہر ہے۔ ریورنڈ ایف سی فلپ کے طرز بیان اور وسیع معلومات نے مضمون میں اور جان ڈالدی صاحب موصوف نے ان رپورٹوں کی اہمیت جتا کر سامعین کو ان سے استفادہ کرنے کی توجہ دلائی۔ جو انجمن اساتذۂ بلدہ نے ہر سال کانفرنس میں پڑھنے کے لئے تیار کی ہیں۔ نیز تعلیم کو عملی زندگی سے مربوط کرنے کے طریقے تبلائے اور آسٹریلیا کے مدارس کا حوالہ دیتے ہوے مدارس میں خودمختارانہ حکومت (سلف گورنمنٹ ان اسکولز) کے طریقہ پر روشنی ڈالی۔

اسباق اور ان سے متعلق تقاریر

بتاریخ ۵ آذر ۱۳۴۶ف بوقت ۱۰ ساعت صبح بعمارت ابتدائیہ سینٹ جارجز گرامر اسکول چرچ روڈ مس ڈی وبسٹر نے کنڈر گارٹن کی جماعت کا نمونہ پیش کیا (۳۶) اساتذہ صاحبان سبق میں شریک ہونے کی خواہش ظاہر کرکے اطلاع دی تھی۔ لیکن تقریباً (۱۰۰) اساتذہ شریک تھے سبق نہایت دلچسپ اور کامیاب رہا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ کم سن بچے نہایت آزادی کے ساتھ کھیل رہے ہیں اور ریتیا پر گارہے ہیں۔ اور ناچ رہے ہیں۔ اور معلمات ان کا ساتھ دے رہی ہیں لیکن کھیل کود اور گانے وناچنے کے پیرایہ میں بچوں نے دستی مشاغل نظم خوانی، مطالعہ قدرت، اعداد نویسی اور جسمانی آسان ورزش وغیرہ کو سیکھا۔

اختتام سبق پر جناب مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے (کنٹب) میر مجلس انجمن نے تقریر فرمائی۔ جناب ممدوح نے فرمایا کہ آج کا مظاہرہ بہت اچھا رہا۔ افسوس ہے کہ جگہ کی قلت کی وجہ سے زیادہ اساتذہ کو سبق میں شریک ہونے کا موقع نہیں دیا جاسکا مقرر نے مظاہرہ کے متعلق تین امور کی جانب توجہ دلائی۔

۱۔ مدرسہ کی جن معلمات نے سبق میں حصہ لیا ان کو خود مس دبسٹر نے ٹرینڈ کیا ہے اور کنڈر گارٹن

کے اکثر آلات معلماۃ کے بنائے ہوئے ہیں۔

۲۔ آج بچوں میں تمام وقت دلچسپی قائم تھی معلماۃ صرف رہبری کر رہی تھیں اور یہ کوشش کر رہی تھیں کہ بچوں میں حرکت ہو اور عمل۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ تمام وقت بچے بشاش تھے۔

۳۔ بچوں نے ہر ایک کام با قاعدگی سے کیا۔ اور ڈسپلن لائق ستائش تھا۔ ہر بچہ کرسی رکھتے وقت اس بات کی احتیاط کر رہا تھا۔ کہ آواز نہ ہو۔

پس جن مدارس میں کنڈرگارٹن قائم ہے۔ وہاں مدرسین کو چاہیے کہ نئے نئے آلات تیار کرکے اور کھیل کا طریقہ اختیار کرکے بچوں کی دلچسپی میں اضافہ کرنے کی کوشش کریں نیچر اسٹڈی کے اسباق میں حتی الوسع زندہ جانور یا پرند طلبہ کے سامنے پیش کرنا چاہیئے۔ تین سال قبل انجمن اساتذہ کی ایک ذیلی کمیٹی نے کنڈرگارٹن پر رپورٹ تیار کی تھی۔ یہاں آنے سے قبل اس رپورٹ کا مطالعہ کنڈرگارٹن کے مدرسین کے لئے مفید ثابت ہوگا آخر میں مقرر نے جناب مولوی عبدالعزیز صاحب بی اے بی ٹی وائس پرنسپل عثمانیہ ٹریننگ کالج کا جنھوں نے شرکت فرما کر انجمن اساتذہ سے اپنی دلچسپی کا اظہار فرمایا شکریہ ادا کیا۔

جناب مولوی عبدالعزیز صاحب نے انگریزی میں حسب ذیل تقریر فرمائی۔

آج کے سبق میں شریک ہوکر مجھے بہت مسرت ہوی۔ گو ہم لوگوں کو کنڈرگارٹن سے متعلق معلومات تھے۔ لیکن آج عملی طور پر ایک کامیاب کنڈرگارٹن جماعت کے دیکھنے کا موقع ملا۔ ٹریننگ کالج کے متعدد لکچروں سے ہم کو وہ تجربہ حاصل نہیں ہوسکتا جو آج کے سبق دیکھنے سے حاصل ہوا آج کے سبق کا ہر حصہ ایک کھیل تھا۔ حواس کی تربیت کے ساتھ ساتھ قوائے ذہنی کی تربیت بھی ہوئی قوت مشاہدہ کی تربیت کھیل کے ذریعہ سے کی گئی۔ ہر لڑکے نے اشیاء پیش کردہ کو غور سے دیکھا اور جو کچھ دیکھا بیان کیا اور جو اشیا عمداً کم کردی گئی تھیں ان کے نام طلبہ نے بتائے موسیقی سے بھی جس کا تعلق روح سے ہے سبق کے دوران میں کام لیا گیا۔ جس سے طلبہ نے تکان محسوس نہیں کی۔ میں مس ڈی ولبسٹر اور دیگر معلماۃ کا جنھوں نے سبق میں حصہ لیا ممنوں ہوں۔ نیز جناب مولوی سید علی اکبر صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

سالانہ اسکوٹ ڈے ریلی | بتاریخ ۱۵ ماہ آذر ۱۳۴۶ف بوقت ۴½ ساعت شام بمقام نظام کالج

سالانہ اسکاوٹ ڈے ریلی کا مظاہرہ کیا گیا۔ گرونڈ پر مہمانوں کے لیے خیمہ نصب تھا۔ مظاہرہ میں سرونگر، ماڈل پرائمری اسکول شاہ گنج مفید الانام، دہتراج، اور چنچل گوڑہ، دارالعلوم، دارالشفاء اور نامپلی جاگیردار کالج، اور شاہ علی بنڈہ کے تقریباً ۱۲۰ اسکاوٹس نے حصہ لیا۔ مظاہرہ کا آغاز پرچم آصفی کے لہرانے سے کیا گیا اور رقص، فلاگ ڈریل معہ بیانڈ پل بندی، اسکوٹ مکالمہ، خیمہ زنی، کیمپ کی زندگی وغیرہ پر مشتمل تھا یہ نہایت دلچسپ اور کامیاب رہا جس کے اختتام پر جناب مولوی سید محمد ہادی صاحب بی۔ اے آرگنیزنگ کمشنر بائے سکوٹس نے کبس کو اور جناب مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے (کنٹب)، ڈسٹرکٹ کمشنر حلقہ چادر گھاٹ نے اسکوٹس کو اور جناب نواب ناظر یار جنگ بہادر ڈسٹرکٹ کمشنر نے **اسکوٹ ماسٹر صاحبان** کو مخاطب کرکے علی الترتیب ان سے متعلق حلف کی تجدید کروائی جس کو کبس اسکوٹس اور اسکوٹ ماسٹر صاحبان نے بیک زبان دُہرایا۔ جناب مولوی اکبر علی خان صاحب برسٹر نے اسکوٹس کو مخاطب فرماکر حسب ذیل تقریر فرمائی اسکوٹنگ کی کامیابی ملک کی خوشحالی کا باعث ہے۔ عزت کا احساس ایک فنی چیز ہے جس ملک کے افراد میں عزت و شرافت کا احساس نہ ہو وہ ملک ترقی نہیں کرسکتا۔ اسکوٹس کا حلف بہت اہم ہے جس کا احترام کرکے اسکوٹس کو اس پر عمل کرنا چاہیئے۔ اور اسکوٹس کو سب کی خدمت کرنی چاہیئے خدمت ہی سے دنیا میں امتیاز اور تفوق حاصل ہوتا ہے حقیقی مسرت دولت اور ڈگریوں سے نہیں حاصل ہوتی ہے بلکہ راست بازی اچھی سیرت اور مخلوق کی خدمت میں اس کا راز مضمر ہے جناب مولوی سید محمد ہادی صاحب نے معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور جناب نواب ناظر یار جنگ بہادر نے انعامات تقسیم فرمائے۔ نواب صاحب ممدوح اور جناب مولوی سید علی اکبر صاحب کو اسکوٹ ایسوسی ایشن کی جانب سے ڈسٹرکٹ کمشنر کے بیاج دیے گئے۔ نواب صاحب کو پھول پہنائے گئے اور پرچم اتارنے کی رسم ادا ہونے کے بعد مظاہرہ ختم ہوا۔

فانوسی تقریر

۷ آذر ۱۳۴۶ف کو ۶½ بجے شام متھڈسٹ بائز ہائی اسکول میں مسٹر ایف ویبر پرنسپل کلیہ تعلیم جسمانی نے زیر صدارت جناب مولوی سید ہادی صاحب بی۔ اے آرگنیزنگ کمشنر بائے اسکوٹس بعنوان "رفاہی جذبہ اور اس کی رہنمائی تعمیری طریق میں" فانوسی تقریر فرمائی۔ عنوان زیر بحث پر مقرر موصوف نے کافی روشنی ڈالی اور تقریر کو واضح کرنے کے لیے

موزوں اور دلچسپ تصاویر سے کام لیا۔ اولمپک گیمس سے متعلق تصاویر بتائے اور کمرہ جماعت میں
رقابتی جذبہ کس طرح ظاہر ہوتا ہے بیان کیا۔

صدر جلسہ نے مسٹر ویپر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ حال میں ہندوستان کی کرکٹ ٹیم
نے انگلستان کا جو سفر کیا تھا اس کے واقعات سے ظاہر ہے کہ ہندوستان میں رقابتی جذبہ کی
صحیح رہنمائی کی سخت ضرورت ہے مسٹر پارتھا سارتھی منصرم صدر مدرس مدرسہ فوقانیہ نامپلی نے
جناب مولوی سید محمد ہادی صاحب و مسٹر ویپر اور ان کے شرکا رکار و حاضرین کا منجانب انجمن
شکریہ ادا کیا۔

مشاعرہ سات آذر کو رات کے ۹ بجے متھڈسٹ بائز ہائی اسکول میں زیر صدارت جناب
شوکت علی خان صاحب فانی مشاعرہ منعقد ہوا۔ جناب مولوی غلام محمود صاحب معتمد مشاعرہ
کے حسن انتظام اور سلیقہ کا نتیجہ تھا کہ ہال نہایت آراستہ تھا۔ اور شعراء و مہمانان وغیرہ کی نشستوں
کا علحدہ علحدہ انتظام کیا گیا تھا۔ ہال مہمانوں اور شعراء و اساتذہ سے بھرا ہوا تھا۔ مشاعرہ کا
آغاز جناب مولوی مسعود علی صاحب محوی کی فارسی غزل سے ہوا۔ اردو میں جناب مولوی سید
محمد صاحب اجلال و جناب مولوی دلدار حسین صاحب اظہر۔ جناب مولانا حسام الدین صاحب
فاضل و جناب مولوی محمد فاضل صاحب فاضل و جناب مولوی عبدالمجید صاحب مجید و جناب مولوی
ناظم صدیقی صاحب ناظم۔ جناب مولوی سعادت اللہ خانصاحب ہوش۔ اور جناب مولوی سید
اللہ بخش صاحب توحید کے کلام کی۔ اور فارسی میں جناب مولوی آغا طلعت صاحب و جناب
مولوی آغا فرخ صاحب کے کلام کی حاضرین نے بہت داد دی۔ آخر میں میر مشاعرہ جناب مولوی
شوکت علی خانصاحب فانی نے طرح کی غزل سنائی جس کی حاضرین نے خوب داد دی۔ اور حاضرین
کے اشتیاق اور اصرار پر غیر طرحی غزلیں بھی سنا کر محظوظ فرمایا۔ ایک بجے مشاعرہ برخاست ہوا۔

اردو فارسی مصرع ہائے طرح حسب ذیل ہے۔

اردو ع زندگی مشکل ہی تھی مرنا بھی مشکل ہوگیا۔

فارسی ع سیر صد باغ بہر خار بیاباں کردم۔

اساتذہ کے لیے خصوصی جماعتیں ۱۰ آذر ۱۳۴۶ف کو یہ عمارت آل سینٹس ہائی اسکول

حسب ذیل اسباق دے گئے۔

(۱) طبقہ تحتانیہ کے طلبا کو نیچر اسٹڈی پر جناب مولوی عزیز اللہ درّانی صاحب۔ ایم۔ ایس سی۔ ڈپ۔ ایڈ (لیڈز) مددگار ماڈل پرائمری اسکول نے سبق دیا۔

(۲) جناب ڈاکٹر تنشدار کر صاحب پی۔ ایچ ڈی (لنڈن) لکچرار عثمانیہ ٹیچرز ٹریننگ کالج نے طبقہ وسطانیہ کے طلبا کو سائنس پر سبق دیا۔

(۳) جناب مولوی سید احمد صاحب۔ ایم۔ اے (اڈنبرا) بی۔ ٹی نے مدارس فوقانیہ میں جغرافیہ کی تعلیم پر بزبان انگریزی تقریر فرمائی۔ جس میں موصوف نے جغرافیہ کی تعلیم کی اہمیت اور اس کے فوائد پر زور دیتے ہوئے طریقۂ تعلیم کی وضاحت فرمائی۔

(۴) جناب مولوی عبدالعزیز صاحب بی۔ اے۔ بی ٹی وائس پرنسپل عثمانیہ ٹیچرز ٹریننگ کالج نے طبقہ وسطانیہ کے طلبہ کو ریاضی میں نمونہ کا سبق دیا۔ موصوف نے مختلف چارٹس تیار فرمائے تھے جن سے سبق کے دوران میں کام لیا گیا۔

(۵) جناب مولوی خواجہ یوسف الدین صاحب۔ ایم۔ اے۔ ایم ایڈ (لیڈس) لکچرار ٹریننگ کالج نے طبقۂ وسطانیہ کے طلبہ کو انگریزی میں نمونہ کا سبق دیا۔

(۶) جناب مولوی قاری روشن علی صاحب ناظرا لقرأ نے طبقۂ تحتانیہ کے طلبا کو قرأت کا سبق دیا۔ تختۂ سیاہ پر حروف اور مرکب الفاظ لکھکر مخارج بتائے گئے اور صحیح طور پر پڑھنے کی مشق کرائی گئی۔

اسباق کے ختم ہونے پر نکتہ چینی کا موقع حاضرین کو دیا گیا۔ اور اعتراضات کے جوابات خندہ پیشانی سے دئے گئے۔

اسباق کا سلسلہ ختم ہوتے ہی ½ ۱۲ بجے جناب مولوی سید علی اکبر صاحب میر مجلس انجمن نے اردو میں بعنوان "طریقۂ تعلیم کے چند نقائص اور ان کی اصلاح" پر مبسوط اور مدلل تقریر فرمائی جس میں وہ نقائص بتائے گئے جو مدارس کے معائنوں کے وقت ممدوح نے دیکھے تھے۔ نیز ممدوح نے اپنے وسیع تجربہ کی بنا پر ان نقائص کے ارتفاع کی تدابیر بتائیں۔ مدرس کی نظر اور آواز کے متعلق اپنے تجربے بیان فرمائے جو نہایت دلچسپ تھے اس کے بعد فرمایا کہ تعلیم میں تیاری اسباق کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ محض تکمیل ضابطہ کے لئے اشارات لکھنا جیسا کہ عموماً ہوتا ہے بے سود ہے۔

تفصیلی اشارات لکھنے کے لئے مدرس کو کافی وقت نہیں لیکن اشارات کم از کم ایسے تو ہوں جو سبق پڑھانے میں مدرس کی رہبری کرسکیں اور اس کو بار بار کتاب دیکھنے کی ضرورت نہ ہو توضیح اور تشریح کے لیے تختہ سیاہ سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اس ضمن میں مدرسین کو یہ مشورہ دیا کہ ڈرائنگ میں اپنے استعداد کو بڑھانے کی کوشش فرمائیں ذاتی فعالیت اور ذاتی اظہار کا اصول طلبا کے لئے بیحد مفید ہوتا ہے مدرس کو سوالات کے طریقہ کا بھی کافی خیال رکھنا چاہیے۔ جرمن مدارس میں سبق کے اختتام پر عام طور پر چند طلبا کو باری باری سے اپنی جماعت کے دوسرے طلبا سے سوالات کرنیکا موقع دیا جاتا ہے۔ اس طریقہ سے طلبا کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہمارے مدارس کے طریقہ تعلیم میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اسباق کو عملی زندگی سے مربوط کرنے کی کافی کوشش نہیں کی جاتی اس میں نصاب کا کوئی قصور نہیں ہے۔ نصاب میں تعلیم کے عملی پہلو کا کافی لحاظ رکھا گیا ہے لیکن باوصف اسکے تعلیم کتابی ہے یہ نقص طریقہ تعلیم کا ہے

۔ نیچرا سٹڈی جغرافیہ اور حساب کی مثالیں دیکر جناب مولوی سید علی اکبر صاحب نے بتایا ان مضامین کو کس طرح عملی حیثیت سے مفید بنایا جا سکتا ہے ۔ اپنی تقریر کو ختم فرماتے ہوئے جناب ممدوح نے فرمایا کہ پیشۂ مدرسی میں کامیابی کا انحصار مدرس کی ذاتی قابلیت کام سے دلچسپی اور طلبا کے ساتھ ہمدردی پر ہے۔

دوسرے دن سٹی کالج میں جناب مولوی سید احمد صاحب نے طبقۂ فوقانیہ کے طلبا کو انگریزی میں جغرافیہ پر سبق دیا تختہ سیاہ اور نقشہ جات سے مدد لی گئی اور سبق کامیاب رہا۔

دیگر حضرات نے اسباق سے متعلق عنوانات پر تقاریر فرمائیں جو پر از معلومات اور تجربہ پر مبنی تھیں اسباق کے متعلق اشارات بھی اکثر حضرات نے طبع کرائے تھے جو بر وقت تقسیم کیئے گئے۔

تعلیمی نمائش بتاریخ ۱۰ آذر ۱۳۴۶ف نو بجے صبح سینٹ جارج گرامر اسکول میں علیا حضرت شہزادی درشہوار دردانہ بیگم صاحبہ نے نمائش تعلیمی کا افتتاح فرمایا صحن میں مہمانوں کے لیے وسیع شامیانہ نصب کیا گیا تھا تقریباً جملہ عہدہ دار صاحبان تعلیمات بلدہ و بعض عہدہ دار صاحبان اضلاع پروفیسر صاحبان عثمانیہ یونیورسٹی خواتین اور اکثر اعلیٰ عہدہ دار صاحبان بلدہ موجود تھے۔ ٹھیک نو بجے علیا حضرت شہزادی صاحبہ تشریف فرما ہوئیں جناب نواب سیف الدولہ جنگ بہادر

جناب خان فضل محمد خان صاحب اور جناب مولوی سید علی اکبر صاحب نے استقبال کیا بیانڈ نے سلامی دی۔ گارڈ آف آنر کا معائنہ فرماتے ہوئے محترمہ شہزادی صاحبہ نے ایک زر وفیتہ کو کھولتے ہوئے نمائش کا افتتاح فرمایا اور ہال میں داخل ہوئیں جہاں مختلف مدارس کے طلبہ اور طالبات کی تیار کردہ نمائشی اشیا سلیقہ کے ساتھ رکھی گئیں تھیں۔ علیا حضرت شہزادی صاحبہ نے پنسل کاری اور رنگ کاری اور سوزن کاری کے بعض نمونوں کو بغور ملاحظہ فرماکے پسندیدگی کا اظہار فرمایا اس کے بعد دوسرے ہال میں رونق افروز ہوئیں جہاں مدارس پست اقوام وغیرہ کا نمائشی سامان رکھا ہوا تھا۔ اس کو ملاحظہ فرماکر شامیانہ میں رونق افروز ہوئیں اور دو کمسن لڑکیوں نے نظم پڑھتے ہوئے گلدستہ پیش کیا۔ ماڈل پرائمری اسکول کے طلبا نے جسمانی ورزش اور گرامر اسکول کے طلبا نے کرتبی مظاہرہ کئے۔ بیانو پر ۱۲ کمسن طالبات نے رقص کیا جن میں سے ۶ مردانہ لباس میں میں تھیں۔ مس ڈی ویبسٹر صدر نمائش کمیٹی نے علیا حضرت شہزادی درشہوار و روانہ بیگم صاحبہ کو مخاطب کرنے کی عزت حاصل کرتے ہوئے حسب ذیل رپورٹ سنائی ہم کو اس بات کی بہت مسرت ہے کہ ہم آپ کا خیر مقدم کر رہے ہیں یہاں تشریف لانے کی آپ نے زحمت گوارا فرمائی اور نمائش تعلیمی کا افتتاح فرماکر ہماری عزت افزائی فرمائی ہے۔ میں انجمن کی جانب سے آپ کی خدمت میں ہدیہ تشکر پیش کرتی ہوں آپ کو تعلیمی مسائل اور ریاست کے مدارس کے بچوں سے کس قدر دلچسپی ہے اس کا آپ نے گذشتہ تین سال سے بیشمار طریقوں سے اظہار فرمایا ہے یقین ہے کہ اب آپ کو شہزادہ کی تعلیم کا بھی خیال ہے درحقیقت تمام سلطنت شہزادہ کی فلاح وبہبودی کی خواہاں ہے۔ نمائشی اشیا رجن کی تعداد ۲۰۰۰ ہیں آپ نے ملاحظہ فرمائی ہیں۔ یہ اشیا رمتمول اور غریب دونوں طبقوں کے بچوں کے مدارس سے آئی ہیں۔ کانفرنس کے ساتھ جو زیادہ تر نظری مسائل سے بحث کرتی ہے نمائش تعلیمی کے انعقاد کا مقصد یہ ہے کہ مدارس میں جو عملی کام انجام پاتا ہے اس کو ظاہر کیا جائے۔ رکنڈر گارٹن سہ سری مدارس اور فوقانیہ مدارس ـــــــ سے نمائشی اشیار وصول ہوئی ہیں اساتذہ نے بھی آلات تعلیمی اور ذہن سے متعلق اشیار بھیجی ہیں۔ ۲۰ مدارس پست اقوام سے بھی اشیار آئی ہیں۔ ہم لوگ آپ کی خدمت میں اس عزت افزائی کے باعث مکرر ہدیہ پیش کرتے ہیں۔ جناب ناظم صاحب تعلیمات نے حضرت بندگان اقدس اور علیا حضرت شہزادی درشہوار صاحبہ کے لیے تھری جیبر تجویز

کئے اور بیانڈ نے سلامی دی جس کے بعد مراجعت عمل میں آئی۔

شعبہ زائد از نصاب مصروفیات کا ذیلی جلسہ اور ضبط مدرسہ کی کمیٹی کی رپورٹ میں اور اس پر مباحثہ

بتاریخ ۱۱ر آذر ۱۳۴۶ف زیر صدارت ریورنڈ ایف سی فلپ (ایم اے) شعبہ زائد از نصاب مصروفیات کا ذیلی جلسہ منعقد ہوا جس میں جناب چندرورکر صاحب (ایم اے) معتمد بیورو زائد از نصاب مصروفیات نے اپنی رپورٹ پڑھی۔ ریورنڈ ایف سی فلپ نے شعبہ زائد از نصاب مصروفیات کے مشاغل کی اہمیت کا ذکر فرماتے ہوئے ان مصروفیات کا انسانی زندگی سے جو تعلق ہے ظاہر فرمایا جناب مولوی سجاد مرزا صاحب نے فرمایا کہ جب اساتذہ تعلیمی تفریح کے لئے کہیں جانا چاہتے ہیں تو حکام ان ریلوے رعایتی ٹکٹ نہیں دیتے اس کا انتظام شعبہ کرے تو مناسب ہے۔ ریورنڈ ایف سی فلپ نے جواب دیا کہ اس بارہ میں کوشش کی جائے گی۔

ضبط مدرسہ پر رپورٹ تیار کرنے کے لیے مرکزی انتظامی کمیٹی نے ایک ذیلی کمیٹی مقرر کی تھی. جس کی صدر نشین معتمد اور ارکان نے نہایت محنت سے اردو میں رپورٹ تیار کی۔

بتاریخ ۱۱ر آذر ۱۳۴۶ف ایک ذیلی جلسہ زیر صدارت جناب مولوی سجاد مرزا صاحب منعقد ہوا جس میں رپورٹ مذکور پڑھی گئی اور مختصر مباحثہ کے بعد رپورٹ منظور ہوی۔ جناب مولوی سجاد مرزا صاحب نے ایک موثر تقریر فرمائی جو رسالہ میں علحدہ شائع کی گئی ہے۔ اس تقریر میں ممدوح نے ضبط کی مثالیں روزمرہ کے واقعات سے دیکر تعلیم اور ضبط کا تعلق اور اساتذہ کے فرائض نہایت اچھے پیرایہ میں بتائے ہیں۔

بتاریخ ۱۴ر آذر ۱۳۴۶ف زیر صدارت جناب مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری بی اے (اکسن) ذیلی جلسہ منعقد ہوا جس میں ضبط مدرسہ پر انگریزی میں مسٹر ڈینکر نرائن بی اے بی ٹی نے رپورٹ پڑھی۔ مسٹر ٹی اے لنگم۔ بی اے ایل ٹی۔ نے یہ تحریک پیش کی کہ مدرسین اور امتحانات کا جہاں ذکر ہے وہاں یہ ترمیم کی جائے "مدرسین کو ہر ایسے امتحان میں شریک ہونے کی اجازت دی جانی چاہیے جو سررشتہ کے لئے مفید ہوں" جناب مولوی محمد سلطان صاحب نے اس ترمیم کی تائید فرمائی۔ مسٹر پارتھا سارتھی نے تحریک کی کہ مدارس میں جسمانی سزا قطعاً نہ دی جائے اور رپورٹ میں سزا کا جو فقرہ ہے حذف کیا جائے۔ مسٹر ڈینکر نارائن نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے

فرمایا کہ سزا کی تائید کا جو فقرہ ہے وہ رکھنا مناسب ہے کیونکہ بغیر اس کے ضبط کا قیام دشوار ہے بعض اخلاقی جرائم میں سزا کی شدید ضرورت پائی گئی۔ مسٹر پارتھا سارتھی کی ترمیم نامنظور ہوئی۔ جناب مولوی سید محمد حسین صاحب صدر جلسہ نے فرمایا کہ رپورٹ قابل قدر ہے۔ رپورٹ میں جو سفارشات کی گئی ہیں ان پر اساتذہ کو عمل کرنا چاہئے۔ متذکرہ بالا ترمیم کے ساتھ رپورٹ منظور ہوئی۔

کانفرنس کے اجلاس

اجلاس اول (صبح) بتاریخ ۱۱؍ آذر ۱۳۴۶ف سوا نو بجے صبح بمقام سٹی کالج زیر صدارت جناب قاضی محمد حسین صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی (کنٹب) نائب معتمد امیر جامعہ عثمانیہ کانفرنس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔ عہدہ دار صاحبان تعلیمات بلدہ و اضلاع خواتین و دیگر معززین، پروفیسر صاحبان و اساتذہ صاحبان سے ہال بھرا ہوا تھا۔ نمایندگان اخبارات کافی تعداد میں تھے جن کے لیے مناسب انتظام کیا گیا تھا۔ جناب قاضی محمد حسین صاحب تالیوں کی گونج میں کرسی صدارت پر تشریف لائے۔ جناب قاری روشن علی صاحب ناظر القراء اور مسٹر گنگادھر پھاٹک نے قراءت اور پرارتھنا سے کانفرنس کا آغاز کیا۔ جناب مولوی سید نور الحسن صاحب بی اے بی ٹی (علیگ)، ڈپ ایڈ (ایڈنبرا) صدر استقبالیہ کمیٹی نے خطبہ استقبالیہ پڑھا اس کے بعد صدر کانفرنس نے ڈاکٹر میکنزی اور مسٹر تھال کے انتقال پر ملال پر اظہار افسوس کرتے ہوئے حسب ذیل قرارداد پیش کی اور حاضرین نے استادہ ہو کر اس کو منظور کیا "یہ کانفرنس ڈاکٹر میکنزی اور مسٹر مارماڈیوک پکتھال کی وفات پر دلی رنج و الم اور ان کے پسماندگان کے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار کرتی ہے"۔ معتمد عمومی نے سالانہ رپورٹ سنائی اس کے بعد جناب ناظم صاحب تعلیمات نے صدر کانفرنس کو پھول پہنائے۔ صدر کانفرنس نے خطبۂ صدارت انگریزی میں پڑھا جس کا ترجمہ علیحدہ اسی نمبر میں شائع کیا گیا ہے۔ جناب ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب ڈی لٹ (پیارس) نے بہ عنوان "ہندوستانی مدارس میں تاریخ ہند کی تعلیم" اردو میں تقریر فرمائی اور ایشیا کے نقشہ پر ممالک وغیرہ بتلاتے ہوئے تقریر کی وضاحت فرمائی اور تاریخ کی تعلیم میں حسب ذیل امور پر زور دیا۔

(۱) ایک مورخ یا استاد تاریخ کے لیے اپنی رائے کا اظہار بشرطیکہ واقعات کا تعلق خود غرضانہ

ہو کوئی قباحت نہیں رکھتا۔

(۲) تاریخ میں محض واقعات کا دہرانا بے معنی ہے جب تک کہ اس کے ساتھ واقعات اور حالات پر تنقید نہ کی جائے۔

(۳) تاریخ کی تعلیم میں معاشرتی مقاصد کو پیش نظر رکھنا لازمی ہے۔

(۴) تاریخ کے استاد کو زندہ دل اور رجائی ہونا چاہیے۔

(۵) طالب علموں پر یہ بھی واضح کر دینا چاہئے کہ ہر زمانہ اپنے اندر کچھ خصوصیات رکھتا ہے اور اگر کوئی قوم ان خصوصیات سے بے خبر رہے تو اس کو زوال ہوتا ہے۔

(۶) بلاشبہ تاریخ کے استاد کو آئندہ کی تاریخ بنانے میں بہت کچھ دخل ہے۔

(۷) تاریخ نہ صرف معلومات پہونچانے تک محدود ہونی چاہیے بلکہ وہ آیندہ نوجوان نسل کے اخلاقی مفاد کی بھی ذمہ دار ہے۔

جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے ہندوستان کے گذشتہ تاریخی واقعات پر کافی روشنی ڈالی اور اقوام کی ترقی و تنزل کے اسباب بتائے۔ ان اساتذہ صاحبان کے لئے جو تاریخ ہند پڑھاتے ہیں۔ یہ تقریر یقین ہے کہ بہت مفید ثابت ہوگی اس کو ایندہ نمبر میں شائع کیا جائے گا۔

مسز اُنگلر ایم۔ اے۔ ایل ٹی۔ وظیفہ یاب صدر مہتممہ نسوان نے انگریزی میں بعنوان "ہندوستان میں تعلیم نسوان" مقالہ پڑھا جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

اس عنوان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ تعلیم بالغان اور تعلیم اطفال۔ معاشی مشکلات اول الذکر کی ترقی میں حایل ہیں۔ اس کی ترقی کے دو اہم اجزا رہیں یعنی سینما اور ریڈیو۔ عنوان بالا میں حسب ذیل شامل ہیں۔ حفظ صحت۔ بہبودی اطفال۔ فرسٹ ایڈ۔ آسان گھریلو علاج امراض متعدی کا علاج۔ زراعت دیہی تنظیم۔ تعلیم کی ایسی اسکیم بنائی جائے جس میں لطور خاص اس بات پر زور دیا جائے کہ عورتیں اچھی مائیں اور اچھی بیویاں بن سکیں۔ نفسیات اطفال کی تعلیم کا انتظام سرکاری اور امدادی مدارس ثانویہ میں کیا جا سکتا ہے۔ میری رائے میں عورتوں کو تیمارداری کی تعلیم بطور خاص دی جانی چاہیے۔ اگر عوام کے لئے جبری تعلیم کا انتظام ہو جائے تو ان مدارس میں تعلیم دو وقت دینی چاہئے طلبا کا ایک گروہ صبح مدرسہ جائے۔ اور دوسرا دوپہر میں تعلیم سے مستفید ہو۔ فطرت انسانی

اس کی مقتضی ہے کہ نادار طلباء کو روزانہ نصف یوم سے زیادہ تعلیم حاصل کرنے پر مجبور نہ کیا جائے تاکہ خاندان کی آمدنی متاثر نہ ہو۔ فطرت انسانی کا یہ بھی تقاضہ ہے کہ غریب طلباء کو روزانہ ایک وقت مدرسہ میں تازہ غذا دی جائے۔ اور کتب نیز دیگر ضروریات تعلیمی بھی پوری کی جائیں۔ متذکرہ مدارس میں فنی تعلیم کا بھی انتظام ہو تاکہ طالبات ختم تعلیم پر خاندان کی کمتر آمدنی میں اضافہ کرنے کا باعث بن سکیں۔ دیہی تنظیم کو خاص اہمیت دی جائے اور پیشہ زراعت کو تمام اسکیموں میں نمایاں جگہ دی جائے۔ دیہی رقبہ میں لڑکیوں کو ان کی آئندہ زندگی کامیاب بنانے کے لیے نظری اور عملی تعلیم دیجائے۔ متمول گھرانوں کی لڑکیوں کو امور خانہ داری، سوزن کاری۔ اور فن (ART) کی تعلیم دیجائے۔ اس کے بعد کپتان پٹاول سابق پرنسپل ہالی ٹیکنیکل انسٹیٹیوٹ قاسم بازار (کلکتہ) نے جو دیہی تنظیم کے سلسلہ میں حیدرآباد تشریف لائے ہوئے تھے اور جنہوں نے حکومت کے ملاحظہ میں ایک رپورٹ بھی پیش کی ہے حسب ذیل تقریر فرمائی۔

معاشی مسائل بتدریج تعلیمی انقلاب پیدا کر رہے ہیں تعلیم میں خوف وہراس کے عنصر داخل ہوکر ردعمل پیدا کر رہے ہیں ماہران تعلیم کو یہ خوف لگا ہوا ہے کہ جو تعلیم وہ دے رہے ہیں وہ بیروزگاری کے طرف لے جا رہے ہیں اور انقلاب جنگ اور خوف سے لوگ نامعلوم طور پر ہراساں ہیں ان اندیشوں کو کس طرح نیست ونابود کیا جاسکتا ہے؟ اگر ہم تعمیری کام کا آغاز کرکے تحریک امداد باہمی کو ترقی دیں تو پوری فضا کو بدلا جاسکتا ہے۔ سائنس دانوں کا یہ مشورہ ہے کہ اتحاد باہمی کی فضا پیدا کرلیں اور اس کے حصول کے لئے نظام تعلیم کو بدلنا پڑیگا۔ ایک مکمل نظام کی ترویج میں اخراجات کو نظرانداز کردینا پڑے گا۔ اس قسم کی تعلیم کا ایک اہم جز جان بخش قوتوں کی تربیت میں مضمر ہے۔ یونائیٹڈ کمیٹی نے ایک مسودہ قانون تیار کرکے مجلس وضع قوانین ممالک متحدہ امریکہ میں پیش کیا ہے۔ جو انسانی قوتوں کی نشو نما کا حامی ہے۔ دیہی تعلیم کا مسئلہ سائنٹفک نظام تعلیمی سے حل ہو سکتا ہے۔ جو موجودہ تدریس نظام کے برعکس ہے۔ اس طرح کا وسیع نظام تعلیم آئندہ تعلیمیافتہ طبقہ کی غربت اور افلاس کا خاتمہ کردے گا۔

اجلاس اول دوپہر

دو بجے سے دوسرا اجلاس شروع ہوا۔ دو بجے جناب نواب مرزا یار جنگ بہادر، امیر مجلس عدالت العالیہ نے "ترک مسکرات" پر مقالہ پڑھا جو رسالہ میں

علیحدہ شائع کیا جائیگا ۔ نواب صاحب ممدوح نے اساتذہ سے درخواست کی اس کام میں ان کا ہاتھ بٹائیں ۔

جناب مولوی سجاد مرزا صاحب ایم ۔ اے ڈکنٹب اپرنپل ٹریننگ کالج نے یہ دریافت فرمایا کہ ترک مسکرات کی تحریک کا مقصد کیا مسکرات کو بالکل ترک کر دینا ہے یا اعتدال کی گنجائش ہے کیونکہ بالکل ترک کرنے سے سلطنت کی آمدنی کا جو نقصان ہوگا ۔ اس کی تلافی کس طرح ہو گی ۔

نواب صاحب نے جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ سلطنت کی آمدنی کے نقصان کی فکر ان حضرات کو نہیں کرنی چاہیئے جنہیں اس کی تلافی کرنے سے راست تعلق نہ ہو جب لوگ زیادہ پارسا و نیک بنیں گے تو دوسرے ذرائع سے کمی کی تلافی کریں گے ۔ اعتدال کی نواب صاحب نے مخالفت فرمائی ۔

جناب مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری ۔ بی ۔ اے (آکسن) نائب ناظم تعلیمات نے قرآنی آیات سنا کر یہ ثابت فرمایا کہ نشہ حرام ہے ۔ نیز جناب نواب مرزا یار جنگ بہادر سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ منشی اشیاء کی بیخ کنی کی سعی فرمائیں تو مناسب ہے ۔ اور دوسرے ذرائع مثلاً آمدنی پر ٹکس وغیرہ عائد کرنے سے سلطنت کی آمدنی میں اضافہ ہو سکے گا ۔ و نیز فرمایا کہ تلنگانہ کے لوگ بمقابلہ مرہٹواڑی کے اشخاص کے مسکرات میں زیادہ حصہ لیتے ہیں ۔ اس لئے تلنگانہ کے اساتذہ کو تحریک ترک مسکرات سے دلچسپی لینی چاہیئے اور نوجوانوں کو مسکرات سے باز رکھنا چاہیئے ۔

۲ ½ بجے تک رپورٹ ضبط مدرسہ پر اردو میں بحث کرنے کے لئے ضمنی جلسہ زیر صدارت جناب مولوی سجاد مرزا صاحب منعقد ہوا ۔ اور ۴ بجے سے ۴ ½ بجے تک زیر صدارت ریورنڈ ایف سی فلپ شعبہ ز (امداز نصاب مصروفیات) کا ضمنی جلسہ منعقد ہوا ۔

اجلاس دوم (صبح) نمونہ کے اسباق کے سلسلہ میں تقاریر ہوئیں ۔ اور جناب مولوی احمد سعید صاحب نے طبقہ فوقانیہ کے طلبا کو جغرافیہ پر نمونہ کا سبق دیا ۔ ضبط مدرسہ کی کمیٹی کی رپورٹ پر انگریزی میں بحث ہوی ۔

اجلاس دوم (دوپہر) دو بجے دوسرا اجلاس زیر صدارت جناب مولوی قاضی محمد حسین صاحب نائب امیر جامعہ عثمانیہ شروع ہوا ۔ مس ڈی وبسٹر صدر کمیٹی نمائش نے

رپورٹ پڑھی جو علحدہ شائع ہوی ہے۔ اس کے بعد صدر جلسہ نے انعامات تقسیم فرمائے۔ جناب مولوی سید محمد صاحب ایم۔ اے لکچرار سٹی کالج نے "ہمارے نصاب میں اردو کی اہمیت" پر ایک دلچسپ مقالہ پڑھا۔ جو علحدہ آیندہ نمبر میں شائع کیا جائے گا۔ مسٹر دوراسوامی ایم اے ایل ٹی لکچرار انگریزی کی تعلیم کے چند تجاویز" پر ایک مبسوط تقریر فرمائی جس میں موصوف نے مادری زبان پر بحیثیت ذریعہ تعلیم کے زور دیا نیز فرمایا کہ برطانوی ہند میں انگریزی ذریعہ تعلیم ہے اس لیے اظہار خیالات کا معیار کس قدر بلند رہنا ضروری ہے ممالک محروسہ میں انگریزی بحیثیت لازمی زائد زبان کے پڑھائی جاتی ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں انگریزی کا معیار کم ہے ڈائرکٹ میتھڈ کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ ملکی زبان انگریزی زبان کے سیکھنے میں بہت معاون ہوتی ہے لٹریچر کے مطالعہ میں ملکی زبان بہت اہمیت رکھتی ہے اور السنۂ قدیم کا ذوق پیدا کرتی ہے لوگ بمقابلہ قواعد کے محاورات سے زیادہ ناواقف ہوتے ہیں۔ ملکی زبان اظہار خیالات پر قادر ہوتی ہے اور انگریزی زبان میں اظہار خیال ناقص ہوتا ہے۔ نثر کو زبان کی حیثیت سے نظم کو ادب کی حیثیت سے پڑھانا چاہیئے۔ انگریزی کی تعلیم عملی زندگی میں کارآمد اور تہذیب و شائستگی کے لیے مفید ہوتی ہے۔

جناب ڈاکٹر حیدر علی خاں صاحب۔ ایف آر سی۔ یس۔ پرنسل مڈیکل کالج نے اردو میں مقالہ پڑھا جس کا عنوان "مدرس اور بچوں کی عام بماریوں کی تشخیص تھا" اس کو علحدہ شائع کیا جارہا ہے اس کے بعد کانفرنس نے دو رزولیوشن پاس کئے پہلا ضبط مدرسہ کی ذیلی کمیٹی کی رپورٹ کی منظوری سے متعلق تھا، اور دوسرا آیندہ سال کے لئے اسکول ہائجن پر رپورٹ تیار کرنے لئے ذیلی کمیٹی کے تقرر سے متعلق تھا۔ جناب مولوی سید محمد مہدی صاحب معتمد باب حکومت نے "جاپان کے تاثرات" پر اردو میں تقریر فرمائی جس کو علحدہ شائع کیا جائے گا۔ اس میں جاپانیوں کی زندگی او رمختلف حیثیتوں سے جاپان اور حیدرآباد کا مقابلہ کیا گیا ہے عالیجناب نواب مہدی یار جنگ بہادر ایم اے (اکسن) صدرالمہام سیاسیات و تعلیمات نے دلچسپ تقریر فرمائی جس میں ابتدائی تعلیم۔ جبری تعلیم تعلیم نسواں۔ تنظیم جدید۔ اور تعلیم المعلمین جیسے اہم عنوانات پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے اور اصلاحی مدابیر بتائی گئی ہیں اس تقریر کو علحدہ رسالہ ہذا میں شامل کیا گیا ہے۔ صدر جلسہ کی خواہش پر مسز سروجنی نائڈو نے تقریر فرمائی جس میں موصوفہ نے کہا کہ میں دس سال پہلے بھی اس انجمن کی کانفرنس میں شریک ہوئی تھی،

اور آج سے پہلے بھی شاذ ایک اور مرتبہ شرکت کا موقع ملا تھا۔ میں حیدرآبادی ہوں مجھے حیدرآباد سے بیحد محبت ہے جب میں باہر جاتی ہوں تو حیدرآباد میں اپنا دل چھوڑ جاتی ہوں۔ عالیجناب نواب مہدی یار جنگ بہادر نے نسوانی تعلیم کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے اس کو سن کر میں بہت خوش ہوئی اس لئے کہ میں نے بھی یہیں پرورش پائی اور یہیں تعلیم حاصل کی ہے۔

صدر جلسہ عالیجناب مولوی قاضی محمد حسین صاحب نے اختتامی تقریر میں فرمایا کہ کانفرنس کی کامیابی سے مسرّت ہوئی یہ کامیابی انجمن کے کارپردازوں اور کانفرنس کے منتظمین اور میر مجلس انجمن جناب مولوی سید علی اکبر صاحب کی کوشش کا نتیجہ ہے۔

جناب مولوی سید علی اکبر صاحب میر مجلس انجمن نے فرمایا کہ یہ نمائش یادگار رہیگی کیونکہ علیا حضرت شہزادی درِشہوار دردانہ بیگم صاحبہ کے دست مبارک سے اس کا افتتاح عمل میں آیا ہے صدر کانفرنس اور عالی جناب نواب مہدی یار جنگ بہادر مسز سروجنی نائڈو اور دیگر مقررین اور ان پروفیسر صاحبان کا جنہوں نے تقاریر اور اسباق میں حصہ لیا تھا اور جن اساتذہ صاحبان کے کمیٹیوں میں حصہ لیا اور کانفر کے انتظامات محنت سے کرکے کانفرنس کو کامیاب بنایا ان سب کا نام بنام اور مہمانوں کا شکریہ ادا فرمایا اور کانفرنس کا آخری اجلاس ختم ہوا۔

معزز مہمان ایٹ ہوم میں شریک ہوئے اس کے بعد چند اساتذہ صاحبان نے موسیقی سے حاضرین کو محظوظ فرمایا۔ آخر میں جناب مولوی مرزا محمد علی بیگ صاحب نے اراکین انجمن کی جانب سے جناب مولوی سید علی اکبر صاحب میر مجلس کا شکریہ ادا کیا۔ جواب میں جناب مولوی سید علی اکبر صاحب نے کہا کہ کانفرنس کی کامیابی جملہ اراکین کے تعاون اور اتحاد عمل کا نتیجہ ہے تعلیمی ہفتہ میں اراکین نے جس جوش اور ولولہ سے حصہ لیا وہ یادگار رہے گا سب سے بڑھ کر خوشی کی بات ہے کہ انجمن کا ہر ایک رکن انجمن کے کام کو اپنا کام سمجھتا ہے۔ انجمن کی ترقی کا بڑا راز یہی ہے انجمن اساتذہ نے بلدہ کے مدرسین میں جو برادری کا رشتہ قائم کیا تھا اب ٹیچرز کلب کے افتتاح کی وجہ سے یہ رشتہ اور بھی زیادہ مضبوط ہوگیا ہے انجمن اور کلب ہر دو لیکن خصوصاً کلب مساوات کے اصول پر قائم ہے کلب میں نہ تو گزیٹیڈ اور نان گزیٹیڈ عہدہ دار ہیں اور نہ طبقہ تحتانیہ اور طبقہ فوقانیہ کے مدرسین میں کسی قسم کا امتیاز ہے امید ہے کہ جو اراکین انجمن اب تک کلب میں شریک نہیں ہوئے ہیں وہ اب شریک ہوجائیں گے۔

رپورٹ نمائش بابتہ سالانہ کانفرنس اساتذہ ۱۳۴۶ ف

مرتبہ

مس ڈی وبسٹر صاحبہ

انجمن اساتذہ بلدہ کی دسویں سالانہ نمائش کا افتتاح حضرتہ علیا شہزادی درشہوار نے فرمایا۔ بتاریخ ۱۵ اکٹوبر بروز پنجشنبہ کی صبح بمقام نمائش سینٹ جارجس گرامر اسکول میں نواب ذوالقدر جنگ بہادر، عالیجناب خان فضل محمد خاں صاحب ناظم تعلیمات، مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری، مولوی سید علی اکبر صاحب صدر مہتمم تعلیمات بلدہ اور دیگر اراکین نمائش کمیٹی نے حضرتہ علیا شہزادی صاحبہ کا خیر مقدم ادا کیا۔

حضرتہ علیا شہزادی صاحبہ نے نمائشی اشیاء کا ملاحظہ فرمانے کے بعد کمسن اطفال کے مختلف کرتب، ڈرل اور کھیل ملاحظہ فرمائے۔ ہم شہزادی صاحبہ کے بیحد سپاس گذار ہیں کہ نمائش کا افتتاح فرما کر ہماری عزت افزائی فرمائی۔

سالہائے ماسبق کی طرح نظمار کمیٹی کو اس سال بھی تصفیہ انعامات کے مشکل کام سے دوچار ہونا تھا ہم مسٹر اینگلر، مسٹر سیمپن، مس نیل، مسٹر عزیز علی، مسٹر ربانی اور مسٹر ہیوجیس ڈن کے خاص طور پر ممنون ہیں کہ ان حضرات نے اپنے قیمتی وقت کا زیادہ حصہ اس کام کی انجام دہی میں صرف کیا۔

مندرجہ بالا حضرات نے اپنے مفوضہ کام کو اگرچہ ½ ۴ ساعت شام کو شروع کیا لیکن رات کے ۸ بجے تک بھی وہ اپنے کام کو ختم نہ کر سکے آیندہ سال بشرطیکہ حالات اجازت دیں نمائش کا انتظام ایک وسیع مکان میں کم از کم ایک ہفتہ کے لئے کیا جائے گا تاکہ اس نمائش سے عوام بھی مستفید ہوں۔ اس موقعہ پر نمائش کے متعلق نظمار کی رائے اور سفارشات کا ذکر کردینا بھی قرین مصلحت ہوگا۔

(۱) شعبہ نقشہ کشی (ڈرائینگ) میں نظمار نے کام کی جدت کو ملحوظ رکھا۔ ایسی چیزیں کمیاب نہیں۔ زیادہ وقت مسابقت کنندگان نے نقالی میں صرف کیا اس لحاظ سے نظمار نے اصلی کام کام کرنے والوں کو انعامات تقسیم فرمائے۔

(۲) طبقہ وسطانیہ کے نصاب ڈرائنگ میں پتلی نونہ کے ڈرائنگ پر زیادہ اہمیت دی گئی اس طبقہ سے ڈرائنگ کے بہترین نمونہ جات پیش کئے گئے تھے۔

(۳) طبقہ فوقانیہ سے دستی مشاغل کے نمونہ جات گذشتہ سال کی بہ نسبت کم تعداد میں وصول ہوئے لیکن تاریخ و جغرافیہ کے بہترین نقشہ جات سے واضح تھا کہ خاص کر اس جانب بہت کافی توجہ دی گئی ہے۔

نظمار کمیٹی کو سوزن کاری کے کام سے بہت مایوسی ہوی چنانچہ اس سال سنجاف کے (حاشیہ) کام پر بہت کم توجہ دیگئی ہے۔

کپڑے کے موڑنے اور گرہ دینے میں نفاست سے کام نہیں لیا گیا کم عمر طالبات سے جن کی عمریں ۸، ۹، اور ۱۰ سال کی تھیں بہت ہی باریک اور نازک کام لیا گیا ہے جو کسی طرح ان کی عمروں کا لحاظ کرتے مناسب نہ تھا۔ اکثر تکیوں پر نمایشی کام ضرورت سے زیادہ کیا گیا تھا جس کی وجہ سے ان کا حقیقی مقصد فوت ہو رہا تھا یعنے اس نمائشی کام کے ازدیاد کی وجہ سے تکیے کسی انسانی سر کے آرام دینے سے قاصر تھے۔

طبقہ تحتانیہ میں مدرسہ عالیہ اور ماڈل پرائمری اسکول اور روزیری کانونیٹ سے بہت دلچسپ نمونہ جات بھیجے گئے تھے۔

اساتذہ کے کام میں سال حال نمایاں ترقی پائی گئی خیال ہے کہ آیندہ سال سے اساتذہ کی ذوق اور دلچسپی کی اشیا (Hobbies) کا ذخیرہ نمائش میں رکھا جائے گا۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر کے مجسمہ کی تصویر (جس کو انعام عطا کیا گیا ہے) مسز ایڈورڈ کی عکاسی اور نفس پیما تیار کردہ مسز بلینگم اور کھلونا (جانوروں کی شکلیں) تیار کردہ مسز نور الحسن اور سینٹ جارجیس گرامر اسکول کے عجائب خانہ کی بھی تعریف کردی جائے چند اعلی اور خوبصورت نمونہ جات محبوبیہ گرلس اسکول سے روانہ کئے گئے تھے جو اگرچہ مقابلہ میں شرکت کی غرض سے نہیں بھیجے گئے تھے اس پر بھی ایک سند انھیں عطا کی گئی۔ عثمانیہ ٹرینگ کالج بلدہ کے ان اشیا کو ایک سند عطا کی گئی جو مقابلہ میں شرکت کی غرض سے روانہ تو نہیں کی گئی تھیں لیکن اپنی حد تک وہ بہت دلچسپ اور خوبصورت تھیں۔ سال حال نمایشی مقابلہ میں ۱۱ مدارس نے حصہ لیا اور ان سب سے

(۲۰۷۰) اشیاء برائے مقابلہ وصول ہوئیں۔

ختم پر ہم سینٹ جارجیس گرامر اسکول کے وارڈن (صدر) کا شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتے کیونکہ انہوں نے از راہ عنایت اپنے مدرسہ کی عمارت ہماری نمائش کے اغراض کے لیے دی۔

منیجر صاحب مطبع اکسلسیر نے داخلہ کے ٹکٹ عنایت کرکے ہمیں مشکور کیا اسکوٹ ٹروپس۔

کبس (   ) اور ریلوے بورڈس نے ہماری بہت امداد کی۔ مہتمم صاحب عامرہ اور کوتوال صاحب بلدہ نے بھی ہمارے کاموں میں حصہ لیکر جو انتظامی معاملات میں مدد کی ہے، ہم ان کے از حد ممنون ہیں۔

مترجمہ وجیہ الدین صاحب مدرس مدرسہ وسطانیہ گورنمنٹ محل

خلاصہ تقریر

ضبط مدرسہ

مولوی سجاد مرزا صاحب ایم۔اے۔کنٹب صدر اجلاس ذیلی کمیٹی ضبط مدرسہ

جرمن کے بادشاہ فریڈرک اعظم کا یہ مقولہ بیان کرتے ہوئے کہ "بادشاہ اپنے ملک کا سب سے پہلا خادم ہے" آپ نے فرمایا کہ ان کے خیال میں اسی طرح مدرس اپنے ملک کے بچوں کا سب سے پہلا خادم ہے اور کار پردازان عثمانیہ ٹریننگ کالج اس بات سے خوش ہیں کہ وہ اپنے کو مدرسین کا سب سے پہلا خادم خیال کرتے ہیں۔ ان کو اس سے مسرت ہوتی ہے کہ انجمن اساتذہ کے روح رواں مولوی سید علی اکبر صاحب ان کو ایسے مواقع پر خدمت کرنے کا موقع عطا فرماتے ہیں۔ آج کے ذیلی جلسہ میں جو رپورٹ ضبط مدرسہ کے متعلق پیش ہوی ہے وہ نہایت درجہ اہم ہے اس پر بحث مباحثہ بھی ہو چکا ہے۔ جی تو چاہتا ہے کہ اس پر تفصیل کے ساتھ تنقیدی نظر ڈالی جائے لیکن اب وقت کی تنگی کے باعث اس کا موقع نہیں رہا۔ لہذا دو تین باتیں غور و فکر کے لیے پیش کی جاتی ہیں:۔

لفظ ضبط غالباً اس مطلب کے ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے جس کے لیے انگریزی میں لفظ ڈسپلین استعمال ہوتا ہے عثمانیہ ٹریننگ کالج نے تراجم کے سلسلہ میں اس پر بھی جامعہ عثمانیہ کے اراکین کی شرکت میں غور کیا اور یہ نتیجہ نکلا کہ ڈسپلن کا مفہوم کسی فارسی عربی یا ہندی لفظ سے ادا

نہیں ہو سکتا اس کے معنے بدلتے رہے ہیں اور اس تبدیلی کا سلسلہ جاری ہے اس کا ماحول ہی جداگانہ ہے اس لیئے وہی لفظ قبول کرلیا جائے تو مناسب ہوگا چنانچہ اس تصفیہ کے موافق عمل کرنا چاہیئے۔

(۲) پیش کردہ رپورٹ میں یہ نہیں بتلایا گیا کہ اس کی تیاری میں کن ذرائع سے معلومہ مواد فراہم کیا گیا۔ طریقہ کار اہم چیز ہے۔ اگر ہم مدرسین وغیرہ سے بذریعہ تختہ سوالات و ملاقات ان کی مشکلات معلوم کریں بعض متعلقہ واقعات کی جانچ کریں والدین و سرپرستوں سے استفسار کریں تو ایسا مواد جمع ہو جائیگا۔ جو قابل عمل تجاویز اختیار کرنے میں مدد دے گا۔ انجمن اساتذہ ایک عملی انجمن ہے لہذا اس کی تمام تجاویز میں عملی پہلو قوی رہنا چاہیئے۔

(۳) ڈسپلن سے متعلق جو حقیقی مشکل ہے وہ یہ ہے کہ آزادی، ترقی، انفرادی ارتقا، ضبط، روایات اور اجتماعی زندگی میں تضاد سمجھا جاتا ہے حالانکہ واقعہ اس کے خلاف ہے آزادی اور ضبط ترقی اور روایات۔ انفرادی ارتقا اور اجتماعی زندگی میں تعاون اور ارتباط ہے اور ہونا چاہیئے۔ مدرسین کا بڑا کام یہی ہے کہ ان کو ایک دوسرے سے وابستہ کردیں۔

(۴) ہمارے ملک میں مذہب کی اہمیت کے باعث یہ خیال ہو چلا ہے کہ انسان کے وضع کردہ قوانین و قواعد کی پابندی لازم نہیں ہے۔ کسی مسجد میں آپ مجمع کو دیکھیں تو ظاہر ہوگا کہ نہایت خاموشی اور خوش سلیقگی کے ساتھ ہر ایک مصروف ہے بلا کہے سنے صف تک سیدھی کرلی جاتی ہے لیکن اسی مجمع کو آپ سڑک پر پیدل یا سائیکل پر چلتے یا ریلوے اسٹیشن پر ٹکٹ خریدتے یا ڈبہ میں چڑھتے دیکھیں تو آپ کو تعجب ہوگا کہ کس درجہ گڑبڑ بے قاعدگی اور دھینگا مشتی کی جاتی ہے وجہ ظاہر ہے۔ ایسے مواقع پر جن قواعد یا آداب کی پابندی کرنی چاہیے اس کا کسی کو بھی سرمو خیال نہیں ہوتا اور یہ محض اس واسطے کہ ان کے متعلق کوئی فتوی یا مذہبی حکم موجود نہیں ہے بلکہ ہر ایک جانتا ہے کہ وہ انسان کے وضع کردہ اور منظورہ ہیں۔ یہی حال ہندوستان میں کمیٹیوں کا ہوتا ہے جن کے لازمی طور پر اکثریت کے منظورہ تصفیہ اقلیت کے لئے قابل تعمیل شمار نہیں ہوتے۔ اس کے برخلاف ممالک مغرب میں ایک تصفیہ کے بعد مخالف سے مخالف بھی اس کی پابندی اپنے اوپر لازم اور عدم پابندی یا مخالفت اپنے ضمیر کے خلاف تصور کرتا ہے۔ یہ ان ممالک میں کمیٹیوں کی کامیابی اور ہمارے ہاں ناکامیابی کا راز ہے۔

ایسی ذہنیت کی موجودگی میں خصوصاً جب کہ ہمارے مدارس میں مذہب بطور ایک نصابی مضمون پڑھایا جاتا ہے اور اس کی تعلیم مولوی صاحبان کے سپرد ہے تو کیا یہ مناسب ہوگا کہ ہم طلبہ کے اخلاق، افعال و کردار کے بھی دو حصے کریں اور اپنے دائرۂ عمل کو محدود کر کے اپنی توجہ صرف اسی ایک چیز پر منعطف کر دیں جس کا تعلق بالکلیہ موجودہ زندگی کے باعث زیادہ تر دنیوی امور سے ہے۔ جرمن فلسفی کانٹ نے کیا خوب کہا ہے کہ "جب تجھ کو کیا کرنا چاہیے مجھ کو کیا کرنا چاہیے میں تبدیل ہو جائے تب کہیں انسان ہوتا ہے" غرض ہماری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ ہم اپنے طلبہ میں انسان کے بنائے ہوئے قوانین قواعد اور ہدایات کی اہمیت اور حرمت کا خیال پیدا کریں اور طلبہ کی ایسی ذہنیت بنا دیں کہ وہ ان کی پابندی اپنا اولین فرض اور ان سے خلاف ورزی اپنے ضمیر کے خلاف سمجھنے لگیں۔ پروفیسر وائٹ ہیڈ کا مقولہ ہے کہ "دانائی کا واحد راستہ آزادی ہے جو علم کی موجودگی میں ہو۔ لیکن علم کا بالکلیہ واحد راستہ ڈسپلن ہے جو باترتیب واقعات کی تحصیل پر مبنی ہو"۔ ہر ایک کو یہ اپنے پیش نظر رکھنا چاہیے۔

تقریر عالیجناب نواب مہدی یار جنگ بہادر ایم اے (اکسن)

صدرالمہام سیاسیات و تعلیمات ملک سرکار عالی

اس کانفرنس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کا صدر خطبہ صدارت انگریزی میں پڑھتا ہے۔ اور تقریر بھی انگریزی میں کرتا ہے۔ گذشتہ سال میں نے بھی انگریزی میں خطبہ پڑھا تھا۔ اور تقریر بھی کی تھی۔ چونکہ اس سال میں صدر نہیں ہوں اور آزاد ہوں اس لئے اردو میں تقریر کروں گا۔ انجمن اساتذہ کا دسواں اجلاس خیر و خوبی کے ساتھ اختتام کو پہنچ رہا ہے یہ ایک نہایت مفید تحریک ہے جو ہر سال ترقی کر رہی ہے اس کا دائرۂ عمل وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ میں نے نمائش میں جو چیزیں دیکھیں وہ گزشتہ سال سے بہتر تھیں۔ یہ کانفرنس کی خوش نصیبی ہے کہ اسے قاضی محمد حسین صاحب جیسا تعلیمی دلچسپی اور انہماک رکھنے والا شخص ملا۔ باوجود موجودہ مشکلات کے قاضی صاحب نے جامعہ کے ساتھ جو دلچسپی لی اور نئی نئی باتیں پیدا کیں یہ سب ان کے تعلیمی انہماک پر دلالت کرتی ہیں۔

ملک کو جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ابتدائی تعلیم ہے اگر ابتدائی تعلیم وسیع پیمانہ پر نہ ہو تو اس کی مثال ایک کھوکھلی عمارت کی سی ہے ہماری ریاست کی آبادی کے لحاظ سے موجودہ تعدادِ اطفال زیرِ تعلیم بالکل ناکافی ہے ابتدائی تعلیم کے لئے تدابیر اختیار کرکے ہمیں اس الزام کو دور کرنا چاہیئے کہ یہاں کے لوگ زیادہ لکھے پڑھے نہیں ہیں ملک میں ابتدائی تعلیم کو جبری کرنے کے لئے زور دیا جارہا ہے حکومت اس کے خلاف نہیں ہے مگر وقتِ واحد میں تعلیم کا جبری کیا جانا ممکن نہیں۔ اگر تعلیم جبری کر دی جائے تو ہم استادوں اور عمارتوں کو فی الفور مہیا نہیں کرسکیں گے۔ مجھے امید ہے کہ جبری تعلیم کے حامی عملی مشکلات پر غور کریں گے۔ اور اس کو بھی دیکھیں گے کہ جو لوگ اس وقت خوشی سے تعلیم پارہے ہیں ان کے انتظام میں کیسی مشکلات پیش آرہی ہیں۔ پھر بھی حکومت جبری تعلیم کے مسئلہ پر غور کر رہی ہے جبری تعلیم کی مخالفت عدم ہمدردی کی بنا پر نہیں بلکہ محض عملی اور انتظامی مشکلات کی بنا پر کی جاسکتی ہے۔

دوسرا اہم مسئلہ تعلیم نسوان کا ہے۔ تعلیم نسوان کی ترقی کی رفتار خاطر خواہ نہیں ہے اور اس طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے کیونکہ اگر لڑکیوں کی تعلیم کا معقول انتظام نہ کیا جائے تو قوم ترقی نہیں کرسکتی۔ ذہانت کے اعتبار سے لڑکیاں لڑکوں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں چنانچہ حالیہ امتحانات میں بعض لڑکیوں نے نہ صرف امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی بلکہ وہ لڑکوں پر بھی سبقت لے گئیں۔ عورتوں میں تعلیمی شوق ملک کی ترقی کے لئے فال نیک ہے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ ہماری قوم مردہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک نیا جنم لینے والی ہے۔ جب عورتیں تعلیم یافتہ ہوکر اچھی مائیں بنتی ہیں تو آیندہ نسل اور بھی زیادہ تعلیم یافتہ ہوتی ہے۔

ملک کی ترقی کے لئے محض ادبی تعلیم کافی نہیں ہے اس لئے حکومت پیشہ ورانہ تعلیم کے مسئلہ پر غور کر رہی ہے اور اس کے لئے ایک اسکیم منظور ہوا ہے اس اسکیم کی غرض وغایت یہ ہے کہ جن طلبہ کا رحجان اعلیٰ ادبی تعلیم کی طرف نہیں ہے ان کو پیشہ ورانہ تعلیم دی جائے۔ جب یہ اسکیم نافذ ہوجائے گا تو ملک کی خوشحالی پر اس کا اچھا اثر پڑیگا۔

اساتذہ کو چاہیئے کہ فنِ تعلیم کو حقیر نہ سمجھیں اور اپنے فن میں مہارت تامہ حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ یہ وہ فن ہے جس سے قوموں کی تعمیر ہوتی ہے۔ میں نے اپنے دوروں میں اکثر جگہ طریقہ

طریقہ تعلیم میں نقائص پائے۔ مدارس تعلیم معلمین کی تنظیم اور اصلاح کی جانب توجہ کرنے کی ضرورت ہے

شذرات

خلاصہ روئدادہائے جشن سالگرہ مبارک اعلیحضرت بندگانعالی منعقدہ یکم رجب ۱۳۵۵ھ ف

مدرسہ قصبہ سردار (رائچور)

تاریخ صدر صبح کے نو بجے طلبا حاضر تھے اور معززین مقامی نے جلسہ میں شرکت فرمائی پولیس نے سالگرہ مبارک کی سلامی ادا کی۔ پھر چار بجے طلبا کے اسپورٹس ہوئے۔ ۵ بجے بصدارت مولوی شاہ عالم صاحب سررشتہ دار دفتر صدر مہتممی تعلیمات ضلع رائچور حمد باری سے جلسہ کا آغاز ہوا تقاریر میں برکات دور عثمانی اور دور ہمایونی میں ترقیات دیہی قابل ذکر ہیں اول الذکر کو تانیا طالب علم مدرسہ ثانی الذکر کو صدر مدرسہ نے بیان کیا آخر میں طلبا نے بزبان کنڑی ڈرامہ (بچوں کا انصاف) اسٹیج کیا اور جلسہ دعائے سلامتی اعلیحضرت بندگانعالی و خانوادۂ آصفجاہی پر ختم ہوا۔

مدرسہ تحتانیہ خوشن پلی تعلقہ کھمم ضلع ورنگل

صبح آٹھ بجے شبیہ مبارک کے ساتھ طلبا کا جلوس نکالا گیا جس میں معززان دیہی اور معززین مقامی شریک تھے اور ۴ بجے بصدارت مولوی محمد مولانا صاحب پلس قرأت کے ساتھ جلسہ کا آغاز ہوا طلبہ نے ترانا گایا اور اردو تلنگی میں مکالمہ کیا صدر مدرسہ نے بزبان اردو اور ایک مددگار مدرسہ نے بزبان تلنگی سالگرہ مبارک کی اہمیت اور برکات دور عثمانی پر تقریریں اور دعائے سلامتی اعلیحضرت بندگانعالی پر جلسہ برخاست ہوا۔

مدرسہ تحتانیہ ویلپال تعلقہ کلواکرتی

صبح ۷½ بجے طلبہ کا جلوس نکالا گیا شبیہ مبارک کے سامنے پولیس مقامی نے سلامی کی رسم ادا کی طلبہ نے حمد و نعت سنائی صدر مدرسہ نے زبان تلنگی میں عہد عثمانی کے برکات پر مختصر مگر جامع تقریر کی پھر شہریار و شہزادگان و شہزادیان خجستہ خصال کی دعائے ترقی عمر و اقبال پر جلسہ برخاست ہوا۔

مدرسہ تحتانیہ مرسن پلی تعلقہ کورنگل

شام کے ۴½ بجے ترانہ کے ساتھ طلبا کا جلوس گشت لگایا جس میں معززین مقامی شریک و معاون جلسہ تھے پرچم آصفی کے سامنے سلامی کی رسم ادا ہوئی در

جلسہ بصدارت مسٹر دتا تری راؤ صاحب بی۔اے۔ایل ایل بی۔شروع ہوا۔مددگار صاحبان مدرسہ
نے بدل ونوال شاہ اور علم دوستی دورعثمانی ونظم سالگرہ منائی طلباء مدرسہ نے ترقیات وبرکات
دورعثمانی وغیرہ پر مضامین پڑھے۔صدر مدرسہ نے حسن واہمیت علم کی تفہیم کے ساتھ حصول علم کی تشویق
اور دیہی طبقہ کو اتحاد عمل وباہمی تعاون پر آمادہ کیا سب کے آخر میں صدرنشین صاحب نے بھی دورعثمانی
پر روشنی ڈالتے ہوئے حاضرین کو حصول علم کی ترغیب اور مدرسین کو ہم آہنگی کی بھی تحریص دلائی۔پھر طلباء
کے اسپورٹس کے بعد جلسہ حضور پرنور اور شاہزادگان وشاہزادیاں کے دعائے عمر واقبال پر ختم ہوا۔

جلسہ سالانہ اسپورٹس مدرسہ تحتانیہ قصبہ موسیٰ پیٹھ (محبوب نگر)

بتاریخ ۱۹ر و ۲۰ر خورداد ۱۳۴۵ف بتقریب جلسہ سالانہ اسپورٹس مدرسہ بیاڈمنٹن
ٹیس کا مقابلہ عثمانیہ کلب انوار کلب اور کرم کلب کے مابین ہوا پہلے
روز اول الذکر دو کلبوں کا مقابلہ رہا۔اول الذکر کو کامیابی حاصل ہوئی دوسرے روز اول الذکر اور ثانی
الذکر دو کلبوں کا مقابلہ رہا پھر بھی اول الذکر یعنی عثمانیہ کلب کی کامیابی رہی شام میں انعامات تقسیم ہوئے
اس جلسہ میں عہدہ داران مقامی کی شرکت قابل تشکر و باعث تزئین جلسہ تھی۔

جلسہ سالانہ مدرسہ تحتانیہ تعلقہ ویلیر (ورنگل)

بتاریخ ۸ر تیر ۱۳۴۵ف صبح ۶ بجے طلبہ نے حمد باری تعالیٰ سے کارروائی جلسہ
کا آغاز کیا۔جھنڈیوں کے ساتھ ترانہ دکن گاتے ہوئے بچوں نے بیرون آبادی
گشت کیا جسمیں معززین مقامی کی شرکت تھی۔پھر تاریخ ۹ر تیر ۱۳۴۵ف صبح ۸ بجے بصدارت صدر مدرس صاحب
مدرسہ جلسہ کا آغاز ہوا معتمد جلسہ نے رپورٹ سالانہ سنائی جس میں مدرسہ کے نظم ونسق اور ترقی مدرسہ کے حالات
پر روشنی ڈالی گئی۔اس کے بعد صدر صاحب اور دیگر اصحاب نے ذہنی اخلاقی اور جسمانی تعلیم اور علم کی ترغیب
وفوائد وغیرہ پر تقریریں کیں بعض طلبائے مدرسہ نے اردو اور تلنگی نظمیں پڑھیں جو علمی فوائد سے متعلق تھیں۔
اور بعض طلباء نے کاہلی اور اس کی برائیوں پر نصیحت آموز لکچر دیا سب کے آخر اعلیحضرت بندگان عالی اور
صاحبزادگان فرخندہ فال کے لئے دعا مانگی گئی پھر اسپورٹ اور تقسیم انعامات کی کارروائی کے بعد حاضرین
کے شکریہ پر جلسہ برخاست کیا گیا۔

بچوں کے عام امراض کی تشخیص میں استاد کا اہم حصہ

از

ڈاکٹر حیدر علی خاں صاحب ایف. آر. سی. ایس پرنسپل میڈیکل کالج

حفظان صحت کے ماہرین اور تجربہ کار معلمین سب اس بارے میں متفق الرائے ہیں کہ بچوں کی صحت کی نگہداشت اور تحفظ کے لیے بعض نہایت ابتدائی اصول صحت کا جاننا ضروری ہے، جن پر نہ صرف بچوں کی موجودہ صحت کا دارومدار ہے بلکہ جو آئندہ پیدا ہونے والے امراض کی روک تھام میں ممد ہوتے ہیں۔ فی الحقیقت مدرسین کی بروقت امداد سے بچوں کے ناواقف والدین کو اپنے بچوں کی صحت کی درستی اور آئندہ پیدا ہونے والے امراض کے سدباب میں نہایت قیمتی اشارات ملتے ہیں، جن سے طبی امداد اور معقول علاج کے حاصل کرنے میں بڑی آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ بچہ کی صحت کا مسئلہ قوم کی صحت اور زندگی کا مسئلہ ہے، اور نونہالان قوم کے پھلنے پھولنے اور نشو نما پانے میں استاد ہی ماں باپ کو پوری توجہ دلاسکتے ہیں۔ باخبر اور واقف کار استاد اپنے شاگردوں کی حالت اور جسمانی صحت کا دلچسپی اور شفقت کے ساتھ مطالعہ اور مشاہدہ کرتے ہیں، جس کی وجہ سے آئندہ خرابیوں کی بروقت روک تھام ہو سکتی ہے۔ استاد نہ صرف جماعت کے کمرے کی صفائی، روشنی، ہوا، اور پانی کے انتظام کی درستی کرتا رہے، بورڈ (تختہ سیاہ) کو مناسب مقام پر رکھواتا ہے، اور اسکول کا فرنیچر معیاری وضع قطع کا مہیا کرتا ہے تاکہ بچوں میں خرابی نظر اور جسمانی کجی نہ پیدا ہونے پائے۔ ملیریا کے موسم میں ملیریا سے بچنے کے طریقوں کو رائج کراتا رہے۔ گرد و غبار سے بچنے کے انتظامات نہ صرف اسکول کے کمروں میں کرتا ہے بلکہ بچوں کو بیرون مدرسہ بھی اس کی مضرتوں سے آگاہ اور خبردار کرتا ہے جا بجا تھوکتے پھرنے کی خرابیوں اور غلاظتوں سے گریز کرنے کے ابتدائی اصول سے واقف کرتا ہے۔

ان تمام خارجی امور کے علاوہ استاد اپنی جماعت کے ہر طالب علم کی ذاتی حالت اور جسمانی صحت پر فرداً فرداً نظر غائر ڈالتا رہتا ہے اور ان کی صحت کی بدیہی خرابیوں کو دیکھتا

بھالتا ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی انجمن تعلیم کے طرف سے کچھ عرصہ ہوا ایک رسالہ شائع ہوا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ "چند سال پہلے وہاں کے دو کروڑ طلبا میں کم از کم ۶۵ فیصدی ایسے بچے تھے جنہیں عوارض جسمانی اور نقائص صحت کے سبب طبی معائنہ اور علاج معالجہ کی ضرورت تھی ان بچوں میں سے ڈیڑہ فیصدی بچے امراض قلب میں مبتلا تھے تقریباً ۱ فیصدی کو سل یا دق کے آثار تھے۔ قریب ۵ فیصدی کو ہڈیوں کی کسی نہ کسی قسم کی شکایت تھی (مثلاً ریڑہ کی خمیدگی (spinal curvature) چپٹا تلوا (Flat foot) وغیرہ وغیرہ) ۵ فیصدی سے زائد میں امراض گوش اور ثقل سماعت تھی۔ تقریباً ۲۵ فیصدی کو ضعف بصارت یا دیگر امراض چشم لاحق تھے۔ ۲۰ فیصدی کو فساد تغذیہ (malnutrition) کی وجہ سے امراض لاحق تھے۔ ۳۰ فیصدی کو ورم لوزتین (tonsils) غدود (adenoids) یا گردن کی بڑھی ہوئی گلٹیوں کی شکایت تھی۔ ۵۰ فیصدی سے زائد درسگاہوں میں اور بعض مکتبوں میں ۹۵ فیصدی بچوں میں دانتوں کی خرابی (پایوریا) وغیرہ تھی۔"

جب کہ امریکہ جیسے مہذب اور خوشحال ملک کا یہ حال تھا تو ہمارے غریب ملک کا کیا حال ہوگا۔ جہاں افلاس کے ساتھ کم علمی اور اوہام پرستی اس قدر زیادہ ہے۔ امریکہ میں تو ماہرین تعلیم و حفظان صحت اور باخبر استادوں کی توجہ سے حالات بہت بہتر ہو چکے ہیں ہمارے ملک میں بھی اب خدا کے فضل سے ترقی تعلیم و صحت کی راہیں کھلتی جاتی ہیں اور ہمارے اساتذہ اب قوت عمل اور بیداری سے طلبا کی حالت کو بہت کچھ بہتر بنا سکتے ہیں۔

استاد کی نگرانی کی اہمیت بارہا واقعات سے ثابت ہو چکی ہے کم فہم اور غبی لڑکوں کے طبی امتحان سے اکثر معلوم ہوا ہے کہ ان میں کوئی نہ کوئی جسمانی عیب موجود تھا جس کی وجہ سے ان کی دماغی ترقی قطعاً ساکت ہو گئی تھی۔ اور جب ان کے اس نقص یا عیب کو دیکھ کر علاج کرایا گیا تو وہی کم فہم غبی اور کمزور بچے نمایاں طور پر صحیح الدماغ ہو گئے اور ان کے جسمانی نشو و نما میں بھی معتدبہ ترقی پائی گئی۔

درسگاہ میں داخلہ کے ساتھ فوراً اور بعد وقتاً فوقتاً بچوں کی صحت کا امتحان ضروری ہے۔ بچوں میں بہت سی ابتدائی خرابیاں ایسی ہوتی ہیں جن کے متعلق اگر استاد توجہ اور مشاہدہ کرتا رہے تو بہت جلد باقاعدہ طبی امداد حاصل ہو کر ان خرابیوں کی روک تھام ابتدائی درجے ہی میں ہو سکتی ہے اور آئندہ

بڑی خرابیوں اور شدید امراض کا سدباب ہو سکتا ہے۔

مرض کی تشخیص کوئی آسان کام نہیں، اور بعض اوقات اس میں قابل ترین طبیب کو دقت پیش آتی ہے اور مغالطہ ہو سکتا ہے۔ اسی واسطے استاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ کوشش کرکے اپنی قوّتِ مشاہدہ کو کام میں لائے، کیونکہ اس کے لیے تشخیص کا یہی واحد ذریعہ ہے۔ اس کے لیے اس امر کا بھی صحیح طور پر جاننا اور سمجھنا ضروری ہے کہ صحت یعنے طبعی حالت کیا ہے؟ کیونکہ طبعی حالت کو جانے بغیر غیر طبعی حالت

صحت اور مرض

یعنے مرض کو پہچاننا اور سمجھنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

امراض کی جماعت بندی تین قسموں میں ہو سکتی ہے:۔ (۱) حاد (acute) امراض وہ ہیں جن کا حملہ ناگہانی اور یکایک ہو جاتا ہے۔ یہ عموماً زیادہ شدید ہوتے ہیں، مثلاً متعدی بخار یا ساری تپیں (infectious fevers)۔ (۲) تحت الحاد (sub-acute) امراض ہیں جن کا حملہ اس قدر ناگہانی طور پر نہیں ہوتا، یا جو حاد علامات کے رفع ہو جانے کے بعد کا درجہ ہوتے ہیں۔ (۳) **مزمن یا کہنہ**۔ امراض دیرپا ہیں اور عرصہ تک جاری رہتے ہیں مثلاً سل یا دق،

بچہ کی فطرت

یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ **بچہ فطری طور پر** ہنس مکھ، ہشاش بشاش، اور شاد و خرم ہوتا ہے، اور اُس میں بڑی چستی تیزی اور توانائی ہوتی ہے۔ اگر اس کی حالت اس کے خلاف نظر آئے تو اس سے شبہ پیدا ہونا چاہیے کہ کچھ دال میں کالا ہے۔

بچہ شاذ ہی چپ چاپ لیٹتا یا نچلا بیٹھتا ہے، وہ خاموش کھڑا بھی نہیں رہے گا، بلکہ ادھر ادھر دو کبڈی لگانا، اور کھیلنا پسند کرے گا۔ لہٰذا جب یہ دیکھنے میں آئے کہ وہ سُست اور خاموش ہے اور اُس کی تیزی اور چستی میں کچھ کمی ہے، تو اس غیر معمولی حالت کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہئیے۔ اگر اس کی چال ڈھال اور رفتار میں معمولی حالت کے مقابلہ میں کچھ فرق نظر آئے تو اس کا سبب معلوم کرنا چاہیے۔

چہرے کا رنگ

دوسری چیز جسے دیکھنا چاہیے **بچہ کے چہرے کا رنگ** اور اس کی ہیئت ہے۔ تندرستی اور صحت وری کی سرخ و سفید رنگت میں اور مدقوق کی سُرخی یا عادتی حرارت کی تمتماہٹ (hectic flush) میں فرق کرنا چاہئیے۔ اس میں اور **قلت الدم** (anaemia) کے پھیکے رنگ، اور یرقان کی زرد جھلک میں تمیز کرنا آسان ہے۔ دھوپ میں کھیلتے ہوئے بچہ میں بھی سُرخ تمتماہٹ (تورد) (flush) عارضی طور پر پیدا ہو سکتی ہے

(باقی دارد)

not only to find out how its products are placed in life but to help in finding places for them in life." We strongly support his suggestion for the establishment of an Employment Bureau.

Nawab Mahdi Yar Jung Bahadur, Political and Education Member, once more gave proof of his deep interest in our Association and of the value which he attaches to it not only by attending the Conference but by making an important speech. Every one will agree with him that, so far as education is concerned, the three most urgent problems of our State are expansion of Primary education, advancement of Women's education and improvement of the training of teachers. We have no doubt that under his able leadership, vigorous steps will soon be taken in these directions.

The credit for the success of the Education Week is due to Mr. Ziauddin Beg, General Secretary of the Association, Mr. Gulam Dastagir, Secretary of the Reception Committee and Miss Webster and Mr. Nazir Husain Sharif, President and Secretary of the Exhibition Committee, respectively.

Editorial.

Our First Education Week.

The Hyderabad Teachers' Association organised for the first time an Education Week on the occasion of its 10th Annual Conference in October, 1935. We have published elsewhere a full account of the various activities which were included in the programme. Her Highness Princess Durre Shevar, who, as is well-known, takes a keen interest in education, did the Association the honour of opening the Educational Exhibition, which from the point of view of the arrangements as well as of the quality of the exhibits was a greater success than any previous exhibition. There were, as usual, special classes for teachers. These as well as the lantern lecture by Mr. Weber and the Radio talks in Urdu and English by Mr. Mirza Mahmood Ali Beg and Rev. F. C. Philip, respectively, were greatly appreciated. No less interesting and instructive were the Welcome Address by Mr. Noorul Hasan and the lectures delivered at the Conference by Dr. Syed Yusuf Husain, Mrs. Engler, Nawab Mirza Yar Jung Bahadur, Capt. J. W. Petavel, Mr. Syed Mohamed, Mr. Doraiswamy, Dr. Hyder Ali Khan and Mr. Syed Mohamed Mehdi. The report on School Discipline prepared by a Committee appointed by the Teachers' Association after the last Conference evoked much lively discussion. The full text of this report will appear in our next issue. A pleasing feature of the Conference was that it was attended by an unusually large number of officers and teachers from the districts.

Mr. Qazi Mohamed Husain delivered a learned and thought-provoking Presidential Address. His views on child education, women's education, vocational education and university education were very refreshing. While discussing the question of unemployment among the educated classes, he said, " It should be the concern of a University

Mrs. Naidu, should not prevail in education, whether racial, ethnological, geographical or political, for it was the privilege of all to receive education. After the concluding remarks of Mr. Qazi Mohamed Husain, the Conference broke up with a vote of thanks proposed by Mr. Syed Ali Akbar, the President of the Hyderabad Teachers' Association, and the calling of three cheers for H. E. H. Nizam, the Educational Member and the President of the Conference. A "Social" then brought the busy educational week to a successful close.

The Hyderabad Teachers' Association, during the decade that it has been in existence, has acquired a status which no other organisation of a similar nature within the Dominions can claim to enjoy. This it has been able to achieve through the untiring efforts of its able President and founder M. Syed Ali Akbar, who from its inception has given his devoted care to make it as highly useful to the teachers as possible. The Teachers' Club, a social centre for the teachers in Hyderabad, "The Hyderabad Teacher", the quarterly organ of the Association, the annual conferences, the valuable reports prepared annually on important educational subjects and, last but not least, the monthly meetings held at various schools affiliated to the Association where discussions on current educational problems are carried on, are all proofs, if proofs were needed, of the invaluable services which the Association has been rendering to the teachers under its jurisdiction. It cannot be denied that the Association has influenced the other Subas of the Dominions to emulate its example, where for a few years past similar kinds of activities on a small scale have been noticeable. That this is all to the good no one can dispute, but what is needed is that all such efforts should be co-ordinated by making the Hyderabad Teachers' Association the nucleus, for which it is admirably fitted, for an All—Hyderabad Teachers' Association, constituent Associations working as the Irish say, "separately together" for the good of the whole.

able to increase her prosperity and had come to occupy a proud position in the comity of nations.

Two items of outstanding merit need special mention. One was an important speech by Nawab Mahdi Yar Jung Bahadur, the Educational Member, and the other was the soul-stirring message to teachers which was given by Mrs. Sarojini Naidu. Nawab Mahdi Yar Jung Bahadur who was to have opened the Conference was prevented from doing so owing to his absence from Hyderabad Deccan. He, however, returned to the headquarters in time for the concluding session and made an important speech, which was in fact an indication of the educational policy of the Government, particularly towards the vexed question of compulsory Primary education. That the Educational Member should have chosen this occasion to express his considered views on a subject which is being widely discussed by the public at present, shows the importance of the annual conference of the Hyderabad Teachers' Association. After having expressed his appreciation of the exhibition and his satisfaction at the progress of the Association, the Educational Member dwelt at some length on the question of compulsory primary education. He declared that the Government were in perfect sympathy with the demand of the public, but as the question involved certain administrative difficulties, the best way of introducing compulsion would be by a gradual process. Even more urgent than compulsory primary education was the problem of women's education, declared the Minister, for, if women were not educated properly, the progress of a nation would be blocked.

Mrs. Sarojini Naidu who was present on the dais was then requested to speak. The teachers, she said, should remember that they were engaged in the sacred task of creating the hope of tomorrow. No one belonging to this great profession could think of education in terms of silver and gold. Barriers and narrowness of vision, said

which showed that 2070 articles from 71 schools in Hyderabad and Secunderabad had been received and that 67 prizes were to be awarded. Mrs. Qazi Mohamed Husain was then requested to give away the prizes. The success of the exhibition was due to the indefatigable efforts of Miss Webster and her colleagues, especially Mr. Nazir Husain Sharif, the Secretary of the Exhibition Committee. A number of interesting lectures had been arranged for the final session. These were:—

(1) "The Importance of Urdu in our Curriculum" by Mr. Syed Mohammad, M. A.

(2) "A Few Suggestions for the Teaching of English" by Mr. M. S. Doraiswamy, M. A., L. T.

(3) "The Teacher and Diagnosis of Diseases common to Children" by Dr. Hyder Ali Khan, F. R. C. S.

(4) "Impressions of Japan" by Syed Mohamed Mehdi, Secretary, State Executive Council.

Mr. Syed Ahmed in his lecture stressed the need for paying more attention to Urdu, as it was a compulsory subject in the curriculum. He regretted that English should still occupy a far greater portion of the time and energy of our students than it was entitled to.

Mr. Doraiswamy pointed out how a judicious combination of the translation method with the direct method could result in producing efficiency in the teaching of English.

Dr. Hyder Ali Khan showed how a knowledge of the diseases commonly found among children would help to raise the standard of health in our schools.

Mr. Syed Mohammad Mehdi's lecture, in which he gave his impressions of his recent visit to Japan, was intensely interesting. Some of the statistics which he quoted in regard to the nation-building departments of Japan were revealing. He made it abundantly clear that it was through an extremely liberal educational policy that Japan had been

Teaching of Science in Middle Schools" by Dr. D. D. Shendarkar, Ph. D. (London), on "School Gardening" by Mr. Jag Mohan Lal, B. Sc., L. T., and on "The Teaching of Qirat" by Qari Roshan Ali Sahib. These talks were based on the demonstration lessons given by the above-named gentlemen in the earlier part of the Education Week, and helped the lecturers to elucidate the principles underlying those lessons. It would have been desirable if these talks had been arranged immediately after the end of each lesson; such a procedure would not only have been logical but would have induced the teachers, with the lessons fresh in their minds, to take a keener interest in the discussions that followed.

There was lastly a special class on the "Teaching of Geography in High Schools" with a demonstration lesson conducted by Mr. Syed Ahmed, M. A. (Edin). Geography in our curriculum is not invested with that importance which it deserves. Consequently, its teaching is confined to a bald statement of facts which do not as a rule stimulate thought and imagination in the child. Therefore, the demonstration lesson on the teaching of geography was opportune, and it proved to be highly instructive.

Before the close of the morning session, a sectional meeting was held under the chairmanship of Mr. Syed Mohamed Husain Jaferi, B. A. (Oxon), Deputy Director of Public Instruction, to consider the report on 'Discipline' prepared by the sub-Committee appointed last year. The business of the meeting was conducted in English, the report having already been considered at a sectional meeting in Urdu held on the previous day. After some discussion, the report was adopted with the amendments made at the Urdu sectional meeting.

The afternoon session was held with Mr. Qazi Mohamed Husain, the President, in the Chair. Miss Webster, the President of the Exhibition Committee, presented her report

The sectional meeting on Discipline met under the chairmanship of Mr. Sajjad Mirza, M. A. (Cantab), Principal, Teachers' Training College. The report which was submitted in Urdu evoked some keen discussion among the members and the Chairman in his concluding remarks made some pertinent observations in regard to the question of discipline. In the first place the Chairman recommended that the term 'Discipline' should be retained in its original form in English and not translated into Urdu, for the vernacular equivalent did not convey the full connotation of the word. The real difficulty was that discipline was considered to be antagonistic to individual freedom, collective living, progress and traditions. This the Chairman remarked was a wrong assumption, because all these ideas were not only inter-related but were concomitant with discipline, a fact which teachers should constantly bear in mind. Religion was another factor, he said, that had to be reckoned with. While the observance of religious laws could be seen manifesting itself in the highest form of discipline at religious meetings, the same could not be said of a secular gathering where very often man-made laws failed to secure even the semblance of discipline. This in the opinion of the Chairman was due to an attitude of mind that made a distinction between laws of divine sanction and those that were enacted by human agency. What was necessary was that the same reverence for human laws should be instilled into the minds of the people as was entertained for religious laws, and it would be then and then only that discipline in secular affairs could be secured. After the Chairman's remarks the report was adopted with some modifications and the meeting came to a close.

The morning session on Saturday, 17th October, was devoted to special classes for teachers comprising talks to teachers on "The Teaching of English" by Mr. K. Yusufuddin, M. A. (Leeds), on "Nature Study in Primary Schools" by Mr. A. Durrani, M. Sc., Dip. Ed., on "The

After the conclusion of the Presidential address, Dr. Yusuf Husain Khan, D. Litt. (Paris), gave an interesting talk on "The Teaching of Indian History in Indian Schools". He was followed by Mrs. M. Engler, M. A., L. T., Retired Chief Inspectress of Girls' Schools, who read a thoughtful paper on 'Women's Education in India". Captain J. W. Petavel, R. E. (retired), late Principal of the Kassimbazar Polytechnical Institute, Calcutta, then read a paper on "The Coming Revolution in Education". His thoughts are weighty enough to be read and scrutinised carefully, especially because Hyderabad is on the eve of forging ahead with its reorganisation scheme of education recently sanctioned by the Government.

The afternoon session commenced with a talk on Temperance by Nawab Mirza Yar Jung Bahadur, the Chief Justice of Hyderabad, and the President of the Central Temperance Committee appointed by Government. The Chief Justice eloquently put forward the plea that it was the duty of teachers to do all that lay in their power to help forward the Temperance movement in the State "No drink and not moderation" said the speaker was to be the slogan which the teachers should spread and popularise among the rural population of the State where the drink habit was rampant. After the lecture on Temperance, two sectional meetings were held one on "Discipline" and the other on "Extra-curricular Activities". The sectional meeting on Extra-curricular Activities met with Rev. F. C. Philip in the Chair. Mr. Chandawarkar, the Secretary of the Extra-curricular Activities Bureau, read his report which showed that so far the Bureau had limited its activities to collecting information from the various schools at the headquarters. During the discussion which followed, it was suggested that the Bureau should use its influence to secure special concessions from the Railway authorities for teachers taking part in school excursions. Rev. F. C. Philip, Chairman of the Bureau, promised to do his best in the matter.

After the usual prayers in Arabic and Sanskrit, Mr. Nurul Hasan, B. A., Dip. Ed., (Glas), the Chairman of the Reception Committee, read his Welcome Address. He was followed by Mr. Ziauddin Beg, B. A., B. T, Honorary General Secretary of the Hyderabad Teachers' Association, who surveyed in his report the steady progress which the Association had made during the previous year. Two notable developments, the Secretary pointed out, had been the establishment of a Teachers' Club and the founding of a Bureau of Extra-curricular Activities. After the General Secretary's report and the adoption of condolence resolutions in connection with the deaths of Mr. Marmaduke Pickthall, retired Principal of the Chaderghat High School, and of Dr. A. H. Mackenzie, formerly Pro-Vice-Chancellor of Osmania University, the President, amid much clapping, rose to deliver his presidential address. The address was a significant one, as it contained within its purview a variety of educational problems like the nursery schools, primary and the post-primary education, the education of women, university education and the polytechnic institutes. With each of these he dealt at some length, outlining its purpose and importance and indicating the need for readjustment and reorganisation of the various types of education, so that they might be brought in harmony with modern requirements. The President particularly stressed the need for the introduction of vocational and technical courses. That in his opinion was the type of education which built up the prosperity of a country. He gave the example of the polytechnic schools of London and pointed out that the network of these schools was to a great extent responsible for the industrial and commercial greatness of the English nation. The President concluded his address with an account of the beneficial effects of the use of Urdu as the medium of instruction in Osmania University.

Hyderabad Teachers' Association. Mr. Ali Akbar placed before the teachers some practical problems pertaining to teaching in a lucid manner that made a deep impression upon all those who had the privilege to listen to him.

The Educational Exhibition was the next important feature of the Education Week. This year's exhibition both from the point of view of exhibits and the thoroughness with which these were planned and arranged, was better than the previous ones. The importance of the exhibition was greatly enhanced by the fact that Her Highness the Princess of Berar did the signal honour of performing the opening ceremony. Her Highness' gracious presence on the opening day was of great stimulus to the workers and organisers of the exhibition, who spared no pains in making it worthy of the great occasion. The Mushaira, the Scout rally, talks on educational topics of interest and, last but not least, a delightful dinner at the All Saints' Institute followed by an interesting magic performance given by the Headmaster of the Bolarum High School, brought the first part of the programme of the Education Week to a successful termination.

The second part of the Education Week commenced with the plenary session of the Conference which was held on Friday the 16th October, 1936, in the City College Hall under the presidency of Mr. Qazi Mohamed Husain, Pro-Vice-Chancellor of the Osmania University. The Hyderabad Teachers' Association has always been fortunate in securing some distinguished local educationist to preside over its annual gatherings, but in view of the importance that it has now assumed it is desirable that educationists of eminence from outside Hyderabad may occasionally be invited to guide the deliberations of the Conference. However, for this year's Conference, a better choice could not have been made; Mr Qazi Mohamed Husain filled the chair with that dignity and ability which was only to be expected from a person of his experience and erudition.

High School on "The Rivalry Impulse and its Guidance into Constructive Channels" under the chairmanship of Mr. S. M. Hadi, M. A. (Cantab), Director of Physical Education for Schools and Organising Commissioner for Boy Scouts. Mr. Weber had taken enormous pains in collecting pictures illustrative of the part played by the rivalry impulse into different branches of human activities, and his lecture which stressed the need for directing the rivalry impulse into proper channels made a great impression on the minds of the hearers. In his concluding remarks Mr. S. M. Hadi agreed with Mr. Weber's views, adding that but for the lack of the team-spirit, the Indian Cricket team which had recently toured in England would have had a much better record to show.

A Radio talk in English on "Some Modern Tendencies in Education" was given by Rev. F. C. Philip, M. A., Vice-President of the Hyderabad Teachers' Association, on Wednesday, the 14th October, 1936. Mr. Philip described the experiments in self-government in schools which were being carried out in Australia and also showed how attempts were being made in that country to bring school work into harmony with life.

On the following day demonstration lessons were given by some of the members of the Training College and by some experienced teachers of others institutions on English, Mathematics, Science, Nature Study, Kindergarten and Qirat. At the end of each lesson teachers were given an opportunity to ask the demonstrators any question they liked in regard to the procedure they had adopted. Such free and friendly exchange of views was of immense value to many of us as it led to the clarification of many points in the teaching process which some of us overlook or attend to half-heartedly while we are in the class room.

After these discussions came the illuminating talk on "Some defects in teaching and how to remedy them" by Mr. Syed Ali Akbar, M. A. (Cantab), the President of the

The Tenth Hyderabad Teachers' Conference.

BY

Salim Bin Syeed, B. A. (Hons.), M. Ed. (Leeds)

The Hyderabad Teachers' Association had drawn up an elaborate but an interesting programme for this year's Conference. The programme was in some respects a distinct improvement on those of the previous ones. The celebration of the Education Week, for instance, was a happy innovation, as it provided for the teachers social and educational opportunities which a usual two days' programme can hardly be expected to do. Besides, as the programme spread over a whole week, the plenary sessions could be devoted without any pressure to the more conventional part of the Conference work

The Education Week commenced on the 10th October, 1936, with a Kindergarten demonstration at St. George's Preparatory School conducted by Miss Webster, Headmistress of the school. The lesson, which was of immense practical value, was attended by 80 teachers from different schools. In the evening there was the annual Scout Day Rally organised by the Hyderabad Boy Scout Association. This was followed by a Radio talk in Urdu from the State Broadcasting Station on "Co-operation between School and Parents" * given by Mr Mirza Mahmood Ali Beg, B. A., B. T, Principal, Darul Uloom High School. This talk was a direct appeal to both fathers and mothers to take a more active interest in the education of their children. Mr. Mahmood Ali Beg pointed out the various ways in which the parents could help the schools.

On Monday, 14th October, Mr. F. Weber, B. P. F. Principal, Government College of Physical Education, gave a most interesting lantern lecture* at the Methodist Boys'

* The full text of this lecture will appear in our next issue.

compulsory education will realise the practical difficulties in the way of its introduction. There are facilities yet to be provided for those who now willingly go to school. Nevertheless, the question of compulsory primary education is receiving the consideration of Government. If there is any opposition to this idea, it is not because of lack of sympathy with it but on grounds of administrative and practical difficulties.

The second important question is that of women's education. Women's education is backward in the State and calls for special attention. The progress of a nation is seriously blocked if its women are not educated. Intellectually, girls are in no way inferior to boys. Recently, some girls have not only passed in the public examinations with distinction, but have even beaten the boys. The desire for education on the part of our women is a happy augury for the future of the State. It shows that the nation is not dead but is about to enter on a new life. When women become good mothers after receiving education, the next generation will be better educated than the present one.

Mere literary education is not sufficient for the progress of a country. H. E. H. the Nizam's Government has therefore been considering the question of vocational education. It has sanctioned a scheme which will soon be published. It aims at diverting to vocational education boys who have no aptitude for higher literary education. This scheme, after it is put into operation, will have a good effect on the prosperity of the State.

The teachers should not look down on their profession. They should endeavour to acquire the utmost skill in teaching. The teaching profession is a nation-building profession. In the course of my tours of inspection, I have often found defects in teaching. It is necessary to reorganise and improve our Normal Schools.

SPEECH

BY

Nawab Mahdi Yar Jung Bahadur, M. A. (Oxon.)

The Hon'ble Political and Educational Member.

(Translated from Urdu)

Under the rules of the Hyderabad Teachers' Association, the President of the Conference delivers his Presidential Address in English. I was President last year, so I delivered my Address in English. This year I am free, so I speak in Urdu. The 10th Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association is terminating with great success. The Teachers' Association is a very useful institution, and it is gratifying to note that its sphere of activities is widening every year. The Exhibition which I visited this morning was a distinct improvement on the exhibition held last year.

The Conference is fortunate to have as its President Mr. Qazi Mohamed Husain who takes a keen interest in education. In spite of his heavy administrative duties, he has been able to introduce new activities in the University which bear testimony to his untiring work, sincerity and zeal.

The most important thing which the country needs is primary education. Unless primary education is imparted widely on a sound basis, the educational system will be just like a building which has a weak foundation. Having regard to the population of our State, the number of pupils under instruction is not at all adequate. The reproach that there is widespread illiteracy in this State must be removed by adopting effective measures for the expansion of primary education. The introduction of Compulsory Primary Education has been proposed as a remedy. Government is not against this proposal, but it is not possible to introduce compulsory education at once. If an Act introducing Compulsory Primary Education were passed, it would not be possible to supply the necessary number of teachers and buildings all at once. I hope that the advocates of

their example. The Dutch, The French and the English entered the field in right earnest. This synchronized with the general break-up of the Mughal Empire. As an English writer has put it, "the carcase was in a condition to invite the eagles". The wretched people of our country were tossed to and fro in the political storms which followed. They were ready to cling to any power that gave them protection. It is by giving that protection that the British succeeded in establishing their Empire in this country. Again, it was the superiority of technique and organisation that produced order out of chaos. Their early attempts at shaking the pagoda tree were made in a ruthless manner. But gradually a change was effected in the mode of administration which resulted in British consolidation in this country. The British have done much to shape the history of India. India has learnt much from them. But she has yet to realise the fulfilment of her destiny. No doubt, the teachers of history have an important role to play in the shaping of the future of our motherland. Apart from its disciplinary value, the moral purpose of history has a potent significance for the rising generation.

History should be taught with certain social ideals as its background. The past history of India has been a long-drawn effort to achieve unity in diversity. Our country has been the battleground of centripetal and centrifugal forces. These opposing forces have been the undoing of many a kingdom. The vehemence of these forces has not yet abated. If the people of this country have hearts disposed to become one people, no power on earth can keep them disunited. The teacher of history should be an optimist. He must inculcate in the minds of his students that a time will certainly come when sectarianism and local jealousies will have to go. We have still to go a long way on the part of self-fulfilment and self-realisation. The path is neither smooth nor safe. Still it has to be trodden.

It should also be explained to the students that every age has its own technique. If any nation lags behind in adopting it, it has to go under. In medieval times, India failed to adapt herself to the standards of that age. Consequently, the Muslims extended their dominion over the whole of the country and gave it political unity, law and order. The muslim rulers lost their vitality in course of time, clearing the way for a more robust and fresher people to rule this country. The siege of Goa should have been an eye-opener for Muslim India. The combined forces of the Bijapur and the Ahmednagar kingdoms failed to defeat the Portuguese garrison of 2000 men which withstood them for ten months and finally compelled them to retreat. During Akbar's rule the Portuguese controlled the water-routes, claiming certain routes to be the monopoly of the King of Portugal. They stopped Indian ships from going to China and Arabia without a permit from them. Akbar as well as his descendants failed to realise the importance of the new technique which was destined to create a new world. The success of the Portuguese in establishing commerce with India, which gave them large profits, created a desire among other European nations to follow

Synopsis

OF

The Lecture on the Teaching of Indian History in Indian Schools

BY

Dr. Yusuf Hussain Khan, D. Litt. (Paris).

There has been a considerable amount of discussion as to whether history is a science or an art. History is concerned with the doings of man, a capricious being, having a will of his own. Although it cannot be denied that reason is warranted in seeking causation in history as in nature, yet in the sphere of mental and social life causation is different from what it is among measurable and sensible objects. Human society is complicated because its units are intelligent agents. This does not mean that history has no laws. In fact its laws are just as effective and immutable as those of the physical sciences.

Croce, the great Italian philosopher and historian, is right when he says that all history is in fact the history of the present. It is the present which the historian makes live in the past. A historian, however dispassionate he might be, cannot help intruding his own personality and the way of thinking of his own age in his works. An honest expression of opinion is scarcely a fault in a historian or a teacher of history, provided there is no wilful distortion of facts to suit his opinions. Sometimes a sense of lofty impartiality results in a total abstention from moral judgment. All human activities are either good or bad. There is no reason why the teacher of history should abstain from passing judgment on events and persons with fearless honesty. It is only the moral element in history which imparts significance to facts and events, while the mere narration of such facts and events will be absolutely insipid and without meaning.

Whether a girl belongs to the leisured or the poor class, she must prove a blessing to all with whom she comes into contact. But the mind works in a body, and the care of the body should therefore, receive due consideration in the development of the mind. Growing girls in school require proper accommodation and sanitation, proper light and ventilation, proper seats and desks, so that they may be saved from weak eyes, curvature of the spine, deformed chests and several other maladies.

They also require systematic, suitable physical exercise under the guidance and supervision of a trained physical instructress, who should be chosen as carefully as are the teachers who are expected to develop the mind.

And they require medical inspection with suitable clinics so that diseases may be detected early, and properly controlled.

So fortified, these mothers of a future generation will have the advantage of a better physique in themselves and their offspring and be able to keep at bay that terrible scourge—T. B.

And since we are aiming at an all-round development, let us not forget the moral and spiritual side of our nature, and the building up of character in the plastic material that has been entrusted to our care. But character was never built by precept alone. Without the force of example, all moral instruction is valueless. So let us choose our teachers wisely and well, that they may show in their lives, the union of practice with precept and bear aloft the torch not only of knowledge, but towering far above it, the torch of moral rectitude as well.

work. And along with needlework, Home Science should be taught as a compulsory subject, so that every girl, on leaving school, may be able to make her home, however poor, clean and attractive, to work on right lines for her dear ones, in sickness and in health, and to bring up her children in the way they should go.

The vast majority of our poor being drawn from the villages, we have to give careful consideration to rural reconstruction in dealing with the education of the masses. If the villagers are to be reached satisfactorily, they must be reached by non-urban agencies and by special methods.

The farming occupation should be made central in all schemes involving the masses. Diseases and pests affecting crops and live stock are a serious menace to agricultural success, and can be controlled and overcome only when science takes the place of tradition and superstition.

Soil fertility is the most precious deposit of material wealth on our planet, and we must conserve the strength of the soil for the farmer, who fulfils the function of food supplier.

In rural areas, girls should be trained for their future employment, both theoretically and practically. There should be residential schools for this training, and these schools should be located in rural areas.

In the working of these areas, excursions, exhibitions, model farms and small model competitive fields, with careful educational preparation, should hold a prominent place. Here too, as in urban areas, suitable libraries for the need of the agriculturist, are necessary.

For girls of the leisured class, I would stress the importance of Home Science, Needlework and Art, and the necessity of making instruction in these subjects as practical as possible, so that they may not fall behind their poorer sisters in the ability to make their homes beautiful.

If the boys fare badly in such pitiful circumstances, surely the girls fare worse, for the training of centuries has deeply ingrained in the Indian girl the duty of self-sacrifice for the greater good of others, particularly of their men-folk, and if the little daughter's capacity for assisting in the earning of the family income is reduced because of the education to which she is compelled, her physical wants will undoubtedly be still more scantily supplied, and that at a time when the body needs greater nourishment and greater care, in order that it may develop as it should.

I know a poor school in Madras which provides a hot meal for its pupils, and it is probably far from being the only one. In this school, the children are given a midday meal—of coarse rice with dal or vegetables, and to this they look forward as a great repast, since it is the one square meal they partake of in 24 hours. To this school, there is never any need to compel attendance, and holidays given by it are not welcomed.

Poor schools would necessarily be of the elementary grade, teaching not higher than the 7th Standard, since the pupils attending them, even if able, at times, to continue longer in them than compulsion requires, because of scholarships or outside assistance, would still have to start early in life earning a livelihood, and would not be in a position to indulge in the luxury of higher studies. Consequently, such schools should have a vocational bias, so as to place in the hands of girls, on leaving it, the wherewithal for supplementing the meagre income of the family.

Since Algebra and Geometry would serve no useful purpose for these girls, in their place, there should be a further development of needlework, both plain and fancy, with particular attention to the neat mending of garments; for quite a decent wage can be earned by the poor girl, by taking to mending; nor need she leave her home to do the

from the life work of one noble woman who, actuated by a lofty ideal, carried that ideal to its realisation, in spite of cruel opprobrium and endless opposition. So it is with every great endeavour, a small beginning, and continuous effort, followed by a grand consummation.

JUVENILE EDUCATION.

With the Juvenile section, we have to consider the question of compulsory education, and the great problem that faces us is whether, in view of the extreme poverty of the masses, we are justified in compelling the indigent to do without the addition made to their scanty income by their children, in order that elementary education may be imparted to them. Educationists who have pondered deeply over the subject are divided on the point, several advocating free education rather than compulsory, at this stage.

It appears to me that if compulsory education is introduced for the masses, such schools should work in two batches, one batch of children attending school in the forenoon, the other in the afternoon. Humanity requires that poor children should not be compelled to attend school for more than half a day, so that the income of the family may not be materially affected, and humanity also requires that these children should be furnished in school with one hot meal daily, and with free gifts of books and other accessories.

We who talk so glibly of a sound mind in a sound body—do we ever stop to consider what it must mean for these underfed little ones to trudge to school on next to no meal, and to strive to imbibe knowledge when the whole system is crying out for physical food? How can we, we who are well fed and well clad, how can we expect them to do so?

The school library could also be utilised by these adults, both the reference and lending libraries, access being given to them at a time when the school classes will not be disturbed.

It may be said that few women would take advantage of the opportunity offered them. In the beginning, there may be only one or two in attendance, but I would merely point to the numbers in the Girls' High School, Sultan Bazars, in which married women are endeavouring to quench their thirst for knowledge, to assure you, that in an attractive environment, the numbers would soon develop to very encouraging proportions.

This is but a rough sketch of the curriculum that may be considered in the initial stages. As the work progresses, the needs of these adults will be better realised, and the adoption of a curriculum to meet their needs, with special provision for this new curriculum, will be facilitated.

When in service, I founded a mutual help society at Warangal, where women interested in self-improvement met on Friday afternoons, and assisted each other in acquiring knowledge, by interchanging their little best with one another, the whole scheme being under the guidance of some of my senior teachers. The women who joined the Society thus acquired not only knowledge of cookery and fancy work, not only knowledge of singing and painting, but what was of far greater importance, the spirit of sympathy, and of self-help, and a wider outlook on life.

The society worked for some years, and in it, Mohammedans, Hindus, Christians, and Parsis met as sisters and their mutual service helped to bind them together in such golden ties of wifehood and motherhood as could not be easily broken.

We who to-day witness the magnitude of the nursing sisterhood and the innumerable lives that proper nursing is helping to save, can scarcely realise that it has developed

If each Educational Office were supplied with a small cinema and with different sets of suitable films, and arrangements were made with other educational centres for the loan or temporary exchange of more films, and if the radio were utilised for the broadcasting of suitable talks, how much colour would they not be the means of bringing into the lives of our poor, ignorant, hardworked women? The subjects may, among others, comprise Hygiene, Child Welfare, First Aid, Simple Home Remedies, How to deal with epidemics, Agriculture and Rural Reconstruction.

With the further education of the adult who has had some foundation laid in her early days, and who has a desire for mental development, there would be in addition to the Cinema and Radio, systematic instruction in suitable subjects.

In this scheme of studies, special stress must be laid on such subjects as would help to make for better wifehood and better motherhood, such subjects as would make for the greater comfort, the greater beauty, the greater sanctity of the home. It would include Child Psychology, First Aid and Home Nursing, Food Values, Invalid Cookery, Needlework and Art. The reading of newspapers, and intelligent discussion of the topics dealt with therein should form an important branch of this training.

Provision for this instruction could be made in Government and aided Middle and High Schools. Even if one afternoon in the week is allotted for this work, and timetables are framed in accordance with this provision, and if suitable teachers are appointed, much will be achieved. And the school classes, far from suffering through the absence of their teacher, will gain by it, by being thrown on their own resources, and by learning to seek knowledge independently of their teacher, who would furnish the necessary guidance preparatory to leaving her class.

Women s Education

BY

Mrs. M. ENGLER, M. A., L. T.,
Retired Chief Inspectress of Schools.

The question of Women's Education includes two problems—Adult Education and Juvenile Education.

ADULT EDUCATION.

To the vast majority of adults, we are not, at present, able to give literacy, chiefly because of economic considerations, and also because of all absence, on their part, of any desire for this attainment. But we can aim at developing their minds to some extent, and for this purpose, we have two potent factors in the Cinema and the Radio. In the hands of sympathetic and trained teachers, we can achieve much with these instruments, as they afford food for thought and conversation, and open up wonderful vistas in drab existences.

We know what a great part the eye plays in education. Educationists will impress upon you that one eye is equal to two ears, and we are aware that we remember what we see far better than what we merely hear. Hence the great value of the cinema in teaching, more particularly in the mental development of the illiterate.

The radio takes the second place only to the cinema; for though it does not appeal to that great channel, the eye, in the acquirement of knowledge, though it has its drawbacks in atmospherics, the fact remains that, wisely directed, it is no mean aid in Adult Education. Even the appeal to the eye can be effected by charts, sketches, and pictures, which could be used by the listener as well as by the speaker before the microphone, and which could be made by the Drawing teachers attached to schools. This method has been adopted in Austria with great success, and has proved of immense value in Adult Education.

get to work practically. We must study the best ways of beginning where conditions are most favourable and go on from stage to stage. The beginnings we might make in the Indian rural districts are of extraordinary interest and hopefulness. If we apply ourselves to that great work of love it will begin at once to cast out one fear that haunts us now by providing at once abundant employment for the educated classes. That was late Sir Asutosh Mookerjee's great message.

With the splendid philanthropic forces you have in Hyderabad you might also get to work at once and make your city give the whole world an example of how town children could be brought up in "educational co operative colonies" that they would go to in the morning and remain till the next evening—in some cases longer—bringing home useful products. This is possible now because we know now how we might make them earn very well in such "educative employment", paid not in money, but in a variety of useful products. To get people to study all these possibilities of infinite hopefulness, Sir Asutosh Mookerjee launched Calcutta university, of which he was Vice Chancellor, on to a propaganda which was written about as being "perhaps without a parallel in the annals of any learned body". As you see by my being here the appeal has not been in vain. Though the world is slow to grasp the posssibility of such stupendous changes, your enlightened rulers are taking the trouble to consider it in its numerous hopeful aspects. I may, therefore, confidently appeal to you to study it thoroughly in its educational aspect, and commend also to your attention the fact that it promises to improve the prospects of teachers beyond anything dreamed of yet.

The real question is how we are now to bring about the great advance in co-operation we should need. The co-operative movement is no new thing. Indeed it is one of the world's greatest and most wonderful movements. It is of Himalayan dimensions. But it has attained its huge size and there it seems to remain like the mountains themselves. What great earthquake can we hope for to make this mountain grow taller? To most people it seems hopeless, thus also that many have turned to socialism.

But the educationist must bring about the required earthquake. There is every reason, economic and educational, to form the young into a great co-operative organisation. Our President in his address has emphasised the reasons over and over again. Progress in labour saving and labour simplifying methods has made it practically possible and the whole juvenile population might give the required great impetus to co-operation.

Co-operation means instead of hatred, strife and chaos, good-will, mutual help and order.

As soon as one country had a great co-operative productive system all would soon have them. Co-operative systems do not compete with each other They have something better to do. They co-operate mutually. Therefore international co-operation would dawn by the side of rivalries. With a great co-operative system there would be no savage strife of competition. There would always be the co-operative organisation to fall back upon and international exchanges. There would be no unemployment. People who failed in competition would get on their legs in the co-operative system and then make another try. All our present reasons for fear would vanish.

But, again, to establish it must be a great labour of love. The immense good "educative employment" might do for the young must make us get enthusiastically to work and begin with the young. What we have to do is to

produce; consequently we have with our great power not abundance for all as we should have but glutted markets; "overproduction" and cutthroat competition, poverty to most instead of abundance for all; and we have not adjusted things to distribute the leisure that labour-saving machinery wins for us—we cannot well till the other adjustment is made; consequently we have unemployment for some instead of abundant leisure for all. Lack of necessary adjustments is turning every potential good into its exact opposite and cutthroat competition is making mutually competing nations enemies.

But now, coming back to our subject, thoughtful reformers all recognise that co-operation would be the hopeful solution for our problems if we could get it to the necessary state of development, *and now the hope arises of a great co-operative organization of the young to bring that to realization.* Indeed another of the most wonderful studies is that of the perfect and complete ways in which an individualistic system and a co-operative one existing side by side would tend to correct each other's fault, and complete each other, and cause necessary adjustments to take place automatically. We have to understand therefore that socialism, which would make co-operation compulsory for all, is wrong in principle. It is consequently held in check and we have little to hope from it. We must realise that it is the result of taking a too materialistic view of the problem. The socialist looks to the fact that the land and capital are in the hands of privileged classes. He says that the rich therefore would benefit if we made the necessary adjustments and increased production by co-operation. There is no doubt truth in what he says, but if we look less to matter and more to power, we see that we have now such immense potential productive power that co-operation might improve the condition of the masses quite rapidly, indeed as fast as could be really good for them. Sanity therefore demands that we should at least try voluntary co-operation first.

We are living in an age of fears and misgivings, more conspicuously than of love. Educationists have misgivings as to whether our whole education system is not wrong, and will not lead those it trains into the ranks of the unemployed or the unsatisfactorily employed. We can hardly take up a daily paper nowadays without reading of some sweeping condemnation of the whole system. But worse still are our fears that our social system is incapable of adjusting itself to the modern headlong speed of progress of methods of saving labour and displacing labour so, that more is needed than education reform. We read of ten million unemployed in the United States, despite talk of trade recovery, and of unemployment increasing again in other countries. With these fears we have the fear of trade rivalries, the strugle for means of subsistence plunging us into a war more calamitous than any the world has yet seen. Socialism is offered to us as the remedy. Instead, however, of giving us hope it arouses in most people's minds more fears, fears of civil war, revolutions, terrorism.

I am digressing now you will perhaps say, and with commonplaces after all; the connection of all that with education you may think is not direct enough to justify my bringing the subject on to your platform. I would answer then by saying that in the whole domain of sociology there is nothing more wonderfully interesting than the absolutely direct *connection of all this with our education problem*, because the co-operative organisation of the young will be the most hopeful foundation for a co-operative organisation that might solve our greatest economic problems. I therefore beg for patience for what might otherwise seem to be a little more digression.

First, then, the root of all our troubles both international and social, is well recognised to be economic. It is also very simple. We have not adjusted our social system to our technical progress to make it capable of distributing what our enormously increased productive power can

system, for its young workers their teachers; and when necessary their parents. Now as every educationist will realise, this possibility will revolutionise education not for the poor only, but for all classes. The "educative employment" it will enable us to give, by the side of schooling, will be of the very greatest benefit to all, and it will begin, in suitable forms, from the day of joining school.

We can have at last the education system every true educationist from Plato down to our present day has advocated and longed for. Children might divide their whole day between really good practical work, the best games and sports—because all will then earn right to them by their work—class work in moderation—because there will be no hurry about getting school days over as the young will be in good "educative employment". Their day will be spent in enthusiastic activity—for variety is life to the young—and as all educationists know to keep the young enthusiastically active means, in a word, everything that is good for disposition, character, development, health and strength.

But the organisation to carry out the plan fully will have to be built up. School industries will not take us far; there will have to be co-operation with private enterprise. That will have to be obtained and suitably organised. Many minds will have to be applied to the problem. It will be a great constructive work, a great labour of love, to do the young absolutely inestimable good. The most natural affection of every creature, love for its young, will lead people to study how this magnificent hope for the young and for the future of the race is to the best realised, now progress has made it possible.

I shall not say more about details. Sir Akbar Hydari has invited me to Hyderabad to make some suggestions. My various notes are now in the Government Press and will be ready soon. I shall go on to an aspect of the question that must make its appeal to everyone nowadays.

The Coming Revolution in Education[1]

BY

Captain J. W. PETAVEL,

(Late Lecturer on the Poverty Problem, Calcutta University, & Principal Maharajah Kasimbazaar's Polytechnic Institute).

The consideration of the economic developments that will infallibly revolutionise our education system takes us into the domain of cold economic facts, nevertheless I will begin by quoting the words, "Love casteth out fear" for they have a most wonderful bearing on the subject. The economic forces are being held in check by the power of human inertia but the reactions there will be between love and fear well hasten the great and beneficent change that must come. That is what I want to call your attention to specially.

Now what is the coming change? It is very simple, like many things that are of the most vital importance. Owing to our wonderful progress in labour saving and labour simplifying methods, we might now give all children everything that is necessary to help them to grow up healthy, strong and efficient, and they would be able to pay for it all themselves by their well organised labour during adolescence, producing necessaries, not for sale, but for the education system, and for their homes when their parents were poor and they had to contribute to their homes. The changes this will involve will be nothing short of staggering. We must face them now and all they imply.

To cut a long and wonderfully interesting story short, we could now have a great co-operative productive organisation, of which the well-trained adolescents would be the backbone, producing, as we might say on the socialistic

1. A paper read at the Tenth Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association on 16th October, 1936.

the enlightened goodness and endless force of finance, the noble influence and wisdom of the highest educational authority—are all subordinated to the worship of the noblest ideals of true knowledge and culture; and above all where good-will dwells in the hearts of mankind, without which learning and progress are utterly impossible. This land is Hyderabad, where the beauty and glory of the Renaissance is setting in. An unknown man, whose heart throbs only for the good of things, stands on the soil of this land and prophesies that if good-will subsists in the hearts of this territory and the present conditions prevail, "Hyderabad! The leadership of the human race is writ large in thy destiny."

In the end, it is as if my very being breathes a prayer for the Sovereign Master of this soil whose bounty and benevolence has enriched human hearts with the joys of life and culture. May this kingdom of truth, knowledge and good-will live long!

---

this planet, has not shown itself particularly to good advantage. The organised conquest of the helpless by the strong, the rooted jealousies and distrust of mankind of each other, the preparation of world conditions for the future programmes of destruction, the seeds of communal strife and bitterness to be found among the people of the same place--all these and legions of others, are stains on the soul of humanity, far too painful for any comment. The warped natures of the race, the misdirected ideals of mankind, the misapplication of the powers of Nature by man, are to a great extent responsible for the evil that exists The hope and promise of the future generations lie in the right training of the instinct and nature of man, that give the mandate for the perpetration of ugly deeds Once again we come back to the class room and the teacher. The belief of mankind in the role of education to mould human destiny will increase. The power and control of the educator over the character and nature of man will gradually establish its sway and the discords of the human heart will disappear under the benign influence of noble ideals in education.

I wish to add that there is a land in which the higher thought of Science and Art is being transferred into one of the vernaculars of this country, which phenomenon should give a glow of joy and pride to the heart of the true lover of this land ; where the youth of the race—the hopes of future humanity, instead of building programmes of force and destruction against all authority, are making contributions daily to the pages of art, life and literature and helping to raise the intellectual and general level of the place ; where the patronage of learning exists in a manner that it does nowhere else, having crossed the bounds of all climes and countries with its power of doing good ; where the tender benevolence of the highest administrative power,

is to a great extent responsible for the industrial and commercial greatness of the English nation. The general aim of polytechnic institutions is the promotion of industrial skills, general knowledge, health and well-being of young men and women belonging to comparatively poorer classes. The Regent Street Polytechnic sprang from the social ideals of Quintin Hogg, an old Etonian, who began classes for street urchins under the Adelphi arches by the side of the Thames. He believed that young people have four sides to their nature that require development—intellectual, physical, spiritual and social, and all the four sides are adequately represented in this polytechnic and on these lines an organised concentration of effort has been made for many forms of educational and social progress This polytechnic is perhaps the largest technical school in the British Empire. It has about 18,000 students and 8000 members. Its day departments provide full-time courses in architecture, surveying, building, art, chemistry, commerce, engineering, mathematics and physics, also in modern languages, photography, hairdressing, motor body building, motor and aerometal work and tailoring.

The evening departments hold 1000 classes weekly in more than 100 subjects embracing science, art, commerce, industrial administration, modern languages, literature, speech training, domestic and craft subject, etc.

The range of human activity is vast and varied. This activity begins at birth and lasts through life. The training of all types of activity and at all time of life is the purpose of education. The place of education in the destiny of the human race could thus be imagined. Mankind has a mission to fulfil in the complex of Creation, and its activity will realise itself only in so far as proper direction is given to it by the force of wisdom and knowledge. The part played by the human race, on

course, or in accordance with local requirements, technical subjects may be taught conjointly with the regular curriculum throughout the whole time. There are apprentices' schools classed under elementary schools, where courses of not less than six months and not more than four years are given in numerous arts, crafts and processes of an elementary nature. It is suggested that schemes for reconstruction should make adequate provision for elementary technical training at the earlier stages of the educational course. The reconstruction of the educational system of a country is a big issue. Before the Japanese people settled their system of education, a Commission of investigation was sent to Europe and America, and on their return an extensive scheme was drawn up on the lines of the French models, as the Commissioners thought that the system "was conspicuously complete and symmetrical." The educational system of Japan is instructive and interesting from several points of view. The announcement of policy was made in Japan at the time of the Restoration :

"Henceforward education shall be so diffused that there will not be a village with an ignorant family, nor a family with an ignorant member."

This policy has been given effect in such a way that in about 30 years' time illiteracy has disappeared from Japan. The number of candidates wishing to join the educational institutions is so much in excess of the accomodation available, that the entrance into practically all public schools or colleges from secondary schools upwards is a matter of competitive examination.

Polytechnic Institutions.

In order to build up the prosperity of a country, polytechnic type of education is highly suitable for the needs of a country. The network of London polytechnic schools is a marvellous and imposing organisation, which

interfered with. The thread of knowledge is a perfect "continuum" and any "partitions," needed for the facility of control, should not react on the continuity of its nature and content. The readjustment of the educational course, by the transfer of a year or two from one control to the other may accomplish much, but the chief merit of the reconstructiou schemes lies in the introduction of vocational and technical courses in the educational system of a particular place. This is the type of education that builds up the prosperity of a country. It is a question to be carefully considered at what stages and to what extent, the industrial and technical education should be included at the different stages of the educational system ; also as to whether the elements of such education should be introduced along with other formal studies in the syllabus at each stage, or institutions giving that training should be kept entirely distinct from other educational institutions. Also it is important to determine in relation with the needs and resources of a country, as to what types of courses (and in what industries) should be gradually started at a particular place. The scope of enquiry is comprehensive and it is generally felt that expert advice and the consulation of interests involved, on a wider basis, are necessary with a view to arrive at sound practical results. Japan is a country where great results in technical education have been achieved Even in the first six years' work of elementary schools, rudiments of technical work are included along with other literary subjects. A considerable number of elementary schools have sections where courses in agriculture, commerce and industry can be pursued. In the common middle school, training may be given for practical pursuits or for higher educational work. A period of five years is required to graduate at a common middle school. From the fourth year the student may take a special technical

been achieved. The welfare of the students demands a considered, constructive policy in this direction. "Old Boys" prove a bond of great strength to the Universities. The American Universities are very fortunate in this respect. The "Old Boys" have their associations, club houses, study groups and play a great part as intermediaries, interpreting the University to the world and the world to the University. "Old Boys" by their presence in under-graduate societies, bring a sense of reality to their proceedings which otherwise they often lack.

Reorganisation Schemes.

Schemes of reorganisation in India have been under consideration for some time. It is not meant to take them in review in detail. They propose to reorganise educational courses under the following stages :—

> Primary, Secondary (Vocational), Higher Secondary (Technical) and University (Bachelors Degree Course)

being designed with a definite objective, under a separate control. The need for such a division of courses seems well-based and imperative. Intelligent opinion should mature about the whole scheme and take bold initiative in the matter. Some observations could be made about the scheme.

The adjustment of years in the different stages should be made in such a way that the total academic period to the degree stage, does not increase. Educational effort should be so directed that standards of efficiency, higher than or equal to those that already exist, should be worked out in a lesser period of time Human life stands in need of strict economy and conservation. Also care should be exercised that in realising the different objectives at the different stages of the educational system, the continuity of knowledge is not

in research, and should have enough leisure to do so. They should have facilities for renewing their knowledge at other centres of learning after a period of 6 or 7 years. In fact the spirit of learning is a much better thing than the spirit of teaching. The dry distinction between the teachers and the taught should disappear and at the University there should be only junior and senior students, all of them step deep in the wealth of knowledge at the Universities and all, according to their own capacities, pursuing visions of truth and new knowledge, with a view to giving them shape and permanence. True natures are loyal to the conditions of their origin. "Old Boys" cherish feelings of regard for the days lived at the University or school where their intellectual being took shape. The mutual relationship subsists in the life of both. There seems no reason why contacts should cease after graduation; they could be kept up by pamphlets, reading lists, home study circles, etc., and education could thus be continued in the life of the alumni who have the wish and time to pursue it. It should be the concern of a Univesity not only to find how its products are placed in life, but also help in finding places for them in life. The Unemployment Committee, United Provinces (1935), presided over by the Rt. Hon'ble Sir Tej Bahadur Sapru, has recommended the establishment of University Employment Boards with a view to provide facilities in finding openings for University students in the State. The Committee has also recommended that similar Employment Boards should be instituted for the Secondary school stage and for professional institutions also. Universities have so far thought such responsibilities outside their province, for they may take them away from their real sphere of work. The work of Employment Bureaus in some Universities has not been attended with much success. In the Universities of Oxford and Cambridge Employment Boards have been worked on specially effective lines, and good results have

unguarded growth of this tendency is regrettable. But do what we will, it cannot be stopped and world conditions demand its continuance on weighty reasons for the general good of the whole community. So Universities will exist in the future for two purposes: one for the training of men and women for professions, as theologians, lawyers, medical men, engineers and other industrial specialists, etc., and the other "to pursue learning and research, without regard to immediate utility." Neither of these purposes will be adequately fulfilled, if the selection of people proceeding to the University is made on any but educational grounds. This is the only guarantee to safeguard high standards of intellectual work. A University is not doing good if it helps people who have no special bent for learned pursuits to pass through its curricula, with the help of much labour and special assistance. It is doing harm. It is "making itself into a machine for multiplying inferior products and stamping them with an ancient and honourable hall-mark." With a view to promote efficiency in all sides of life, it is essential that only people possessing the necessary skill should be allowed to undertake any important activity in a well-constituted social system, and that, only those who are best suited for it should be allowed to learn the skill. The methods of work at the Universities should be carefully thought out. The students should have increased opportunities for individual work. Fewer lectures should be given. Papers should be set by teachers to classes giving a list of books to be consulted for answering them adequately. The teacher should meet the students individually after they have done their papers. There may be more informal contacts between them. If a student does no work and is found wasting his time, he may not be allowed to remain at the University, for he can be more usefully employed elsewhere. It is highly essential that all teachers at the University should themselves be engaged

were considered as conclusively established and consequently the plea for urgent reform was found to exist. Bombay University pleaded innocent of any such defects in her educational system, and it was conceded by the Commission that the standards of attainment and of general University work were carefully safeguarded in Bombay, chiefly owing to the fact that men of high position and experience in the city had given their time and energy to the University in the best interests of the nation, and helped to keep up its tone and working on a high level. There is a great need in all Universities for such close association of men of affairs and business and of men of high public duty with the interests of the University. Apart from this, in the civic Universities, the law students could come in contact with practising lawyers, while students of Economics could try their theories in co-operation with those responsible for business affairs. The din of life has also its charms, but the music and drama of cities could be brought closer to the civic Universities.

All Universities, whether old or new, are institutions "for safeguarding and increasing our inheritance of knowledge." Standards and studies decay ; they should be renewed. A university should be alert to discard superseded methods and detect the importance of new studies and new lines of approach. It should keep in touch with all that is happening at the frontiers of knowledge. Only suitable men and women could do this. The question naturally arises what types of people should be given admission to the Universities. Universities have been considered as the homes of pure knowledge and research. Of late years, skills and industrial studies have intruded upon these places of pure learning. As life grows more complicated and industry more scientific, there will be need for more professional and industrial experts who will be supplied by the Universities. The

machinery. On these lines the constitution of Delhi University has been framed. The main contribution of the Committee, however, lies in the finding, that the reform of Universities is dependent upon a radical reconstruction of the school system in such a manner that Universities may be enabled to concentrate their resources on the training of those who are qualified and competent to receive it. The growing volume of unemployment of educated classes has brought matters to a head and supplied "the compelling force towards reform." In fact the reform of parts of a continuous system, separately, is not possible. The whole should be opened out, with a view to readjustment. Schemes for reconstruction have been suggested from various sources, which agree in fundamentals and are fairly well knowu.

This is an age of new Universities and in all parts of the world they have been cropping up with amazing rapidity. Roughly speaking, three types are found with distinct features. The English type is marked with the old tradition of "sound learning"; the German and the continental, with a passion for research; and the new American type has a wider conception of the functions of a University. The modern city University has arisen in England, whose aims and activities come closer to the life of the community. Such Uuniversities lose by not being "detached," as thought, "the cardinal duty of a University," is a solitary business. But such civic Universities gain in other respects. There is a greater scope of interaction of life and thought, theory and practice in such places. The leaders of thought and leaders of action in the city may give strength, enrichment and dignity to the work of the civic University by their association with the different sides of University life. In this respect, the Universities situated remote from city centres, suffer in solitude. In 1902, the defects in the efficient working of all Indian Universities

University and creating new Intermediate Colleges under the control of Boards of Intermediate Education." Few attempts have been made to give effect to these proposals; the attempts made in some provinces in this connection are imperfectly devised and fall short of the expected results. The chief result of the recommendations of the Commission has been the creation of a number of Unitary Universities which, however, being founded on wrongly designed School systems, have met with limited success. The Hartog Committee examined the educational system in relation to its political aspect. They discovered and disclosed the existence of enormous waste at different stages of the educational system. They found the lecture-halls of High Schools and Colleges clogged with students whose inclinations did not lie in the line of literary studies and they opined that the methods of teaching and study failed to produce the background of knowledge and training, which was attainable by the better qualified students. The Punjab University Enquiry Committee has examined the present educational situation in greater detail. The Committee has observed that the Unitary Universities have not justified the hopes raised at the time of their establishment. With a view to produce high standards of teaching and examination, such Universities are committed to a scale of expenditure, which is far greater than India is expected to bear. Also, India being a country of great distances and limited means of communication, Unitary Universities can hardly, by themselves, meet the increasing educational needs of a vast population. The Committee also felt doubtful if "the benefits derived from such Universities, are commensurate with the College traditions they have eclipsed." They have advocated the federal form of the University, which will preserve the College traditions and knit together their teaching and research facilities and other resources by exercising a closer control of the University

at the Universities to the general good and strength of the whole educational system. The schemes for the transfer of Intermediate classes to High Schools have met with indifferent success so far, one reason being that the academic level of schools which entirely depends on the higher attainments of its staff, has been deficient in sustaining the comparatively higher types of education, which were made transferable under such schemes.

University.

The University in India was not "so much a place of instruction in the begining, as an organisation to test the value of education given elsewhere." It was purely an examining and affiliating body on the model of the London University. In 1898, London University was so transformed as to combine both the teaching and examining functions. The same lead was followed here. At the beginning of the century, the shortcomings of the University system came in for a great deal of criticism. The rigid curricula and set uniformity of courses, decline of the standards of attainment, the inadequacy of staff and buildings, the unsalutary effects of external and formal examinations, the absence of facilities for research and new knowledge, the lack of control by the University over the constituent colleges—these, with other defects, were adversely criticised and attention was directed to University reform. A University Commission was appointed and on the recommendations of that Commission the University Act of 1904 was based. But this Commission were precluded, by their terms of reference, from considering the condition of schools and they focussed their attention chiefly to the readjustment of the administrative machinery of the University system. The Calcutta University Commission had wider terms of reference and they recommended reconstruction of the school system, by removing the Intermediate stage of education from the sphere of the

we observe that many boys pass the Matriculation at the age of fifteen (or even younger) and then proceed to College. They thus lose the bracing stimulus of school life and are denied suitable training in those qualities, which are so valuable to success in life. However beneficial it may be in other directions, a college education is no substitute for a good school education (with its school discipline, its school games, and its school methods of work) for boys, who are on the threshold of professional study."

The same period of educational life is given special importance in all reorganisation schemes, according to which bifurcations for industrial and other technical training have to be introduced at this stage.

Also at this stage, real preparation for University life is carried out. Everywhere the University teacher is found to complain that the student comes to the University with inadequate equipment for higher studies. Given suitable material, some improvement can be effected by raising the level of teaching processes at this stage. Educational systems provide facilities for the training of teachers and the results have fully justified the effort and expense involved. It may be adopted as a definite educational policy in a State, to provide similar facilities to teachers, for post graduate studies in different subjects at the Universities on similar lines. From the point of view of power and efficiency, the equipment of an M. A. or M. Sc. bears a marked contrast to that of a B. A. or B Sc. of an Indian University. Training can help an ordinary graduate to a certain extent, but it cannot make good his deficient knowledge of the subject he teaches. M A. and M. Sc. trained teachers should be put in charge of higher secondary school stage, if it is sought to materially raise the intellectual standards at that stage. It will produce enrichment and higher tone in the last school years and develop post-graduate work

and comparatively mature in experience. More freedom of work should be their share with regard to their scholastic studies and the seeds of specialization may be sown in these years. The students should have times for solitary individual work and a spirit of initiative and adventure in studies and skills should be encouraged. The schools may have big halls, suitably furnished, where students could go for quiet individual study as a part of the day's work. The training for humanities and scientific work should both form the curriculum of his work and study at this stage. This period in education bears special significance in the growth of modern conditions. It is contended that higher secondary education should specially aim at producing the qualities of high character, efficiency and ability, as the best products of higher secondary schools will have to bear the detailed responsibilities of administration of the country more and more in the near future. A case, therefore, is made out for creating such institutions, in which education must be taken in its fullest connotation—"the whole making of man"—and not in the sense of mere imparting of information and ideas which often pass as education. With a view to make the training in this period more effective and efficient in order to develop the desired qualities, it has been suggested (and the same suggestion has come on academic and other grounds also) that the length of training at the higher secondary stage should be prolonged and students should not rush for admissions to the University at a comparatively early age. An apt passage from one of the recent reports may be cited in this connection:—

"There does not seem to us sufficient guarantee that boys have always received an adequate grounding, in what are usually considered to be the basic subjects of school education. Again such education should be given, in our opinion, in a good and well regulated school, but

ever, can be carried too far. Students should be accustomed to the hard discipline of studies and should not give up things just because they are difficult. During these years, one aim of Education should be to discover the special aptitudes of students. It seems essential that students while engaged in formal studies should be all along given the opportunities to work with their hands in relation to any useful art or skill. I have a feeling that even the elements of pure knowledge are better assimilated by those who have the use of manual work, properly co ordinated with their formal studies. The hand-work helps the process of grasp of literary work. Perhaps such students have the advantage of applying knowledge to things and realities. I agree with the sentiment expressed long ago that "the scope of all speculation is the performance of some action or thing to be done." The principle of doing something with their hands by children who use their brains, I think, should be given full weight in our schemes of education. In this connection, I may mention the school that forms a part of the Mint Technical Institute, where students do their formal studies and spend a part of the day on productive work in workshop conditions. In this very institution where the Conference is being held, the education of manual work in Carpentry, Smithy and other kinds, is being increasingly given. The introduction of manual instruction in its gradual extended form, I think, constitutes a very wise and well-directed policy in the education of the State. One memory is very vivid with me, and its recollection fills my mind with pleasing effects. It was in the City Intermediate College that I assisted in starting the work of a lathe, which is of such essential importance is promoting the possibilities of manual work in a place.

The last school years have come in for a great deal of importance during recent times. They relate to students who are grown up in years, trained in thinking

is being carried out here and elsewhere with a view to help them to pass through the same stage. A great deal has been said and written about the school period of education, and efficient effort is being made to achieve the educational aims and ideals that relate to the later parts of the educational course, and I may say, that considerable success has attended such efforts. My remarks will be limited to mere observations and suggestions incidental to the later periods of educational life. The education for literacy may be extended for a longer period in the life of the child as conditions and opportunities permit. At this stage in particular, knowledge should grow out of things and conditions, and should not be separated from them. The enthusiasm and happy ways of the child should be kept up and collective co-operation in recreative activities should be encouraged. There are passable, fairly good schools for secondary and later stages, but the primary school is not what it ought to be. Adequate attention is not devoted to it. Our attention should more and more be concentrated on this part of our educational system. Its objective for the spread of literacy should be adequately fulfilled. One of the recent commissions has made the following statement about this stage of the Indian Educational System: "Judged by the test of literacy, the primary schools largely fail in their task, as the number of pupils who complete the course and should thereby gain a grip of literacy is almost insignificant, in comparison with the total enrolment." The primary stage feeds all the later activity in a country. It is therefore essential from the nature of things, also the conditions of the times demand, that literacy institutions should be made both more effective and universal. Education up to the age of 14 should be given in subjects which every one ought to know and specialization should come later. Such things, as a rule, should be taught as are directly useful and should be taught in an interesting manner. This principle, how-

the physical and mental disadvantages of a home, that could be considered by no means as ideal. The power of moulding young minds that science and modern knowledge have placed in the possession of man is a terrible power, capable of use for both good and bad. It could be used to produce a more ruthless and merciless humanity than the one that exists. It is very essential that this power should fall in suitable hands. "The teaching must be inspired by love, and must aim at liberating love in children." The average man will not perhaps deal gently enough, in love and patience, with small children. There exist, therefore, strong reasons for the thorough, higher education of women. In short, remarkable results are possible in the formation of character by the training of instinct at an early age. By creating right habits and right skills, the child instincts themselves could be made to prompt desirable actions. There is no strain, punishment, repression, resistance involved in the process; the child has the sense of perfect freedom and spontaneity all through his training. What wonderful possibilities are opened out to the human race! the achievement of health, happiness, freedom, love and intelligence, as Nature's universal elements, embedded in the subsoil of growth of all young lives "If we chose, in one generation, we could bring about the millennium." The generation, educated in fearless freedom and with the inward joy of life, will live a wider and nobler existence. This is something that the training of instinct and the Nursery School may be able to do.

School Years.

After this age the child goes to a proper school. The educational systems of the world take charge of him. The educational conditions of later stages of education are too well known to us. We have all passed through these systems. The instruction of thousands of children

skill, knowledge and experience for the details of training at this age. Prolonged hours of patience watchfulness, and wise suggestion are needed to inculcate the habits of happiness and usefulness at this period of immeasurable importance to child life. The demands of requisite education at this period of time could be fulfilled by institutions which are called "Nursery Schools". The children between the ages, say from 2 to 6, could spend the whole day or a part of it in such schools, where competent supervision about their health, nourishment, rest, play, skill, intelligence, and all-round development on the most scientific lines, could be made available. In some countries, such schools have produced admirable results. Good health and fine physiques have been produced in children coming from very poor conditions of life. "Children from such schools are mentally alert, sociable, eager for life, and new experience." They know something about gardening, caring for plants and animals. They not only help themselves but they help the younger children. They play games and enjoy childhood. During later years some acquaintance with the elementary sides of study is introduced and the results are highly promising. Also the Nursery School children are better prepared to go on with the regular school curriculum afterwards, their physical and mental powers having been awakened by the nature of the Nursery School It may quickly raise standards of character and cultural attainment in all grades of academic life. One great result will be that the "Welter and misery of disease" will disappear, the effects of thwarted instinct and mental deficiency will be swept away and happy and healthy life will ensue. Such schools are not expensive; they began by setting apart large rooms in suitable houses for children of poor people and persons inspired by the love of children and possessing the necessary knowledge and intelligence were put in charge and the results have shown that early care can even overcome

Above all, the teacher or person in charge of the child, should show no fear, otherwise each such emotion will be reflected in the child. The existence of fear is a fundamental cause for all disorders of character. In fact character cannot exist where fear is present. All superstitions, causes of inaction, irrational and weak states of mind, have their roots in the emotion of fear. The curious inexplicable undercurrents of tension in society, the tyrannies and wars of mankind, are all ultimately traceable to the same basic source. The cause should be removed and there will result conditions for the growth of courage, vitality, enterprise and intelligence which should be the true aims of education to inculcate. Courage, the sovereign quality of all ingredients of character, could be exercised under the influence of control and will power, and it is a great virtue under all conditions, but courage under the constriction of control, gives rise to nervous disorders. It is sought to develop courage in the mind, as the result of good habits and good actions, steadily fostered in the child-character, without disturbing in any way its freedom or its spontaneous activity.

Nursery School.

The period of first six years is outside the school age. Educational systems generally do not provide for it. The influence of the home is considered adequate during these years and no doubt the best homes have a great opportunity. All that is needed is affectionate care, combined with powers of intelligence and modern knowledge in the home. Perhaps in well-to-do homes a great deal is possible. But there are natural difficulties. Intelligent parents may not have the necessary leisure, even if they possess the requisite knowledge. The company of other children may not be available in the home. Children may be made much of in small families. Besides this, the parents are not expected to possess the

The Next Five Years.

We may continue to examine the career of the child for the next five years. It is generally considered that the moral education of the child ought to be complete by the time he is six years old. After the first twelve months have passed in health and happiness, the child is introduced to a comparatively smooth-sailing period of life. Walking and talking are sources of new freedom and curiosity is boundless at this age. They supply opportunities to the educator. The child develops his powers and outlook each moment in his usual natural way and suitable occasions are made use of by the educator in promoting good habits, by wise suggestion and tender sympathy. But in his new adventures, the child has the fear of falling. He may have a number of other fears, as his little powers come to collide against the forces of Nature—fear of darkness and shadows, fear of noises, fear of moving objects, fear of strangers, and fear of the mysterious or uncanny, etc. The fundamental principle in training for this part of life should be that all kinds of fears should be eliminated from the life of the child. His happiness and pleasures should grow daily in the lap of Nature, but if it is found that fear of any kind lurks in the deep substratum of his consciousness, all weapons and skills should be used—praise, blame, suggestion and company of other children—to eradicate it, and the situation should not be passed over, till the assurance is complete that the fear is resolved and the nature and soul of the child is at peace with the object of scare. The gradual methods of doing this may take days and months; it will be worth while to spend the time. All sources of fear should be dealt with in the same way. Fortunately most of the fears at this age are acquired, and very few are instinctive. The fear whether instinctive or acquired should be eliminated from young lives by all possible means. Irrational fears should be killed.

Woman.

Woman is at the beginning of the race. The conditions of life are against her for making the full use of her opportunities, and the advantages of knowledge and cultivation of intelligence are delimited for her. The burden of responsibilities has weighed her down. Too much is expected of her and too little is done to assist her condition. Half the human race goes to school and for the other half school doors are closed. A society in which half the members acquire high intellectual ideals of life and thought, as the result of increased opportunities of education and culture, while the other half remains steeped in comparative ignorance, will find itself eventually in a position that will not make for a healthy equilibrium. Apart from any such results, the discharge of immeasurable responsibilities, on which the future progress and welfare of the race depends, remains inadequately fulfilled by her, owing to the tyranny of world conditions. The restriction of educational opportunities is not the only thing. Conditions exist in the present world, where freedom and full enjoyment of life are even disturbed, with consequent injury to her physical health The effects are visited on the future offspring with the gradual diminution in vitality and vigour and the process repeats itself, till a time comes when the future growth of such portions of the human race comes to a standstill. Apart from this, it is unfair to expect the offspring of such conditions to stand shoulder to shoulder and even excel children, born of free conditions of life. Even Nature has been hard to the lot of woman. She is fearfully weighted in the race of life. "It is the duty of man to see that not a grain is piled upon the load beyond what nature imposes; that injustice is not added to inequality." The amelioration of the human race by educational and other methods cannot be brought about unless the lot and condition of woman is improved.

shrouded in mystery, the cry and the condition of the child is the only data, and high type of intelligence is needed to rosolve and comprehend the situation. Apart from this a suitable balance between care and indulgence has to be maintained, as any excess will be grooved into habit and will have the grip and strength of an instinct in later life. This period is full of deep significance, in which health foundations are laid, temperaments and tones of character are determined and the miniature man is built up. The utmost care in details is essential. Regularity and routine are important at this stage with a view to introduce method in later life. Nothing unusual should happen, all should accord to the normal course of events. The mental capacities and pleasures as they begin to unfold, should be encouraged in the natural course, but the rate of growth not disturbed. Our affections may not cross the bounds of control in giving too much importance to the child, as it may carry the seed of that instinct further in the time of life. Never should a sign or suggestion of fear be visible in those who minister to the needs of the infant, lest the springs of fear generated early, should develop into wide channels in later life. The powers of the infant are small but the universe of his intelligence is great. In the period of one year he learns much more than in any other period of his life. At this stage, of his crucial existence, the educator is the mother Nature has accorded her instincts, at this period of time, in full consonance with those of the infant. It is her destiny and privilege to see to the growth of humanity, more particularly at this juncture of life. She has kept the perennial day-and-night watch over her charge, through centuries of human life. Her industry and patience in this regard are divine and superhuman, but world conditions have defaulted in equipping her with necessary knowledge and intelligence to bring the same to bear on her all responsible task.

knowledge have arisen and have become famous by the lives and work of teachers. But it should be borne in mind, that worth refuses to be weighed in exact terms of price values and high natures have a mission to fulfil, both to the genius of their art and to the contacts of their environment. High excellence will always subordinate considerations of cost to chances of self-realization.

The First Twelve Months.

The precious charge of the classroom and the teacher is the child. All effort is expended and all resources are pooled in the world, to educate him properly. The education of the child begins at the moment he is born The first twelve months of his education are of crucial importance and have far-reaching results on the future making of his life, results, the possibilities of which defy all powers of definition and research. He comes as a visitor to startling new conditions and swift trains of impressions fall on him with astounding rapidity, and speedy response and adjustment has to be made if the visitor has to stay and become at home in his new abode. The infant is endowed with instincts and reflexes in the beginning, which mature into habits with amazingly quick succession. These habits form the rockbeds of character of the future man. Nature's elements—light, darkness, noises, motions, objects, impinge on the infant mind with crowded conflicting impressions and make his existence hard, difficult and uncomfortable at the start. Human love and sympathy, combined with knowledge and intelligence should come to aid and alleviate the early sufferings of the newcomer. The condition is of complete dependence, the physical needs should be seen to with constant care and watchfulness, in full grasp of the whole position, which is not so easy to understand. The watchfulness is continued into all hours of the night and day and only a deep-rooted strong instinct, based on love and affection, could do this. The position is also

efficacy of inherited elements which may have a kind of determining effect in the lives of human beings and fixing the promise of our hopes with the value and power of acquired characteristics and external training, the belief in which only makes the efforts of schools and educational discipline worth while, it may be said that the class room, in its extended meaning with all its environment, exerts an influence and power on the lives of a nation, the extent, possibility and effect of which is hardly possible to assess. It is to a great extent true that if it is required to produce a nation of musicians or a manhood of valiant men or men pierced with the faith of pure and noble ideals or in fact any types of marked, distinct talent, the most effective, in fact the only place to go to, is the classroom and there appeal to the personality of a teacher. All living nations are taking irresistible interest in the fortunes of the class room and in the attributes of the teacher. The latter is supposed to build up characters and lives. He has on him a momentous responsibility. Generations of students pass through his hands, carrying away the impress of his influence, mind and character. It is being realised that a person of limited capacity and outlook will produce in his young audience the reflection of his own limited gifts, while the touches of a supreme excellence in Art, Science or skill, will impart knowledge and enthusiasm in good material, that will kindle other natures in turn to sparks of similar wisdom and thought. Thus the goodness of one man will multiply and expand in the wide regions of the country-side. People who wish to live in the fullness of vigour and light, would invest the last ounce of gold in their assets in finding a man from any-where, who would breathe knowledge and wisdom in the young lives of their growing humanity. The object should be to get such men even if the last provision is exhausted. If this is done, all else will follow—buildings, equipment, students etc. In this way all centres of

Presidential Address

BY

Qazi Mohamad Husain, M. A., LL. B. (Cantab.)

Pro-Vice-Chancellor, Osmania University.

LADIES AND GENTLEMEN,

I have a feeling that a great honour has been done to me in asking me to preside over the 10th Annual Conference of the Teachers' Association. At the time when the invitation was so kindly extended to me, I expressed my reluctance in accepting it, as I believed and suggested that there were a number of better people in Hyderabad for this office. The illustrious series of great men who have occupied this position, made me feel diffident at being included in this succession. But my gratitude to the members of the Teachers' Association is great and boundless, in so far as they have asked an obscure, unknown man to preside over the proceedings of their Annual Conference this year.

I highly appreciate this opportunity of addressing the members of the Teachers' Association with whom I have contacts and affinities of a deep-rooted nature. I am a teacher by nature and profession. Even in times of most assiduous work, my touch with teaching has remained. In the headlong race of routine and of multifarious administrative duties, I have found restoring elements of peace and change in the light activities of the class room. The class room is a great place, where the teacher's sovereignty is supreme and where all his and the whole nation's opportunity lies. On its common-place seats sit the future genius of the race, the ruler and the ruled of a country and the would-be citizen of the world, under conditions that the word and influence of the teacher moulds the minds of them all, at the most plastic time of human life. Barring the inevitable

struggle and fight against the evil forces of society, individually and collectively, and face difficulties bravely and courageously.

Scouting, being one of the items of the extra curricular activities, is considered in these days as a character-building force. It is admitted on all hands that it is a life-promoting and life-organizing process.

Ladies and Gentlemen, I hope you will agree with me when I say that our prime object should be to make man perfect, socially and politically. He should be a personification of freedom of conscience, broad-mindedness, moral courage and stamina, self-respect and deep sympathies. These free and unhampered activities, if organized, will bring about traits of real manliness and foster a well-balanced mind and shape character. In a true sense, they will be able to appreciate and value fine arts and literature and be lovers of Nature.

If they are brought up in such a socially congenial atmosphere. they will not only be materially well off but also be capable of analysing and scrutinizing their lives and then be in a better position to adjust themselves and live harmoniously with society as a whole.

Ladies and Gentlemen, it is earnestly to be hoped that, having these high ideals in view, our responsible, conscientious and enthusiastic teachers will serve their country and the Ruler with indefatigable zeal and the the best of spirits.

In the end, while thanking you again for your kind response and particularly for your patience, I fervently pray for the long life and prosperity of our august ruler, His Exalted Highness the Nizam, Asaf Jah Nawab Mir Osman Ali Khan Bahadur, Sultanul Uloom.

The chief business of the teacher is to create for the children a healthy and congenial atmosphere which will harmonise with the social ideas and ideals.

In such an atmosphere, the children will be more prone to act, imbibe and cultivate better social habits. It means that the frequency of action leads to the formation of a habit. A teacher should be in a position to develope forcibly various aspects of character by means of lessons, games, debates, functions and other activities Outstanding personalities may be asked to visit the school and the children may also be allowed to come in touch with them, so that their lives and achievements may serve as an ideal to them.

Substitution—By far the most satisfactory method of modification is the encouragement of the desired behaviour by redirection or substitution. According to the social pyschologists, the principle of substitution or sublimation can be applied to our present-day social evils which have a nefarious influence on our Education

The best method of dealing effectively with the outlaws of society in order to transform them into law—abiding citizens is to take cognizance of the gang-instinct and to socialize such anti-social tendencies by providing them with the necessities of life, i e., healthy homes, healthy food, parks, gardens, playgrounds, places of recreation, museums, and libraries.

The spirit of quarrelsomeness among the members of society, either collectively or individually, is an undesirable social expression of the instinct of pugnacity.

Competitive games, as contested by soldiers and school boys, not only keep their bodies fit, but, psychologically, provide a healthy outlet to their innate aggressive tendencies. These organized competitive games make them so self-conscious that they, as men, can

not only when one sees some one in pain but when one hears of human suffering. This leads to the realization of the self and the culture of aesthetics.

Modification of Instincts.

We can say with certainty that instinct in human beings is not fixed as in the lower animals, but is capable of modification and re-direction at the will of the cultivated. The modified instinct is the basis on which discipline and character rest, and is, therefore, of immense importance for parents and teachers. The following are the different methods of modifying the instincts:—

Punishment.—One of the commonest and least efficient methods of modifying innate tendencies is to punish the child, whenever any instinct of improper behaviour is aroused in him. The basic principle of corporal punishment is that pleasure is the cause of action. But pleasurable actions tend to be repeated, while pain abhors action.

If action is pleasurable, its subsequent repetition is facilitated ; if painful, it is inhibited. The anger of the parents, and the punishment of the teacher compel the child to react and make him mend his ways.

Exercise, Experience and Disuse.—Connections atrophied by disuse are never formed in the nervous system. The environment of the children should be such that, as far as possible, they may not see undignified and objectionable behaviour and hear uncouth or obscene language ; they should be kept aloof from dangerous persons who provoke undesirable responses. Mere sermonizing of high-sounding precepts will be ineffectual. Models and examples have magnetic power and their effect is far greater and enduring than that of a pile of dry books and hollow precepts. Good models and examples should be before them so that the children may be able to copy and imitate them unconsciously and eagerly.

Vanity.—The feeling of vanity leads to ostentatiousness. Pride, self-praise and show are the different aspects of vanity. Every individual is susceptible to vanity. It is due to its sting that a man craves for wealth, fame, honour, and power. This very instinct teaches him obedience, diplomacy, friendship, toleration and service. But if the instinct of vanity is misdirected and becomes perverted, it results in disgrace, notoriety, enmity, disobedience and revolt

Construction and Destruction—These instincts which are an incentive to action are present in the child. Perseverance, labour and courage are the varied aspects of these instincts. In order to bring under control the material and psychological conditions, a modification of the disciplinary means is necessary. For a virtuous act, a kind heart is of course essential; but breadth of vision, knowledge of facts, and propriety of action are also needed for the completion of the act. Sympathy and generosity are to be blended with the instincts of construction and destruction, so that they may become interdependent, and one's welfare may come to be considered as the welfare of another. Professor Dewey terms the instincts of construction and destruction with all their implications as the power of action, and his philosophy of Education, i. e., The Project Method, entirely rests on it.

Sympathy.—Bertrand Russell lays stress on the sympathetic tendencies. He is of opinion that such tendencies are essential features of the crowd instinct and their sublimation is of great importance. The real meaning of sympathy is to regard and respect the sentiments of the individual as well as of society as a whole, to feel and sense pain with others, to be happy with others, to be affected by environment, pleasant and unpleasant, in proportion to the intensity of pleasure and pain. Sympathy becomes universal when one is touched

is the result of the training. It is the sacred duty of parents and teachers to teach children from the early stages, etiquette, regulations and habits of diet and rest, control of anger, regard for others, hospitality, generosity, straight-forwardness, modesty, truthfulness, industry, love of justice, respect for elders, sympathy and service to the poor and the needy. The value of these traits should be consciously or unconsciously, theoretically or practically, impressed on the child's mind by the parents and teachers. The success of the teachers depends on the right understanding of the child's psychology and his innate aptitudes.

ESSENTIAL INSTINCTS.

Imitation.—From childhood to manhood, nay, to be more exact, from the cradle to the grave, we, in one way or another, imitate others. Our speech, our sentences, our words and their relation with objects, are the result of imitation. Our actions and words are reflections of the deeds seen and words heard; our dress and manner of living are a replica of our home life, country or objects to which we are attached mentally and emotionally. Invention is the second name of modification, and, if it is an invention, it is a rarity. It is an established fact that practical imitation precedes mental and emotional imitation. Tarde has elucidated some very interesting and thought-stirring laws of imitation. He is of opinion that the minority imitates the majority, in the same sequence as the conquered imitate the conqueror, the children the elders, the subordinates the superiors, the semi-cultured the cultured.

People are naturally so constituted that they imitate easily the heart-ravishing objects. Those who suffer from an inferiority-complex are prone to motivate a sense of superiority in personalities whom they imitate.

The very foundation of society is being shaken to its depth Our world is put to test on the transvaluation of values as a law of human progress. We are at the cross-roads and are beginning to decipher new laws for our welfare and advancement. In other words, our point of view has now changed. It behoves us, therefore, so to arrange and organize the activities of our schools henceforward that every individual shall not only acquire good habits, but also realize his rights and duties as a free citizen. Punctuality, orderliness, methodical application, industry, sincerely making the best of the job, are some of the important traits to be inculcated in the school children, so that, wherever they go and whatever they do, they may not only prove useful and beneficial but be an asset to society. The characterstics to be aimed at are that a man should think for himself, be able to distinguish between the good and the bad, the important and the unimportant, the real and the unreal. Above all, he should see to it that his health is not impaired by transitory interests or by momentary pleasures.

Ladies and Gentlemen, the character of an individual chiefly depends upon the natural make-up of instincts The manifestation of innate instincts is influenced by environment and other factors, In order to build up character, the harmonisation of these instincts is essential. Activities should be so organized that the instinctive tendencies of the children could be transformed into good and useful habits. Observation, models, experiments and general education lead to the formation of character. It cannot be gainsaid that the outlet for the natural instincts of a child is affected by general education, models, and environment And it is also a fact that the general evolution of character in a child is traced from his infancy to his natural inclinations. As the child advances in age, he is moulded by up-bringing and training. A completely developed character at the age of maturity

Ladies and Gentlemen, there are ever so many problems of Education, interesting and important, and I think it may not be out of place to mention a few of these on the present occasion. The aims and ideals of democracy have begun largely to influence our present-day society. We are already feeling the effects of this change, whether for good or for evil. The Indian society of to-day is a quaint composite of materialism, utilitarianism, spiritualism, and superstition. Democracy stands for the respect of human personality ; it infuses a new life into the youths and at the same time tones down their passions and makes them humane in their behaviour and outlook. Their fine human qualities show love and admiration for the beauty of Nature or art and aversion to ugly things and de-humanising forces.

The main object of Education, said Plato, is to train a man for the work for which he has a natural aptitude. In the same strain, Ruskin has given expression to some of the most profound thoughts :—"The chief aim of Education" he says, "is to develop the human soul to its fullest potentialities, so that it may not only make a man happy but also train him for the service of mankind". The modern educationists have also endorsed views to the effect that man should have the freedom and the opportunities to develop and unfold life to its utmost extent. Their endeavour is towards the perfection of man who should strive for the cultivation of a broad outlook, the realization of deep sympathies based on human contact and the creation of a variety of interests. Without these he can never be a complete man and will never be able to justify his claims to a better and more respected status in the modern world, where everything is fast changing, in order to shape things to come in a better and more harmonious setting. Our time-honoured customs and traditions are being ruthlessly treated.

reveal the fact that we can, on their basis, greatly improve ourselves and our outlook on education and can in great measure succeed in attaining our object, dispelling the all-pervading illiteracy and ignorance that are baffling our best efforts towards their removal.

The Association deserves to be congratulated not only for what it has done, but also for its having achieved more than what it had promised.

The quarterly journal of the Association, 'The Hyderabad Teacher', is admittedly one of the leading educational journals in India. The Library of the Association is replete with the most modern works. The Annual Gardening Competition, the *Mushaira*, the Educational Exhibition, the Annual Conference, the Special Classes for Teachers, the work done by of the Extra-curricular Bureau, and last but not least, the Educational Week, which has been organised this year, are only a few of its manifold activities.

The recent establishment of the Teachers' Club is also due to our popular, sympathetic and far-sighted President of the Teachers' Association, Mr. Syed Ali Akbar, who is the guardian angel and the pivot of all our activities and in whom we have found a true guide, friend and philosopher.

This year, in particular, is an auspicious year in the history of the Association, in view of the fact that the Educational Exhibition in connection with the Conference has been opened by Her Highness the Princess Durre Shahvar Durdana Begum Saheba. The Princess's love of the people, her interest in Education and patronage of learning and the Arts are household words in Hyderabad. She has done us, teachers of Hyderabad, signal honour by her graciousness and we deem it our respectful duty to convey to her our feelings of deep gratitude for her having condescended to open our Exhibition

in need of one so experienced and enlightened and zealous as you undoubtedly are.

Last but not least, I take this opportunity of offering our sincerest thanks to our distinguished patron, Mr. Khan Fazl Mohamed Khan, the Director of Public Instruction, not only for his presence here but for the great interest which he has evinced in all our educational affairs. I am sure I am voicing the feelings of all present here when I say, that it is due entirely to his interest and encouragement that this Association has achieved whatever it has in the realisation of its aims and ideals.

Ladies and Gentlemen, I should like to draw your attention, on this occasion, to the aims and objects of the Hyderabad Teachers' Association.

The Hyderabad Teachers' Association was founded in 1334 Fasli. Its aims and objects are as follows:—

(i) To foster esprit-de-corps among the teachers of different schools.

(ii) To keep them in touch with the new educational ideas and methods.

(iii) To help them to find out, by means of co-operative effort, a solution of their common difficulties.

The materialisation of such aims and objects is the duty of all of us. If one were to go through the published reports of the Association for the last eight or nine years, it would become clear to one what the Association has actually achieved and accomplished It has to its credit fifteen technical reports which have been prepared under its auspices. It has also provided opportunities for teachers to listen to many learned and scholarly lectures which have undoubtedly helped to widen their outlook. These reports and lectures

incisiveness and breadth of vision. The lesson which he preached therein on what should be the guiding principles of a teacher's life, viz., sense of duty, sympathy, loyalty and co-operatian, can never be forgotten. The very intricate and highly technical problems of the principles and methods of teaching were elucidated and developed by him in his own inimitable way and in a manner at once original and convincing. Only an expert and born educationist, as he undoubtedly is, could have tackled them so ably and thoroughly. Though it is only a year since he took charge of the portfolio of education, there are signs already visible of substantial progress in every stage of education, of healthy life and growth all round and a newly awakened consciousness amongst the teachers as well as the students. These are all directly traceable to the master mind at the helm of affairs. The Nawab Saheb has successfully demonstrated, by precept as well as by example, that it is not red-tapism which infuses new life and energy but the force of a magnetic personality.

It is my very pleasant duty next to welcome Mr. Qazi Mohamed Hussain, the Pro-Vice-Chancellor of the Osmania University and the President of this Conference. We cannot tell you, Sir, what a great pride and pleasure we feel in having you as the President of this Conference. Your all-round ability and all-embracing personality are a model for emulation not only by the students of the University whose destinies you directly control but by all the youths of the state. We are grateful to you, Sir, for the honour you have done us by consenting to preside over our Conference, and we take this opportunity of congratulating you on your well-merited promotion to that high office. Possessed as you are, Sir, as we feel thoroughly convinced you are, of probity, industry, sympathy, impartiality and broad vision, you are a rare gift to the University which stood

Ladies and Gentlemen, I most cordially tnank you for the trouble you have taken in coming here to participate in the Conference. I am particularly grateful to those of our guests who have come from the districts. I offer you all a warm and hearty welcome and ask for forgiveness in the matter of any of our very obvious shortcomings. As this is our common cause, I request you to collaborate with us again in making as great a success of this session of the Conference as you did of the previous ones.

Ladies and Gentlemen, it was our fervent hope that our Hon'ble Member, Nawab Mahdi Yar Jung Bahadur, would be able to inaugurate this Conference as he had fully intended to do. But, owing to quite unavoidable circumstances, the Nawab Saheb could not ararnge to return to Hyderabad in time to open the Conference. It is, however, fully expected that he will be with us tomorrow and give us at least a brief address. He will be coming down all the way from Ajanta for this purpose. His presence with us, at all events, before the expiry of our session, would, therefore, be proof positive, if ever proof was needed, of his abiding interest in Education and of his deep solicitude for our profession. Like his revered father, the late lamented Nawab Imadul Mulk Bahadur, Nawab Mahdi Yar Jung Bahadur is acknowledged on all hands as a true patron of learning. Great and varied are the achievements that stand to his credit in the field of administration. His kindnes, kindliness and courtesy towards the teachers are all well known. We always feel not only honoured but greatly heartened by his presence. Those of you that had the opportunity of hearing and closely studying the thought-provoking Presidential Address which he delivered at the Teachers' Conference last year could not have failed to be impressed by its scholarship and soundness, combined with its

Welcome Address

BY

S. Noorul Hasan, B. A., B. T. (Alig); Dip. Ed. (Glasgow), Chairman, Reception Committee, The Hyderabad Teachers' Conference.

MR. PRESIDENT, LADIES AND GENTLEMEN,

Allow me, at the very outset, to offer my sincerest thanks to those who have so kindly and generously elected me Chairman of the Reception Committee I consider it a great privilege to have been asked to welcome so distinguished a gathering of teachers and educationists, the vast majority of whom, I know, consists of those who have devoted their lives wholly and solely to the cause of education and character-building. Theirs, indeed, is a noble mission Their high sense of duty and unquenchable thirst for knowledge are almost proverbial. As humble torch-bearers of learning and enlightenment, they have undertaken to endeavour to dispel darkness and ignorance. They are selfless but determined workers in the field of education, for whom considerations of pelf or power are alike immaterial. They may not be rich in the goods of the world and their lives may not be very plentiful or offer to them all those attractions and normal luxuries which ordinarily fall to the lot of other public servants. Though their lot appears to be unhappy, yet there is enough in their profession to afford them all the cheer and satisfaction they need for sheer sustenance. Service is their philosophy and work for its own sake their sole aim in life. There is no wonder, then, that the reward and consolation which they derive from their life's work they deem to be more than ample. Fortunate, indeed, are those amongst us who have the right conception of their duty and whose work is characterised by real earnestness, honesty and sincerity.

The Association owes a debt of gratitude to Mr. Khan Fazl Mohamed Khan, Director of Public Instruction, for ontinuing to give support and encouragement to the Asso- iation in all its activities. My thanks are due to the members f the Executive Committee and other committees for their villing co-operation. I cannot adequately express my feel- ngs of gratitude to Mr. Syed Ali Akbar, the President of he Association, to whose initiative, energy and guidance he progress which the Association has made is largely due.

MIRZA ZIAUDDIN BAIG, B. A., B. T.,
Hony. General Secretary.

Finances of the Association.

We started the year with a credit balance Rs 584-4-5 and B. G. Rs. 10/-. The monthly subscription received during the year from various branches amounted to O.S. Rs. 822-6-6. The total expenditure was O. S. Rs. 910-4-1, out of which O, S. Rs. 629-13-8 were spent on the Annual Conference and Educational Exhibition held last year. The accounts for the year 1344 Fasli were audited by Mr. Abdul Wahab, to whom our thanks are due. Mr. Syed Khairat Ali, Hon. Treasurer, also deserves our thanks for continuing to act as Treasurer of the Association.

Conclusion.

Ladies and Gentlemen, the successof the Education Week which has been organised for the first time this year is extremely encouraging, and I have no doubt that it will lead the Association to decide to have an Education Week every year in future on the occasion of our Annual Conference. The Members of the Association will always remember with pride the signal honour which Her Royal Highness Princess Durru Shahwar did them by graciously opening the Exhibition yesterday. Other interesting features of the Education Week were the Scout Day Rally organised by the Organising Commissioner, Boy Scouts, last Saturday, the lantern lecture by Mr. Weber and the *Mushaira* organised by Mr. Gulam Mahmood, Secretary, and other members of the *Mushaira* Committee under the presidency of Mr. Shaokat Ali Khan Fani, Radio talks by Messrs. Philip and Mirza Mahmood Ali Beg and last but not least, special classes for teachers which were held last Saturday and yesterday and which in most cases will be repeated tomorrow. We are much indebted to all those ladies and gentlemen who have been helping us to make the Education Week a success, and specially to Mr. Qazi Mohamed Hussain for presiding over the Conference.

Husain Sharif and Mr. Eshwar Singh represented the Hyderabad Teachers' Association at the Conference. The Education Department sent over 50 exhibits to the All-India Exhibition at Nagpur from different schools at the Headquarters, including the City College, the Holy Rosary Convent and schools for the Depressed Classes. It is gratifying to note that as many as 14 prizes were won by our schools.

Our Library.

The library of the Hyderabad Teachers' Association continued to receive an annual grant of Rs 180/- from the Education Department. Further additions were made to the library, which now has 644 English and 260 Urdu books. During the year under report 221 books were issued to members, as against 210 in the previous year, while the total number of borrowers was 152, as against 134 in 1344 Fasli. The Association is deeply indebted to Mr. Syed Mohamed Husain Jafery, Deputy Director of Public Instruction, for his generous gift of nearly 100 valuable books. As a mark of its sincere gratitude and keen appreciation, the Association has made him an Honorary Life Member of the Association. Our thanks are also due to Rev. F. C. Philip who presented 3 books and Messrs. Weber and Ali Akbar who gave 5 books each to the library.

The Hyderabad Teacher.

This journal has entered upon the 11th year of its existence. There have been two changes on the editorial staff recently. At the end of the year under report, Mr. Ataur Rahman, B. A., left for England on long leave. In his place Mr. Salim Bin Sayeed, B. A., B. T., M. Ed. Lecturer, Osmania Training College, has kindly consented to serve on the editorial staff. On the Urdu side, Mr. Saeeduddin Khan has taken the place of Mr. Allah Bux who has left the Education Department.

Club, which is at present located in the Office of the Divisional Inspector of Schools, has provided a reading room, a radio set and indoor games like chess, ping-pong, bridge and finger-billiards. The members look forward to the day when, with financial support from Government, the Club will have a building of its own with a billiard table and a tennis court. The Club has held tournaments in various games during the Education Week and it also had its 1st annual dinner last night. Much credit is due to Mr. Ansar Ahmed, the energetic Secretary, for making the Club a success. Mention must also be made of the good work done by Mr. Abdul Jabbar Sobhani, Assistant Secretary, before his transfer to the Districts.

Public Lecture.

Under the auspices of the Association a public lecture was delivered on the 23rd July, 1936, by Mr. K. G. Sivaswamy, B. A., Secretary, Rural Centre, Servants of India Society on 'The Ethics of Citizenship.' Mr. Syed Mohamed Husain Jafery, B. A., (Oxon), Deputy Director of Public Instruction, presided. A report of this lecture appears in the September number of *The Hyderabad Teacher*.

School Gardens Competition.

The number of schools which entered for the Annual School Gardens Competition was 8, as against 9 in 1344 F. For the second year in succession the Cup goes to the Nampalli High School; the Khairatabad Practising School stands second and the Vivek Vardhini High School and the Model Primary School are bracketed as third.

All India Educational Conference and Exhibition.

Our Association continues to be affiliated to the All-India Federation of Educational Associations. In December, 1935, Mr. Syed Ali Akbar and Miss D. Nundy attended the 11th Annual Conference of the Federation at Nagpur as official delegates from the Hyderabad State, while Mr. Nazir

Monthly Meetings.—

The following topics, connected with the central theme selected for the year., viz., School Discipline, were discussed at the different centres :—

(1) Co-operation between the Head Master and staff as a factor in School Discipline:

(2) Discipline in the Classroom.

(3) Discipline outside the classroom.

(4) Discipline through Corporal Punishment.

(5) Discipline by means other than Corporal Punishment.

(6) Co-operation between teachers and parents as a factor in School Discipline.

(7) Student management as an aid to School Discipline.

(8) The place of gifts, rewards etc. in School Discipline.

(9) The influence of the Personality of the teacher on School Discipline.

Efforts were made to add to the usefulness of the monthly meetings by making arrangements in advance for a member to open the discussion. Some of the papers read at these meetings have already been published in the Urdu Section of the Hyderabad Teacher.

The Teachers' Club.

The suggestion which was made by Mr. Syed Ali Akbar in his lecture on "The Teacher and His Leisure" at the last Conference and which was welcomed by the illustrious President of the Conference, was taken up in right earnest by the Central Executive Committee, and within six months after the date of the Conference, the Club came into being. The fact that over 100 teachers and educational officers enrolled themselves as members on the opening day shows how keenly the need for such a Club was being felt. The

4. Appointment of a Sub-Committee for taking steps to found a Teachers' Club.

5. Making arrangements for the 10th Annual Conference.

The Bureau of Extra-curricular Activities.

This bureau has been established to give effect, as far as possible, to the recommendations contained in the Report on 'Extra-curricular Activities', which was adopted at the last Conference and to serve as an advisory board for schools and as an agency for enlightening the public on extra-curricular activities. Its members are :—(1) Rev. F. C. Philip, Chairman; (2) G. A. Chandawarkar, Secretary; (3) Mr. Noorul Hasan; (4) Mr. Parthasarthi; (5) Mr. Mirza Mahood Ali Beg; and (6) Rev. G. Sndaram. A Sectional meeting of the Bureau will be held at 4 p. m. to-day.

The Sub-Committee on School Discipline.

This Committee was formed in pursuance of a resolution which was passed at the last annual conference. Mr. Abdus Sattar Sobhani was elected Chairman of the Sub-Committee and on his transfer to Nanded Mr. Mirza Mahmood Ali Beg took up his place. Other members, who were elected by their respective centers, are :— Mr. Mohd. Yusuf, Secretary; Messrs. Mohd. Sultan, Gulam Dastagir, Dinkar Narayan, N. V. Iyer, Syed Ghousuddin, Gulam Ghouse Khan, Syed Sadruddin, Hafizulla Meer Mohamed Husain and Ganesh Chand.

The findings of this Sub-Committee will be open to discussion at the sectional meetings to be held this afternoon and tomorrow morning under the chairmanship of Mr. Sajjad Mirza, Principal, Osmania Training College and Mr. Syed Mohamed Husain Jaferi, Deputy Director of Public Instruction, respectively. They will finally be placed for approval before the Conference tomorrow afternoon.

The Tenth Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association.

Report of the General Secretary for the year 1345 Fasli.

Mr. President, Ladies and Gentlemen,

The year under report has been one of marked progress. We began the year with our 9th Annual Conference which was held under the distinguished presidency of Nawab Mahdi Yar Jung Bahadur, Political and Educational Member. The keen interest which he evinced in the proceedings of the Conference and the words of encouragement and appreciation to which he kindly gave expression in his Presidential Address, and still more, in his concluding remarks, served as a powerful incentive to us in all our efforts throughout the year. Besides carrying out our usual programme successfully, we were able to widen the sphere of our activities by establishing the Teachers' Club and the Bureau of Extra-curricular Activities.

The Association has on its rolls 810 members. During the year under review, the Madrasae Aizza was constituted into a separate branch, so that we have now 13 branches, as against 12 in the previous year. The Secunderabad Teachers' Association continues to be affiliated to this Association.

The Central Executive Committee held seven meetings, at which, among other things, the following business was transacted:—

1. Constitution of a Bureau of Extra-curricular Activities.

2. Appointment of a Sub-Committee for preparing a Report on "School Discipline".

3. Drawing up of a programme for the monthly meetings of the Branch Associations.
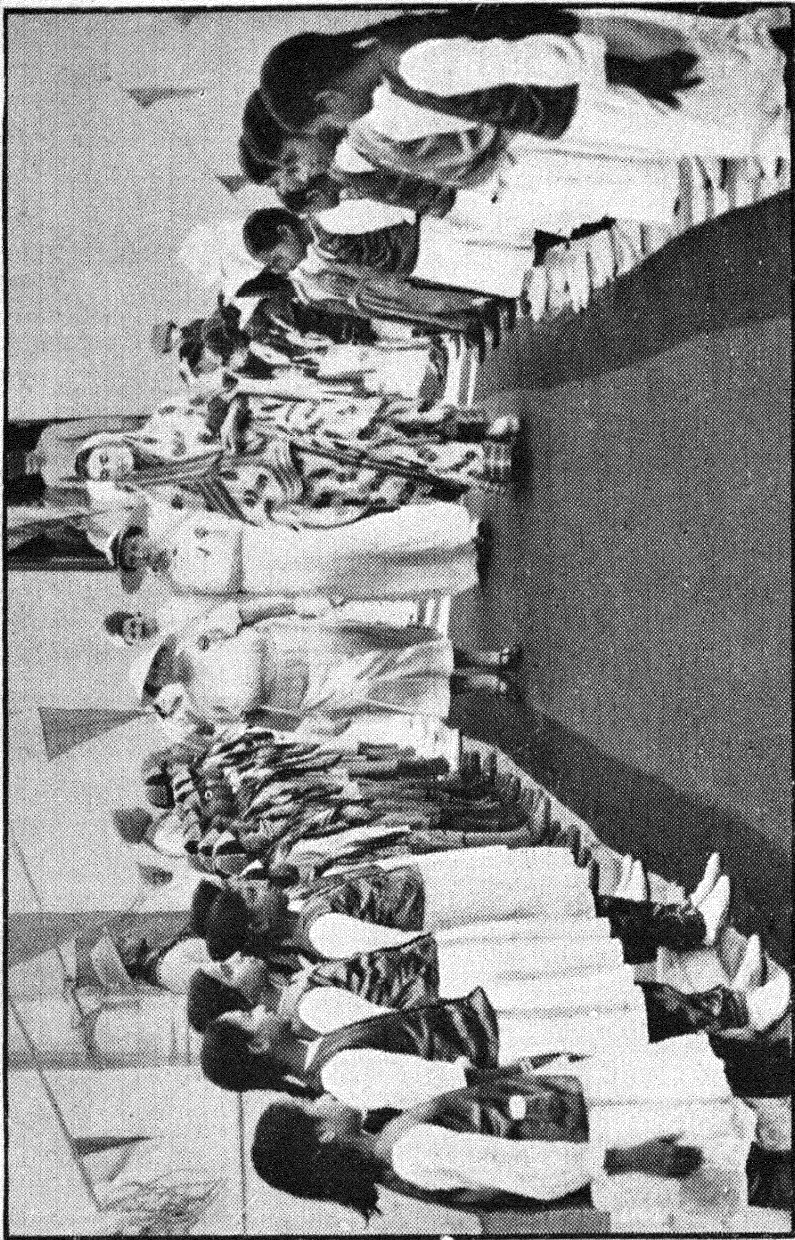
OPENING OF THE EDUCATIONAL EXHIBITION BY HER HIGHNESS PRINCESS DURRE SHAHVAR

Photo by Raja Deen Dayal & Sons, Secunderabad (Deccan).

The Hyderabad Teacher

CONFERENCE NUMBER.

CONTENTS.

The Hyderabad Teacher.

ADVERTISEMENT RATES.

Space.	Whole year		Six months		Per Issue	
	B. G.		B. G.		B. G.	
	Rs.	As.	Rs.	As.	Rs.	As
Full page ...	12	0	6	0	4	0
Half page ...	6	0	3	8	2	0
Quarter page.	3	0	1	12	1	0
Per line ...	0	10	0	8	0	6

SUBSCRIPTION RATES.

For the Nizam's Dominions O. S. Rs. 3 annually, (including postage).
For British India B. G. Rs. 3 a year (including postage).
Single copy O. S. As. 12 for H. E. H. the Nizam's Dominions.
Single copy B. G. As. 12 for British India.

The Urdu & English sections are published separately also, the annual subscription being Re. 1 As. 14 & Rs. 2, respectively.

VOL. XII REGISTERED ASAFIA NO. 47 NO. 2.

THE

HYDERABAD TEACHER

OCTOBER–DECEMBER, 1936

CONFERENCE NUMBER

Quarterly Magazine of the Teachers' Association,
Hyderabad-Deccan.
Under the Patronage of
Khan Fazl Mohamed Khan Esq., M. A.
Director of Public Instruction.

SECUNDERABAD-DECCAN
PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD,

1936.

Annual Subscription Rs. 3.

حیدرآباد ٹیچر جوبلی نمبر

بابتہ ماہ فروردی سنہ ۱۳۴۶ف م فبروری سنہ ۱۹۳۷ء

جلد (۱۱)

فہرست مضامین

شمارہ ۳

تقریب

جشن سیمیں اعلیحضرت قدر قدرت سکندر شوکت سلطان العلوم ہز اگزالٹڈ ہائنس میر عثمان علیخان بہادر خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ

قطعات تاریخ

(۱)

حامیٔ دینِ مبین عثمان علیؑ ۔۔۔ رتبہ دان و جاں نثار بوتراب

فیض سے جن کے غنی ابنائے ملک ۔۔۔ جود سے جن کے زمانہ فیض یاب

بچّہ بچّہ نام پر جن کے فدا ۔۔۔ جن کی جوبلی عید قربان کا جواب

عہد میں ان کے ترقّی وہ ہوئی ۔۔۔ ذرّہ ذرّہ ہے دکن کا آفتاب

اس لئے اظہر نے لکھا سال جشن ۔۔۔ بارک اللہ عہد عثماں کا شباب

۱۳۵۵ھ

(۲)

مایۂ عیش و انبساط بنی ۔۔۔ شاہِ عالی مقام کی جوبلی

کیوں نہ عالم خوشی سے ہو معمور ۔۔۔ عید ہے خاص و عام کی جوبلی

شعرا کہہ رہے ہیں خوش ہو ہو ۔۔۔ ہے ملوک الکلام کی جوبلی

کلکِ اظہر نے سالِ جشن لکھا ۔۔۔ ہو مبارک نظام کی جوبلی

۱۳۴۶ف

(۳)

فدا شہ یہ جوبلی تو ہے عید قرباں ۔۔۔ مرادیں ہوئیں آج دونوں کی پوری

الف بڑھ کے اقبال کا یہ پکارا ۔۔۔ مبارک ہو عثمانیہ جشن جوبلی

۱۳۵۵ھ

(۴)

نوشیرواں و حاتم دوراں شہ دکن ۔۔۔ عالم میں عدل و داد کا جن سے ہوا رواج

رونق فزائے تخت ہیں پچیس سال سے ۔۔۔ جوبلی کا جشن کیوں نہ رعیت منائے آج

مسند نشیں بزم جو عثماں علیؑ ہوئے ۔۔۔ توقیر و منزلت نے رکھا جھک کے سر پہ تاج

اظہر نے دی دعا کہ سلامت رہیں حضور
پوری اسی طرح ہو زمانے کی احتیاج

تاریخ جشن سے سر اعدا قلم ہوا
فرخندہ باد دولت اقبال و ابتہاج
۱۹۳۷ء

گذرانیدۂ خادم الشعرائے زماں۔ فقیر سید دلدار حسین اظہرؔ
۱۳۵۵ھ
۱۹۳۷ء

نتیجۂ فکر جناب حکیم محمد فاضل صاحب مددگار مدرسہ وسطانیہ آیشاہ علی بندہ

کنونکہ در کف گل جام ارغوانی ہست
ہزار مست ترنم زشادمانی ہست،

صبا بہ گلشن عالم مژدہ رساند
کہ موسم گل و ایام شادمانی ہست

چرا شوم پئے آب حیات سرگرداں
رواں بہر نفسم جوئے زندگانی ہست

زفیض پیر مغانم بعالم پیری
بہر زماں طرب عہد نوجوانی ہست

بیا و جادہ بہ پیمایہ مسلک عشاق
دلا اگر ہوس عیش زندگانی ہست

زفیض شہ بدکن آفتاب علم و ادب
برآسمان شرف در ضیا فشانی ہست

زمین حضرت عثمانؓ و نصرت حیدرؓ
نصیب شاہ دکن فتح و کامرانی ہست

نتیجہ فکر جناب سید علی محمد اجلال صاحب مدرس فوقانیہ پنچل گوڑہ

آصفِ سابع نظام الملک سلطانِ دکن
فخرِ ملت فخرِ قوم و فخرِ شاہانِ دکن

جشنِ سیمیں ہو مبارک تجھکو سلطان العلوم
ہر طرف ہے یہ نوائے نغمہ سنجانِ دکن

جمع ہے ساری رعایا گرد تاروں کیطرح
انجمن آرا ہے تو اے ماہِ تابانِ دکن

دیکھ کر اے شاہ تیرے جشن سیمیں کی بہار
زر فشانی کرتے ہیں گلہائے بستانِ دکن

دیدنی ہے دلکشی چھٹکے ہوئے تاروں کی آج
پڑ رہا ہے چرخ پر عکسِ چراغانِ دکن

تیری ہستی ہنگئی نعمت دکن کیواسطے
تجھپہ فخر و ناز کرتا ہے یہ دورانِ دکن

درد کی تصویر تھا بالیں پہ تو آیا ہے جب
جلوہ آرائی تھی تیری رازدرمانِ دکن

تیرے عہد معدلت گستر میں ہیں شیر و شکر
بابیاں و گبر و ترسا و مسلمانِ دکن

اب رسوماتِ کہن کی گرم بازاری کہاں
ہوگئیں وہ سب نقوشِ طاقِ نسیانِ دکن

تیرے دم سے ترک و ایران و عراق و نجد ہیں
ہر جگہ موجود ہیں ممنونِ احسانِ دکن

"افتخار عہد حاضر" کا لقب تیرے لئے
"دارِ امن و عافیت" کا اسم شایانِ دکن

ملک و مالک دونوں وابستہ علیؑ کے نام سے
پھر نہ ہو کیونکر پناہِ خلق دامانِ دکن

ہو فزوں اقبال و عمر و دولت و جاہ و حشم
دل سے کرتے ہیں دعا پیر و جوانانِ دکن

ہوں معظم جاہ و اعظم جاہ کی عمریں دراز
ماہِ تاباں یہ وہ ہیں مہرِ درخشانِ دکن

کر دعا اجلال بہرِ خاندانِ آصفی
یہ رہے آباد زیرِ ظلِ سلطانِ دکن

نتیجہ فکر جناب مولوی عبد الحکیم صاحب تدبیر مدرسہ وسطانیہ گوشہ محل

اے شہ ملک دکن اے خسرو عالی تبار
خاندان آصفی کی یادگار باوقار

رونق ملک دکن اور انتظام سلطنت
دم قدم سے آپکے ہی کامیاب و کامگار

آصف ملک دکن ہیں آپ لیکن بے شبہ
آصف ملک سلیمان سے بھی بڑھکر ہے وقار

شوکت دارا کہاں اور ذات شاہانہ کہاں
آج اقبال سکندر آپکا ہے غمگسار

ملک کی اصلاح جیسی چاہیئے کی آپنے
آپکے احسان کا ملک دکن ہے زیر بار

باعث فخر ممالک ہو گیا ملک دکن
فخر شاہان زماں ہیں بادشاہ ذی وقار

میر عثمان علی خاں خسرو ملک دکن

آپ ہوں فضل خدا سے شاد کام و کامگار

مسدس سرودیہ

جناب آقا محمد خاں صاحب طلعت مدرس فوقانیہ دار الشفا

بار دگر مژدۂ رحمت رسید　　از سر نو گل بچمن بر دمید

بلبل عشق از سر شاخ نوید　　نعرۂ شوق از دل و جاں برکشید

حضرت عثمان علی زندہ باد ٭ تا بہ ابد زندہ و پایندہ باد

با ادب ای طفل دبستان شوق　　روی طرب کن سوی ایتاں شوق

شاہِ دکن را تو بہ ایوان شوق　　خوش بدعا باش بعنواں شوق

حضرت عثمان علی زندہ باد ٭ تا بہ ابد زندہ و پایندہ باد

تا ترنم ابر و نسیم بہار　　روی زمین شد یدکن لالہ زار

ساز طرب ساز و بگو بے شمار　　از ہمہ غمہای جہاں برکنار

حضرت عثمان علی زندہ باد ٭ تا بہ ابد زندہ و پایندہ باد

تا کہ قمر جا بہ سما میکند　　از رخ خور کسب ضیا میکند

آصف ہفتم کہ عطا میکند　　طلعت بیچارہ دعا میکند

حضرت عثمان علی زندہ باد ٭ تا بہ ابد زندہ و پایندہ باد

افتتاحیہ

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر میخواست — آخر آمد زپس پردۂ تقدیر پدید

حضرت ظل سبحانی سلطان العلوم شمس الملت والدین نواب میر عثمان علیخاں بہادر آصف سابع شہریار دکن و برار خلد اللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ ۱۹۱۱ء میں سریر آرائے اورنگ حکومت ہوئے اُس موقع پر ایک سپاسنامے کا جواب دیتے ہوئے ظل اللہ نے ارشاد فرمایا تھا کہ

"ہر طرح میں اپنی عزیز رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے ممکنہ کوشش کروں گا"

آخر میں حضرت غفران مکان کا مشہور شعر بھی ارشاد فرمایا تھا جو درج ذیل ہے:-

آصف کو جان و مال سے اپنے نہیں دریغ — گر کام آئے خلق کی راحت کے واسطے

آج جب کہ مسند نشینی کے ۲۵ سال گذر چکے ہیں اور ہم نمک خواراں و خیر طلبان کے دل خوشی سے معمور ہیں ان آنکھوں نے نطق ہمایونی کو حرف بحرف پورا ہوتے دیکھ لیا۔ اس دورِ مبارک کی ترقی نہ صرف عہد آفریں بلکہ مُحیّر العُقول ہے۔

سلطان العلوم نے اپنی عزیز رعایا و برایا کی ہر ہمتی سود و بہبود کے لئے جو کچھ کیا اس کا حصر اس رسالہ میں ممکن نہیں بلکہ ایک دفتر کا محتاج ہے۔ ویسے تو اِس ابر کرم سے ہر چھوٹا بڑا سررشتہ سیراب ہوا مگر اُس نے سررشتہ تعلیمات میں ابر نیساں کا کام کیا۔ معارف پرور شاہ ذیجاہ کی ادنیٰ توجہات سے جو ترقی اس سررشتہ میں ہوئی اُسے نشاۃ ثانیہ کہا جائے تو بجا ہے جس پر ابنائے مُلک جس قدر بھی فخر و ناز کریں کم ہے۔

ممالک محروسہ سرکار عالی میں ۱۹۱۱ء میں جملہ مدارس (۱۰۳۶) تھے جن سے صرف (۶۶۴۸۴) طلبہ استفادہ کر رہے تھے۔ بخلاف اس کے ۱۹۳۵ء میں مدارس کی تعداد (۴۷۴۶) تک پہنچ گئی جن میں (۳،۵۲،۵۸۲) طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ مسند نشینی کے وقت تعلیمی اخراجات صرف ۱۴ لاکھ تھے؛ مگر اب ایک کروڑ سے زائد ہیں۔ اُس وقت اگر مدرسہ جانے والی آبادی کا تناسب ۵ فیصد تھا تو اب ۱۸ فیصد یعنے تقریباً چوگنا ہے۔ صرف ذکور کی آبادی کے اعداد دیکھے جائیں تو وہ اور بھی حیرت انگیز ہیں ۱۹۱۱ء میں

اس کا تناسب ۹ر۵ تھا تو اب چھ گنا یعنے ۳۰ فیصد ہے ۔ ان سب ہر جہتی ترقیوں کے علاوہ وہ عظیم الشان کارنامہ جو رہتی دنیا تک یادگار رہے گا اور جس نے تن بے جان میں روح پھونک دی اور جسم نامی بخشا وہ جامعہ عثمانیہ کا قیام ہے ۔ مبصرین اور ماہرین جو لارڈ مکالے کے فرسودہ ڈگر پر چل رہے تھے اور ہمارے اقدام کو شبہ کی نظر سے دیکھنے اور مذاق اڑانے میں بھی کمی نہیں کرتے تھے، جامعہ کے حوصلہ افزا نتائج، غیر معمولی ترقی اور ذخیرۂ ادب کی فراوانی دیکھکر انگشت بدنداں ہیں ۔ اب تو تمام اقطاع ہند میں یہی چرچا ہے کہ مادری زبان کے ذریعہ تعلیم ہو ۔

اس مبارک دَور کے آخری نصف حصہ میں متعدد علمی، ادبی، زراعتی اور تاریخی رسالے وغیرہ معرض وجود میں آئے لیکن زمانے کی ستم ظریفی اور بدمذاقی کے باعث ختم ہو گئے ۔ اسی زمانے میں رسالہ حیدرآباد ٹیچر نے بھی جنم لیا ۔ اور بحمد اللہ اپنی زندگی کے گیارہ سال پورے کرلئے ۔ اس مدت میں خالص فنّی اور نفسیاتی مضامین، نیز اساتذہ کے تجربات معلّمی کو شائع کرکے رسالہ نے ملک کی جو خدمت انجام دی ہے وہ ناظرین سے پوشیدہ نہیں ۔ انجمن اساتذہ مستقر بلدہ کے مقاصد کی نشر و اشاعت اور اساتذہ کے احساس معلّمی کو بیدار کرنے میں جو کچھ کامیابی اُسے نصیب ہوئی اس کا اندازہ ہر شخص بخوبی کرسکتا ہے ۔ غرض کہ جس قدر بھی چہل پہل اور گرم بازاری ہم دیکھ رہے ہیں وہ حضرتِ سُلطانُ العلوم کے علمی تبحر اور کمال ادبی ذوق کے برکات کا نتیجہ ہے ۔ لہٰذا اس مسرت و ابتہاج کے موقع پر حیدرآباد ٹیچر بکمال عجز و الحاح بارگاہ خداوندی میں ہدیۂ تہنیت و تبریک پیش کرنے کی عزت حاصل کرتا ہے ۔

آلٰہی ہمارے بادشاہ جمجاہ کو تا دیر سلامت باکرامت رکھ آمین ۔

عہد عثمانی
اور
اُردو کا قرانِ السعدین

شاہ علی بندہ
از مولوی سعید الدین خاں صاحب بی، اے، ڈپ ایڈ (عثمانیہ) صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ

مَلِیکُنَا السابعُ السُّلطَانُ آصِفُ جَاہٗ
فَخْرُ السَّلاطِینُ مَنْ جَلَّتْ مَاثِرُہٗ

تکوین عالم سے یہ بات ہوتی چلی آئی ہے اور تاریخ بھی اس کی شاہد ہے کہ انسان اپنی سرشت کے لحاظ سے ہمیشہ ایک مرکزی شخصیت کا متلاشی رہا ہے تاکہ اپنی شان عبدیت میں معبودیت کا جلوہ دیکھ سکے۔ یہ امر نہ صرف مذہب ہی سے مختص ہے بلکہ ارتقائے تہذیب و تمدن کے ہر دور میں اس کا ثبوت ملتا ہے کہ انسان اپنی سماجی تنظیم اور معاشرتی زندگی کے انضباط میں اسی ایک چیز کا محتاج رہا ہے۔ دور جہالت میں اگر یہی چیز امیدوں کا ملجا و ماوی تھی تو موجودہ متمدن دنیا میں بھی ہماری تمناؤں اور آرزوؤں کی یہی آماجگاہ ہے۔ مشرق کے اس جذبۂ بادشاہ پرستی اور ملوکیت کو ظل اللہ کے مذہبی تصور نے اور زیادہ مستحکم بنا دیا ہے چنانچہ فرخندہ بنیاد حیدرآباد اس خصوص میں بہ نسبت اور ممالک کے بہت زیادہ ممتاز ہے اور اپنے شاہ جمجاہ کے آستان کی جبیں سائی کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتا ہے۔

راجا اپنا شاہ عثمان اس کے ہم سب پرجا ہیں
پیارے دیس کا پیارا راجہ جگ جیون سے پیارا ہے

آج جبکہ خسرو کیواں حشم کے جشن سیمین کا روز سعید ہے۔ ہر گھر شادی کی نوید ہے۔ صبح طرب خیز اور نسیم معطر و عنبر بیز ہے ملت دکنی کا یوم عید ہے ناچیز حیدرآباد ٹیچر بکمال ادب حضور شاہانہ میں ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرنے کی عزت حاصل کرتا ہے اور دعا کرتا ہے۔

لہ اس مضمون کی تیاری میں رہبر، صبح دکن، نظام گزٹ، منشور، آئینۂ ادب، کے سالناموں اور رسالہ اُردو اور جانکی پرشاد کی کتاب "عصر جدید" سے مدد لی گئی ہے ترقی اُردو کا زیادہ تر مواد زور صاحب کی کتاب "عہد عثمانی میں اُردو کی ترقی" سے ماخذ ہے۔

تجھے یہ جشنِ عشرت خسروِ گیہاں مُبارک ہو
مُبارک ہو مُبارک، ہر دم و ہر آں مُبارک ہو
یہی کہتے ہیں سب تیرے فدائی شاد ماں ہو کر
دکن کا تخت اکلیل وحشمِ **عثمان** مُبارک ہو آمین

کسی قوم کے عروج واقبال کا زمانہ یکساں نہیں رہتا۔ تاریخ ہمیشہ واقعات کا اعادہ کرتی رہتی ہے مُسلمان بھی اس فطرت کے قانون کی گرفت سے بچ نہیں سکے۔ اسلام نے ان کو جو نظامِ تمدن دیا تھا اس کو انہوں نے بالکل محو کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صدیوں کی عظمت و شوکت، سطوت وجبروت خاک میں مل گئی۔ نہ عربی ہی باقی رہے اور نہ عجمی، نہ ایرانی ہی رہے اور نہ تورانی، نہ اندلس کے غازی رہے اور نہ مصر کے مجاہد، نہ اکبر کی سی وسیع المشربی باقی رہی اور نہ اورنگ زیب کی سی علوہمتی اور مذہبی عالی خیالی۔ غرض جب ہر طرف جہل و باطل کی تاریکی پھیل گئی اُفقِ دکن سے اعلیحضرت آصف جاہ سابع خلد اللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ کا آفتاب اقبال طلوع ہوا اور سارا ہندوستان جگمگا اُٹھا۔

شہریارِ علم پرور خسروِ گیہاں خدیو
میر عثمان علیخاں سرورِ گردوں سریر
فرہ عباسیاں از غرۂ اُو آشکارہ
جلوۂ الپ ارسلاں از پرتوِ او مستنیز
تازہ از وے دولتِ ثقلین و نورِ مشرقین
زندہ از وے سطوتِ غرناطہُ و وادی الکبیر

ملک کی خوش قسمتی ہے کہ اس کو ایسا رفیع المرتبت فرمانروا ملا اور یہ امر باعث صد افتخار و ناز ہے کہ پروردگار عالم نے ایسا خجستہ صفات بادشاہ عطا فرمایا جس کی رائے صائب، نظر عمیق، طبع سلیم، دماغ روشن، دل مُنوّر ہے، جو فرض شناس اور نکوکرداری کا مکمل نمونہ ہے، جس کا تدبر ملک کے لئے باعث فخر و مباہات ہے جس کی رواداری ضرب المثل ہے، جس کی علم دوستی اور ادب نوازی قومیت اور وطنیت کے حدود سے بالاتر نظر آتی ہے،

جس کی آزاد مشربی اور روشن خیالی سے کورانہ رسم و رواج اور جاہلانہ توہمات مٹ رہے ہیں اور قومی مستقبل درخشاں اور تابناک نظر آرہا ہے، جس کی ترقی پسندی سے دکن تعمیری، ذہنی و مادی، علمی و روحانی ترقی کے شاہراہوں پر گامزن ہے جس کی سادگی، نصفت پسندی، معارف نوازی، معدلت گستری قرونِ اولیٰ کے اکابر اور اعاظم اسلاف کی یاد دلاتی ہے، جس کا جذبۂ ہمدردی و ایثار شاہانِ اسلام کی حقیقی عظمت کو نمایاں کرتا ہے، جس کا ندرتِ بیان مجتہدانہ اور عالمانہ ہے، جس کے علم و فضل کا سہیم و شریک کوئی نہیں۔ وہ جو سلطان العلوم ہے "جس کی شاعرانہ قوت ابوالعتاہیہ کی بدیہہ گوئی کی یاد دلاتی ہے، جس کا شاعرانہ ذوق اور منظوم واقعہ نگاریاں حافظ و فردوسی کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہیں جس کی اجودھیا کی پھیلی زبان کی البیلی ٹھمریاں، کبیر اور کالیداس کو گنگ کر دیتی ہیں۔ جس کی غیر معمولی بلند نظری کا پتہ اس حالیہ فرمان کے نفاذ سے چلتا ہے جس میں نقرئی جوبلی کی نمائش و نمود کو بند کرنے اور نہایت عظیم الشان شفاخانہ امراض اطفال قائم کرنے اور ہزارہا معصوم بچوں کو موت کے چنگل سے چھڑانے کا حکم شرف صدور لاتا ہے دنیا کی تاریخ میں کوئی بھی ایسا تاجدار اور فرمانروا نہیں ملیگا جس نے اپنی تخت نشینی کی تقریبات میں لہو و لعب اور مشاغل تفریح پر دولت بہانے سے اجتناب کیا ہو لیکن یہ خصوصیت یہ امتیاز صرف خسرو دکن کے لیے مختص ہو چکا تھا۔

دور آصف جاہی کے اس عہد زریں کی اتنی لاتعداد برکات اور بے شمار خوبیاں ہیں کہ بے اختیار زبان پر یہ شعر آجاتا ہے۔

روز و شب عید و براتست بدور عثماں
للہ الحمد عجب لیل و نہار است اینجا

کوئی شعبۂ نظم و نسق، کوئی معاملۂ علم و فضل ایسا نہیں نظر آتا جس پر حضور اقدس و اعلیٰ نے توجہ نہ مبذول فرمائی ہو اور جس کی اصلاح و تکمیل کے لئے ہر ممکن تجویز کو منظوری کا شرف عطا نہ فرمایا ہو۔ چنانچہ عنان حکومت سنبھالتے ہی حضرت جہاں پناہی نے ملک کے دستور اور اس کی پیچیدگیوں کو سلجھانے کی کوشش کی اور ۲ نومبر ۱۹۱۹ء کو قصر شاہی میں دربار منعقد کر کے باب حکومت کی افتتاحی رسم ادا فرمائی۔ ایک فرمان کے ذریعہ غریب کاشتکاروں کو

خود غرض اور بے رحم سرمایہ داروں کے چنگل سے نجات دلائی گئی۔ غرض یہ اور اسی نوعیت کی دیگر چیزیں مثلاً عثمان ساگر، حمایت ساگر، نظام ساگر کی تعمیر، تنگبھدرا پراجکٹ کی اسکیم، نلوں کی تنصیب، برقی روشنی کا تعارف، ڈرینج کی تکمیل، ریلوے کی خریداری، موٹر بسوں کا انتظام، ٹیلیفون اور محکمہ آرائش کا قیام، کھیلوں کے میدان اور پندرہ سو سے زیادہ جدید پختہ شوارع کی تعمیر، مدینۃ الجامعہ، پتھر گٹی، نامپلی، ملے پلی، ملک پیٹھ، عنبر پیٹھ اور رود موسیٰ کے کنارہ کی عمارتوں کا سلسلہ، آزمائشی مزرعات پر کاشت اور تبلیغ، زرعی، مرغبانی اور باغبانی کے مظاہرے، پارچہ بافی اور دیا سلائی کے کارخانوں کا قیام، امداد باہمی کی تحریک دور دراز علاقوں میں طبی امداد و معاونت کی توسیع، پلیگ اور ملیریا کے دفعیہ کی تدابیر، محکمہ جات معلومات عامہ، امور دستوری اور بلدیہ کا قیام، طیران گاہ اور نشر گاہ کا تعارف، برطانوی فوج کے دوش بدوش فوجوں کی اصلاح و تنظیم، عدلیہ کی عاملہ سے علحدگی، اقتصادی پستی اور کساد بازاری کے باوجود بلا قطع و برید مصارف آمدنی کی توقیر، ابتدائی تعلیم کی توسیع دارالترجمہ اور جامعہ عثمانیہ کا قیام، اُردو کو ایک مکمل اور علمی زبان بنانے کا سہرا۔ تاجدار دکن کے وہ لافانی کارنامے ہیں جن کو زمانہ اگر کوشش بھی کرے تو محو نہیں کرسکتا۔

"اہل ہند کے لئے ذریعہ تعلیم زبان انگریزی قرار دی جائے"! نہیں معلوم کس غضب کی اثر آفرینی اس رائے میں تھی کہ جب ایک بار اس نے دل و دماغ پر قبضہ حاصل کرلیا تو اس سیلاب کی تند موجوں میں مادر ہند کے مایۂ ناز سپوتوں کی نازک دماغیاں تنکوں کی طرح بہ گئیں۔ انہیں اس کی طوفاں خیزی نے اتنا مبہوت کردیا تھا کہ وہ کبھی اس طرف متوجہ نہ ہوسکے کہ آیا اس طرح سات سمندر پار کی بولی کو بھارت ماتا کے چالیس کروڑ بسنے والوں کے لئے جن کی رفتار گفتار، مغربی طرز ماندبود سے بہت زیادہ جدا ہے اگر ذریعہ تعلیم قرار دے دیا جائے تو آیا یہ روش ان کے ابنائے وطن کو منزل مقصود تک پہونچا بھی سکے گی یا اس کے مصداق ہوکر نہ جائے گی؟

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

بہر حال زمانہ گزرتا گیا اور لکیر کے فقیر ہندوستانی اپنے اس ڈگر پر غیر مانوس زبان کی سختیوں سے ہر ہر قدم پر دوچار ہوتے شاد یا ناشاد گامزن رہے۔ لیکن یہ ایک پرانی کہاوت ہے "ہر فرعونے را موسیٰ" جن نام نہاد بہی خواہان ہند نے اس غیر فطری طرز تعلیم کی داغ بیل ڈالی تھی آخر کب تک ان کا طوطی بولتا! زمانہ نے کروٹ لی اور قدرت کے فیاض ہاتھوں نے اہل دکن — نہیں بلکہ اہل ہند — کی حقیقی صلاح و فلاح کی باگ دودمان صدیقی کے ایک لعل بے بہا کے دستہائے مبارک میں دے دی جس پر ابنائے وطن جتنا بھی ناز کریں کم ہے

آقائے ولی نعمت کی دُور رس نگاہ عالی قدر — جب سے شاہ جم جاہ کے قدوم میمنت لزوم نے تخت کو زینت بخشی ہے اپنی عزیز رعایا کی زندگی کے ہر پہلو کو مرتفع فرمانے کی مساعی میں شب و روز مصروف ہے۔ یہ بات ناممکن تھی کہ رعایا کے ایک ایسے چارہ ساز راعی خلد اللہ ملکہ — کی دقیقہ سنج نظر گرامی، تعلیم جیسے اہم مسئلہ سے جس پر اقوام کی ترقی و تمدن کا بالکلیہ انحصار ہے بلکہ اس دَور جہد للبقا میں ان کے عین حیات و ممات کا سوال ہے، درگزر کر جاتی۔ یہ نہ ہو سکتا تھا اور نہ ہوا۔

حضرت بندگان عالی نے ملک و قوم کی بروقت صحیح نبض شناسی فرمائی اور جس چیز کے لئے ملک عرصہ سے تشنہ کام تھا اس کی بیل بندی سے قوم کے تن مردہ میں جان ڈالدی۔

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست

آخر آمد ز پس پردۂ تقدیر پدید

عادتی گراں قدر عطایا کی سرفرازی سے اس عقدۂ لاینحل کی گرہ کشائی فرماتے ہوئے جامعہ عثمانیہ کی بنیاد قائم فرمائی۔ جس کا ذریعہ تعلیم ملک کی مروجہ زبان اردو قرار دیا گیا۔

اس خصوص میں تو پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اعلیٰحضرت نے تعلیم ہند کے مریض کے حق میں وہ مسیحائی فرمائی ہے جس تک نہ رہنمایان قوم ہی کی نظریں جا سکتی تھیں نہ زعمائے ملت ہی کے دماغ کی رسائی ہو سکتی تھی۔ اگر وہ اس خصوص میں کچھ کرنا بھی چاہتے تو ان کی مساعی خود آپ اپنی ہی بے دست و پائی کے سبب صفر کا کام رکھتیں قدرتی

ازل ہی سے خداماں بارگاہ کے فرق عالی کو اس سہرے کی عزت سے زینت بخشی تھی کہ جہاں ظل اللہ کی ذات گرامی تاج و تخت کے لئے باعث صد افتخار ہے وہاں اقلیم علم کے لئے بھی موجب ہزار ہزار برکات الٰہی ثابت ہو۔

اول اول اس اصول پر کہ زبان ملکی ذریعہ تعلیم قرار دی جائے بعض سخن ناشناس اہل وطن نے منہہ آنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ اصول حقیقت شناس، دقیقہ سنج، دوررس شاہی نظر و بصر کا نتیجہ تھا معیار پر کب پورا نہ اترتا۔ مادر علمی کے سپوتوں کے شاندار کارناموں نے کیا یورپ اور کیا ہندوستان سب ہی جگہ اس کا لوہا علی الاعلان منوا دیا۔

یہ اسی شاہانہ بذل و نوال اور حکیمانہ ارشادات عالیہ کا نتیجہ ہے جو آئے دن یہ گوش گزار ہو رہا ہے کہ زبان ملکی کو ذریعہ تعلیم قرار دینے سے بہتر نتائج کی توقع یقینی ہے" اور انشاء اللہ وہ دن دور نہیں جبکہ اس اصول کے ظاہری منکر اس اصول پر بالکلیہ عمل پیرا ہو کر رہیں گے اور اسی طرح اہل وطن کو اس ورطۂ ہلاکت سے صاف بچائیں گے جس طرح اب اہل دکن حضرت جہاں پناہ کی شاہانہ علم پروری کے طفیل غیر زبان کی صعوبتوں سے بال بال بچ گئے ہیں۔

گفتگو کے اس نقطہ تک پہنچ جانے پر جی یہ چاہتا ہے کہ چلتے ہوئے ذرا اس پوزیشن پر بھی ایک جھلتی نظر ڈال لی جائے جو اردو کو اس کی سادگی، دلنشینی، گہرائی اور پرکاری کے سبب اسکی دوسری سہیلیوں کے مقابلہ میں بھارت ماتا کی سرزمین پر اس کو حاصل ہو چکی ہے۔

اس موقع پر مذہبی عصبیت اور سیاسی داؤں پیچ کے نامعقول الزامات سے مقبول عام اردو کے دامن کو بے لوث رکھنے کے خیال سے مناسب ہے کہ اس خصوص میں ان فضلائے روزگار اور ماہران تعلیم کی قیمتی رایوں کا ایک سرسری خاکہ پیش کر دیا جائے جو قوم کی صلاح و فلاح کا حقیقی درد اپنے دل کی گہرائیوں میں چھپائے رکھتے ہیں اور جن کی فضیلت اور وسعت نظر مسلمہ ہے۔

(۱) "ہندوستان کے باشندوں کی سب سے بڑی تعداد ہندوستانی زبان بولتی ہے"۔

(دیباچہ رپورٹ سائمن کمیشن)

(۲) "اردو زبان ہندوستان کی دو بڑی قوموں یعنی ہندو مسلم اتحاد کی یادگار ہے اور

جس قدر اسے فروغ ہوگا اسی قدر اِن دونوں قوموں کی یک جہتی کا باعث ہوگا۔"

(ہز اکسلنسی مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنتہ صدر اعظم دولت آصفیہ)

(۳) "مجھے اُردو اور اُس کی ترقی سے دلچسپی ہے۔"

(ریورانڈ جارڈن صاحب مراد آباد)

(۴) "اردو زبان ایک ایسی زبان ہے جو تمام ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے۔ لوگ اس کو بولتے ہیں عام اس سے کہ ان کا کیا مذہب وملت ہے۔ اس زبان کے ہندوستان میں چودہ کروڑ بولنے والے ہیں۔"

(نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام سیاسیات وتعلیمات دولت آصفیہ)

(۵) "جنوبی افریقہ میں جو ہندوستانی لوگ آباد ہیں وہ ہندوستانی بولتے ہیں۔"

(ٹیلیکش جنوبی آفریقہ)

(۶) "ہماری اُردو زبان کی بنیاد ہی قومی اتحاد پر قائم ہے اور اس کا وجود باہمی اتفاق کا ثبوت ہے بعض قدرتی اسباب کا لازمی نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے اس کی طرف زیادہ توجہ کی مگر ہندو شعراء ومصنفین کی خدمات بھی کچھ کم قابل قدر نہیں۔ ایک طرف نسیم کا سدا بہار گلزار اُردو نظم کے چمن زار کی رونق بڑھا رہا ہے تو دوسری طرف سرشار کا زندہ جاوید آزاد، اُردو نثر کی ترقیوں کا افسانہ سنا رہا ہے۔ اس وقت بھی اُردو کو رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو اور ہز اکسلنسی مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کے سے بزرگوں کی سرپرستی اور حضرت کیفی دہلوی کے سے عالموں کی امداد حاصل ہے۔"

(عالیجناب خاں بہادر اسد اللہ محمد امیر احمد خاں صاحب والیٔ محمود آباد)

(۷) سب سے آخر لیکن بہت ہی اہم :—

(الف) "۱۸۱۹ء میں سمریو بھاگوت کا دسواں اسکند یعنی باب اُردو کی ایک ضخیم مثنوی مسمیٰ "آئینہ مستور" کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یہ مذہبی اور اعتقادی کتاب ایک ہندو اپنے ہندو بھائیوں کے لئے اچھی اُردو نظم میں تصنیف کرتا ہے۔ اس سے بدیہی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ہندوؤں میں اُردو کہاں تک جاری وساری تھی۔"

(ب) "شکنت چالیسی" اسو تریعنی وظیفے کی ایک اُردو کتاب ہے۔ یہ اُردو کے مخمس ترجیع بند کی صنف سے ہے اس کو میں نے پوجن کے سلسلے میں وظیفے یا مناجات کی طرح پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔"

(ج) "یہ دھیان میں رکھنے کی بات ہے کہ تلسی داس رامائن لکھ چکے تھے۔ اس کی کتھا برابر ہو رہی تھی۔ مہابھارت اور بہت سے ایسے پران اور دوسری مذہبی کتابیں ہندی میں منتقل ہو چکی تھیں لیکن اپنے اہالی ملت میں دھرم پرچار کی کمی محسوس ہوئی جب تک کہ اُردو سے کام نہ لیا گیا۔"

(د) "منشی شنکر دیال فرحت۔ منشی رام سہائے، تمنا اور خوشتر وغیرہم حضرات نہ صرف ہندوؤں کے بلکہ تمام اُردو دنیا کے شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے مہابھارت، رامائن، گیتا مہاتم، شوپران گنیش پران اور جانکی بجے وغیرہ دھرم پستکیں اُردو میں تصنیف اور ترجمہ کیں۔ یہ کتابیں منشی نولکشور کے مطبع سے چھپ کر آج تک شائع ہو رہی ہیں اور ہندوؤں میں ان کے مذہب کی تلقین اور روایات ملّی کے زندہ رکھنے کا زبردست آلہ ہیں۔"

(ھ) "بہت سے اپنشد اور چھوٹی شاستر اور سمرتیاں اُردو نثر میں منتقل ہو کر شائع ہوئیں، اور آج تک ان کی مانگ برابر جاری ہے۔ یہی حال آریہ سماج کے لٹریچر کا ہے"

(و) "سرور جہان آبادی کی تصنیف اس وقت مولود شریف کے جلسوں میں نہایت خلوص سے پڑھی جاتی ہے اور اتنی ہی دلچسپی سے سُنی جاتی ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ سرور جہان آبادی ہندو ہی رہے اور ہندو ہی مرے۔"

(پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی)

یہ ہیں چند ایک نمونے ان بے شمار مستند ترین اقوال کے بحر زخار سے، جو اُردو کے شیدائی، اس کے حامی، اس کے نکھارنے، بنانے اور سنوارنے والے کیا ہندو کیا مسلمان، کیا عیسائی اس کی شیرینی، عذوبت، مقبولیت، وسعت اور شان و شکوہ کے مدنظر اس کے متعلق رکھتے ہیں جن کا تفصیلی حوالہ بجائے خود ایک مستقل عنوان کا طالب ہے۔ ان اقوال کو غیر جانبدارانہ طور پر کہنے سے یہ بات ظاہر ہے کہ اُردو ایک ہر دلعزیز،

مقبول عام مشترکہ زبان ہے جو ہندوستان کے طول و عرض میں برابر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ پس اندریں حالات اُردو کو ذریعہ تعلیم قرار دینا اس کے چودہ کروڑ گلے لگانیوالوں پر ایک لازوال احسان ہے جو رہتی دنیا یادگار رہیگا۔

عطا شدہ نعمت کی شکر گزاری از دیاد نعمت کا باعث ہوتی ہے۔ اس لئے اس مُبارک و مسعود جشن سیمین عثمانی کے موقعہ پر ہر شخص اپنی بساط کے موجب بارگاہ جہاں پناہی میں جب ناچیز ہدایائے عقیدت پیش کرنے کی عزت حاصل کر رہا ہے تو ہر دل عزیز اُردو کے کثیر تعداد نام لیواؤں کی جانب سے یہ ایک کھلی احسان فراموشی ہوگی کہ اس تقریب محمود کے موقع پر اپنے عمیق جذبات ممنونیت کو بے نقاب کرنیکی ایک حقیر کوشش بھی نہ کریں۔

اس حقیقت کے مدنظر اس مُبارک جشن مسعود کی تقریب میں اُردو کی جانب سے بصد ادب اس امر کے اعتراف کی عزت حاصل کی جائیگی کہ کس طرح اس عہدِ میمنت مہد میں یہ بھولی بسری اور بے آسرا بولی شاہانہ سایہ عاطفت میں پروان چڑھ رہی ہے اور کس طرح دوآبہ گنگ وجمن کا یہ خودرو نونہال شاہانہ کرم عمیم کی لگاتار بارش سے سینچے جانے کے سبب دکن کی آب وہوا میں ایک لہلہاتا ہوا، شاداب اور تناور درخت بن گیا ہے جس کے پھولوں کی عنبر بیز خوشبو چار دانگ عالم میں پھیل کر جہاں پناہ کی غریب نوازی علمی سرپرستی اور سب سے بڑھ کر رعایا پروری کا علی الاعلان پرچار کر رہی ہے۔

اس موقع پر بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اس تمہید کو اس دعا پر ختم کر کے اصل مضمون کی طرف رجوع کیا جائے۔

عمرت دراز باد کہ تا دور مشتری
ما از تو برخوریم تو از عمر برخوری

قوموں کے عروج وزوال کے ساتھ زبان میں بھی تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے اور اس کا انحطاط اور ترقی اسی کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ اُردو زبان کی قسمت بھی اس کے بولنے والوں کی قسمتوں کے ساتھ بدلتی گئی۔ جب تک بیجاپور گولکنڈہ دہلی اور لکھنؤ میں حکومت تہذیب اور تمدن کا زور بندھا رہا زبان بھی منجھی رہی اور جہاں اس کو ادبار کی

صورت دیکھنی پڑی یہ بھی حضیض نکبت میں جا گری۔ غدر کے بعد رامپور اور حیدر آباد دو ہی ایسی ریاستیں تھیں جو برسر اقتدار اور علم و ادب کے گہوارے تھیں۔ یہاں اُردو نے پھر نشو ونما پائی اور حیدر آباد میں تو جو اس کا جنم بھوم تھا جب یہ واپس ہوئی خوب ہی پروان چڑھی۔ نواب شمس الامرا اور اُن کے احباب نے اس کو علوم و فنون سے مالا مال کیا تو آصف جاہ سادس نے اس کو دفتری حیثیت دیکر محبوب ترین بنادیا۔ دورِ عثمانی میں تو اب یہ طوفانی رفتار اور برقی سرعت کے ساتھ دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ پنجاب بھی آج کل اُردو زبان کی بہت خدمت کر رہا ہے لیکن وہ ادب لطیف اور صحافت کی حد تک محدود ہے۔ حیدر آباد کی خدمات بالکل جداگانہ نوعیت کی ہیں۔ وہ جدید علوم و فنون سے اُردو کے خزانہ کو مالا مال کر رہا ہے اور لفظی خزینہ میں وسعت دے رہا ہے۔ چنانچہ اس ربع صدی میں اس میں اس قدر نمایاں فرق پیدا ہوگیا ہے اور یہ اتنی منقلب ہوگئی ہے کہ ہر شخص انگشت بدندان ہے مفصلہ ذیل اقتباس سے مقابلہ کرنے پر آپ پر یہ بات اظہر من الشمس ہوجائے گی کہ زبان نے کتنے مدارج طے کرلئے ہیں اور وہ اب کتنی نتھری ستھری ہوگئی ہے۔

> لالۂ نافرمان۔ سوسنِ ہزار زبان۔ نرگس حیران قسم قسم۔ رنگ رنگ کے پھول پھول رہے ہیں۔ پیارے پیارے سہانے درختوں پر صبح شام کو دھوپ چھاؤں کا عالم۔ پتوں پر شبنم کی طراوت اور نم۔ ڈالیوں پر چڑیوں کا غل۔ پریوں کی آپس میں چھیڑ چھاڑ۔ نوجوانوں کے غول، ہمجولیوں کی ہنسی ٹھٹول۔ کہیں گل کے قہقہے کہیں بلبل کے چہچہے ہیں۔ مور اُدھر شور کرتا ہے اِدھر مستوں کا جنون زور کرتا ہے۔ کوئل وہاں کوک اُٹھتی ہے سینہ میں یہاں ہوک اُٹھتی ہے۔ پپیہا جو ادھر بولا "پی کہاں"، تو پھر یہاں بدن میں جی کہاں "۔

یہاں ایک بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ حیدر آباد نے گذشتہ پچیس سال کے عرصہ میں قدیم رنگ کو ترک کرکے نمایاں فرق پیدا کرلیا اور تحریر کو بھی معیاری بنالیا ہے۔ گذشتہ ڈیڑھ صدی کے تدریجی تغیر کا مثل رسم و رواج لباس اور خیالات کے زبان پر بھی اثر پڑنا

ضروری تھا چنانچہ اس عرصہ میں جو زبان تیار ہوئی وہ دَورِ حاضر کی جدید معیاری اور دکن کی قدیم معیاری اردو سے مرکب ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد جب اُردو کی تہی مائگی اور بے بضاعتی کا علم ہوا تو مجلس وضع اصطلاحات کا وجود عمل میں آیا جس نے ہزاروں اُردو اصلاحیں مثل تپش مطلق، (Absolute temperature) ترشہ (Acid) قانون اجانب (Aliens Acts) بادپیما (Barometer) تمثیل کاذب (Analogy false) تلازم (Association) ادراک (Perception) ہندسۂ تحلیلی (Analytical geometry) محرکات (Dynamics) وفاق (Federation) نصفت (Equity) مائع پیما (Hydrometer) رقاص (Pendulum) عصب (Nerve) طیف (Spectrum) امیر جامعہ (Chancellor of University) برقانا (Electrify) قرنبیق (Retort) کارکردگی (Efficiancy) لاشاعیں (X-rays) شہ پیچ (Screw-jack) محوری سطح (Axialplane) پس منظر (Back ground) وطن آبائی (Father land) اِنسیات (An thropology) تجاذب (Gravitation) کثافت اضافی (Relative density) نشرگاہ (Broadcasting station) معمل (Laboratory) عدسہ (Lens) معاشیات (Economics) حیاتیات (Biology) وغیرہ۔

بنا ڈالیں جو علوم و فنون کے بڑھتے ہوئے مطالعہ کے ساتھ ساتھ روز بروز نکسالی اور عام تر ہوئی چلی جارہی ہیں اگر ایسے نازک زمانہ میں جبکہ ہر طرف انگریزی کا بول بالا ہے۔ اعلیٰحضرت سلطان العلوم اس کی دستگیری نہ فرماتے تو یہ صرف ایسی بولی بن کر رہ جاتی جو گل و بلبل کی شاعری سے متعلق ہوتی۔

حضرت خسرو ذی شان کی فیاض سرپرستیوں نے اُردو میں ایسی بیش بہا کتابیں تیار کردیں کہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کو شاید صدیاں درکار ہوتیں۔ انجمن ترقیٔ اُردو، دارالترجمہ

علاوہ دیگر خانگی اداروں نے سینکڑوں اعلیٰ درجہ کی تاریخیں، جغرافیئے، سفرنامے ہندوستان ایشیا، یورپ دکن اور روما کے متعلق شائع کئے۔ معاشیات، نفسیات، سیاسیات، قانون وعمرانیات پر جو کتابیں تصنیف ہوئیں وہ اس کے علاوہ ہیں۔ لیکن یہ وہ علوم ہیں جو پہلے سے ہندوستان کی کسی نہ کسی زبان میں موجود تھے۔ دورِ عثمانی کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ جدید علوم وفنون مثلاً کیمیا، طبیعات، ہیئت، ریاضیات، نباتیات، حیوانیات، طب، انجینئرنگ کی معیاری کتابوں کو دس پندرہ سال کے اندر اندر اُردو میں منتقل کردیا گیا جو معجزہ سے کم نہیں۔ یورپ جدید کے ان جدید علوم وفنون کے شہ پاروں کا اُردو میں منتقل ہوجانا اُردو دنیا کی ایسی خوش قسمتی ہے کہ دوسری ہندوستانی زبانیں جتنا بھی رشک کریں کم ہے۔

قطع نظر ان شاہکار تراجم کے جو سرکاری کوششوں سے منظر عام پر آئے فرزندان جامعہ عثمانیہ نے بھی تقریباً تین سو کتابیں شائع کیں جو زیادہ تر علوم وفنون اور حکمیات پر مشتمل ہیں۔ ایسے نازک زمانہ میں جبکہ ہندوستان میں اُردو کا بقا معرضِ خطر میں پڑ گیا ہے دکن سے اس قسم کی کتب کا شائع ہونا شگون نیک اور فال ترقی ہے۔ زبان وہی زندہ رہ سکتی ہے جس کے جاننے اور بولنے والوں میں جدید ترین ضروریات علمی وادبی کے احساس کا فقدان نہ ہو، جن میں نہ صرف زمانہ کے ساتھ دینے کی صلاحیت ہو بلکہ ہر قسم کی مشکلات کے باوجود علمی وادبی خدمات کے انجام دینے کا ذوق وشوق بھی ہو۔

موجودہ زمانہ میں جیسے جیسے مذہبی اختلافات اور رسم الخط کی پیچیدگیاں بڑھتی جاتی ہیں ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک خلیج حائل ہوئی چلی جارہی ہے۔ حیدرآباد اس پر بجا طور پر فخر کرسکتا ہے کہ وہ اس قسم کی فرقہ پرستی اور مذہبی مناقشات سے کوسوں دور ہے۔ یہاں صلح وآشتی کا سمندر موجیں مار رہا ہے اور اُردو کی مقبولیت ہندوؤں میں روز بروز بڑھتی جارہی ہے جس کا ثبوت ہمیں جامعہ کے اس اعلیٰ امتحان سے ملتا ہے جس میں وہ برابر کئی سال سے مسلمان طلبا پر سبقت لی جارہے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۳۱ سے ۱۹۳۳ تک ۵۱ طلبا نے ال-ال۔ بی کی ڈگری حاصل کی جن میں ۳۱ ہندو اور ۲۰ مسلمان تھے۔ کیا اس نتیجہ کے

علم کے بعد اس حقیقت سے کسی کو انکار کی جرائت ہو سکتی ہے کہ عہد عثمانی میں اُردو زبان کو غیر معمولی درجۂ قبولیت حاصل نہیں رہا ہے اور اس کی ہمہ گیری بڑھتی نہیں جا رہی ہے!

اُردو کا رسم الخط ایک عرصہ سے اس کی ترقی میں حارج تھا۔ حیدرآباد میں بھی اس کی اصلاح کے لئے متواتر کوششیں ہو رہی تھیں اور لاکھوں روپیہ اس زبردست کمی کو پورا کرنے کے لئے صرف ہو چکا تھا مگر کسی کو بھی شاہدِ آرزو اور عروس کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس عہد ہمایونی میں ان خامیوں کا ارتفاع ہو چکا ہے اور ایک ایسا نستعلیق ٹائپ عالم وجود میں آگیا ہے جس نے اس کو انگریزی کا ہم پلہ بنا دیا ہے۔ اُمید ہے کہ جب یہ ٹائپ عام ہو جائے گا تو اپنی برق رفتاری کی وجہ سے اُردو دنیا میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیگا۔

حضرت سلطان العلوم کا دورِ حکومت اُردو کی ترقی میں ایک نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ عہد ماضی میں دہلی اور لکھنو کے فرمانرواؤں نے جو بھی اس کی سرپرستی فرمائی وہ صرف شعر و سخن تک محدود تھی۔ اس کو ایسی مستحکم بنیادوں پر قائم نہیں کیا گیا تھا کہ دنیا کی دوسری بڑی بڑی علمی زبانوں کے دوش بدوش کھڑی رہ سکتی۔ یہ محض حضرت ظل سبحانی کی رائے صائب اور علو ہمتی کا باعث تھا کہ آج وہ ایک علمی زبان ہے اور ہر ایک سے ہمسری کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ خود حضرت بندگان عالی سخن سنج و سخن فہم اور ایک بہت بڑے حلیف البیان شاعر اور نقاد ہیں۔ ذات شاہانہ کی بصیرت افروز تنقیدیں شمع ہدایت کا کام دیتی ہیں۔ شاہ عالم پناہ کے علم و فضل اور ادبی ذوق کا اندازہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں، کوئی پختہ مشق شاعر اور ادیب ہی لگا سکے تو لگا سکے۔ حضور عالی مقام کا کلام فصاحت التیام سحر حلال کا اثر رکھتا ہے اور ملک کے ادبی رنگ کو پیہم نکھارتا چلا جا رہا ہے۔ خسرو ذیشان کا اُردو سے یہ شغف اور ذوق سخن گستری ملک کے لئے نہ صرف فال نیک ہے بلکہ آب حیات کا درجہ رکھتا ہے اور باعث صد رحمت ہے۔

شاہ جم جاہ نے تخت نشینی کے بعد ہی اُردو کے مصنفیں اور مولفیں کی کیسی قدر افزائی اور عام علمی تحریکات کی ترویج اور نشر و اشاعت کے لئے کس فیاضی اور سیر چشمی سے کام لیا ہے اس کی تفصیل کا علم تو ہمارے حیطۂ اختیار سے باہر ہے البتہ اجمالی طور پر جو کچھ پیش کیا جائیگا اس سے یہ روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گا کہ خسرو دکن کی ذاتی دلچسپی سے اُردو کا

مستقبل کتنا تابناک اور درخشندہ ہوگیا ہے۔

"تخت نشینی کے ساتھ ہی پہلے دو تین سال کے اندر حضرت جہاں پناہی نے شبلی نعمانی مرحوم کے لئے تین سو روپیہ ماہوار منظور فرمائی ترتیب آصف اللغات کے صلہ میں اور پانسو کا اضافہ کیا۔

۱۳۳۳ھ سے ۱۳۳۵ھ تک مدیر پیسہ اخبار لاہور کو سالانہ ایک ہزار تصانیف امیر خسرو کی طباعت کے لئے پندرہ ہزار، شفقت علی خاں شاہجہاں پوری کو دو سو روپیہ صلہ تصنیف، حبیب احمد خاں صاحب کو تصنیف کتب کے صلہ میں پانسو، عبدالرؤف صاحب شوق کو مثنوی مرقع رحمت کے لئے پانسو روپیہ یکمشت اور پانسو جلدوں کی خریدی کا حکم، فرید احمد صاحب عباسی کو بصلۂ تصنیف کتب پانسو،

اس کے بعد ۱۳۳۶ھ میں حسب ذیل امدادیں ہوئیں۔

عبدالرب صاحب کوکب کو رسالہ اتالیق کے لئے سالانہ ایک ہزار دو سو پچیس، محب الحق صاحب بانکی پور کو تصانیف کے صلہ میں پانسو یکمشت اور پچاس روپیہ ماہوار عبدالوہاب صاحب عندلیب کو حمایت الاخلاق کے صلہ میں چار سو یکمشت اور پچاس ماہوار عبداللہ خاں صاحب کی کتابوں کے لئے پانسو یکمشت۔ سید یٰسین علی صاحب مصنف تفسیر کو پچاس ماہوار، سید محمد حسین صاحب موہانی کو تصانیف کے صلہ میں پچاس ماہوار، مولوی عبدالحلیم شرر کو پانسو ماہوار، ظفر علی خاں صاحب کو ماہانہ چھ سو اور ان کے لڑکے اختر علی کو ماہانہ دو سو (تاکہ اپنے والد کی تصنیف و تالیف میں مدد دیں) عبداللہ خاں صاحب کمنڈوی ایڈیٹر اسلامک ورلڈ بمبئی کو دو سو ماہوار شفیع الدین صاحب عارف کو قطعہ تاریخ عدالت العالیہ حیدرآباد کے صلہ میں پچاس روپیہ ماہوار اور انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد کو وضع اصطلاحات کے لئے سالانہ تین ہزار،

۱۳۳۸ھ میں سید مختار احمد صاحب کو "قاموس الجغرافی" کے لئے اخراجات طبع اور سو روپیہ ماہوار، عبدالماجد صاحب دریابادی مدیر رسالہ صدق کو ایک سو پچیس روپیہ ماہوار، سجاد مرزا بیگ پروفیسر نظام کالج کی کتابوں کے لئے (اصحاب) یکمشت اور دو سو ماہوار، عبداللہ خاں صاحب (کتب خانہ آصفیہ) کے نام پچاس ماہوار، کتاب سیرۃ النبی مصنفہ شبلی نعمانی

مرحوم کی تکمیل کے لئے دو سو ماہوار، کتاب رشک قمر کی خریداری کے لئے پچاس روپئے ماہوار، سید منظر علی صاحب اشہر مصنف "اعظم الاخلاق" و اصول تعلیم کو پچاس روپئے ماہوار، عصمت النسا بیگم صاحبہ مولفہ کتاب "تحفہ عثمانی" کو پچاس ماہوار۔ حکیم غلام احمد صاحب کو حمایت ساگر واقع حیدرآباد کی تاریخ کے صلہ میں سوا سو روپئے منصب۔

۱۳۴۷ھ میں میر قاسم علی مولف کو مفتاح الحدیث کے سلسلہ میں پچیس روپئے ماہوار، پروفیسر عبدالحی صاحب (دارالعلوم) کو کتاب المحاورات کے لئے دو سو، خواجہ حسن نظامی صاحب کو دو سو۔ محمد عبدالباری صاحب بھوپالی مولف حاشیہ "تفسیر مدارک" کو پچاس ماہوار، سید قاسم صاحب مصنف "رہنمائے حرمین الشریفین" کو بیس ماہوار، مرزا نظام شاہ لبیب کو پچاس ماہوار، لکھنو کے مشہور سوزخواں منجھو کو پچاس، سید سلیمان صاحب ندوی کو دو سو وظیفہ ماہانہ سید امجد صاحب کو تالیف و تصنیف کے سلسلہ میں پچاس روپئے ماہوار، ان کے علاوہ رسالہ القریش کو پانسو روپیہ یکمشت اور دو سو ماہوار، دارالمصنفین اعظم گڈھ کے نام دو سو ماہوار اور اُردو گشتی کتب خانہ کو یکمشت پانچ ہزار جاری کرنے کے احکام صادر ہوئے۔

۱۳۴۵ھ میں نواب حیدر یار جنگ بہادر نظم طباطبائی کو اُردو ترجمہ "تاریخ طبری" کا انعام (اعـ...) خریدی مجلہ عثمانیہ کے لئے ال‌للعہ کی منظوری، صبح دکن حیدرآباد کے پچاس پرچے خریدنے کا اور ایک سال کے لئے الـعہ قیمت کی منظوری، اخبار صحیفہ حیدرآباد کی ڈھائی سو کاپیوں کی خریدی کا حکم، کتاب عروس الادب کے تین سو نسخے بحساب فی جلد تین روپئے چھ آنے اور رسالہ ارشاد سید یوسف الدین قادری کی پانسو جلدیں بحساب فی جلد تین روپیے چار آنے خرید نے کا حکم صادر کیا گیا۔ رسالہ معیار الاوقات صلوٰۃ ماہ صیام کی طباعت کے لئے یکمشت دو ہزار عنایت کئے گئے۔ ملا محمد واحدی صاحب اڈیٹر نظام المشائخ کو پچیس روپیے ماہوار جاری کی گئی۔

۱۳۵۰ھ میں کتاب "مرقع سررشتہ ٹپہ" مصنفہ محمد سلطان الدین خانصاحب کی تین سو ساٹھ کاپیاں، مقامی پانچ اخباروں صحیفہ، مشیر، رہبر، صبح دکن، منشور کی پچاس پچاس کاپیاں، حیدرآباد ٹیچر کی چار سو تاسی کاپیاں، اخبار صبح دکن اور دکن پنچ کے سالانہ نمبروں کی ایک ایک ہزار

کاپیاں خریدنے کے لئے حکم صادر ہوا۔ کتب خانہ حیدر آباد ٹیچرس اسوسی ایشن کو یکمشت ایک ہزار اور ماہانہ پندرہ روپیہ اور قاری عبد الکریم صاحب کو نستعلیق اُردو ٹائپ کی تیاری کے صلہ میں یکمشت چار ہزار روپیے مرحمت کئے گئے۔

ماہواروں، منصبوں اور وظائف کی نسبت یہ معلومات سطحی اور نامکمل ہیں۔ اعلیحضرت کا فیض جاری و غیر محدود ہے۔ یہ نامکمل مواد صرف علاقہ دیوانی کی ماہواروں وغیرہ سے متعلق تھا۔ اس کے علاوہ صرف خاص سے بھی امداد اور وظائف سے سرفراز کیا جاتا ہے“۔

اس تفصیل سے آپ کو اندازہ ہوا ہوگا کہ سلطان العلوم آصف جاہ سابع نے اُردو کی ترقی کے لئے کیسے کیسے سامان مہیا کردئے اور مصنفین و مولفین کی کتابوں کی اشاعت اور طباعت کے لئے کتنی سہولتیں پیدا کردیں۔ نیز ان کو اس طرح سے نوازکران کو کس بےفکری سے اردو کی خدمت گزاری میں سرگرم کار کیا۔

محولہ بالا اشخاص کے علاوہ اور بھی ایسے ادیب اور شاعر ہیں جو دربار عثمانی سے متعلق رہے ہیں۔ ان میں مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنۃ نواب صادق جنگ مرحوم نواب فصاحت جنگ، نواب حیدر یار جنگ مرحوم نواب ضیا یار جنگ، نواب اختر یار جنگ وغیرہ بہت زیادہ ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان مقربین شعرا اور ادیبوں کے علاوہ مولوی عبدالحق سید خورشید علی، رائے مانک راؤ وٹھل راؤ، راجہ راجیشور راؤ اصغر، ضامن کنتوری، عمریافعی، سردار علی، نصیر الدین ہاشمی، علی اصغر بلگرامی، عبدالرزاق بسمل آغا حیدر حسن، غلام محی الدین زور عظمت اللہ خاں مرحوم، قاضی عبدالغفار، میر خاں شیدا احمد، ابوالخیر خیر اللہ، ج نقوی، بیگم صغرا ہمایوں مرزا، حسین احمد بیگ، ڈاکٹر میر ولی الدین جعفر حسن، ضیاء الدین انصاری، محمد نذیر الدین، محمد عبدالستار، عبدالقادر سروری، سید محمد، شیخ چاند، وقار احمد، حبیب اللہ رشدی، معین الدین قریشی، حسن الدین، اکبر وفا قانی، عبدالرحمن رئیس ہوش بلگرامی وغیرہ جیسے انشاپرداز اور ادیب اور کیفی، توفیق، ذہین، ولا، امجد، صفی، عزیز، اطہر، صغیر، تشنہ، آزاد انصاری، محمد حسین آزاد، عابد، شہرت، صدق جائسی، فانی، بدایونی، بدر، امیر، نوری، اختر، باغ، ذکی، اشک، تاثر، شمیم، زیبا، میکش، جیسے شعرا فرحت اللہ بیگ، تمکین، کاظمی، ناکارہ جیسے مذاح نویس

اور ظرافت نگار، عصمت اللہ بیگ، مرزا محی الدین بیگ، فضل الرحمٰن، عزیز احمد، میر حسن، ظفر الحسن، مخدوم محی الدین سرفراز علی ہیوش جیسے ڈرامہ نویس، جی شنکر راؤ، محشر عابدی، شبیر حسن قیسیؔ بادشاہ حسن جیسے افسانہ نویس، حکیم شمس اللہ قادری، سید احمد اللہ قادری، عبدالمجید صدیقی، محمود علی رہبر فاروقی، سراج الدین طالب جیسے محقق اور تاریخی انشا پرداز اُردو کی بے ریا خدمت گذاری میں مصروف ہیں اور ان میں سے ہر ایک نے اپنی تصانیف و تالیف کے ذریعہ اُردو کو زندہ جاوید بنادیا ہے۔

تخت نشینی کے بعد جب اعلیٰحضرت کی علمی سرپرستی اور ادبی قدردانی کا احساس ہوا تو دارالعلوم میں ایک انجمن کا قیام عمل میں آیا جس کے چند مقاصد یہ تھے۔

(۱) دارالعلوم کو یونیورسٹی کے درجہ پر پہونچانا۔

(۲) علمی سوسائٹی قائم کرنا۔

(۳) "سلسلہ تالیفات اردو" کا آغاز کرنا۔

چنانچہ یہ انجمن اپنے جملہ مقاصد میں کامیاب ہوئی۔ اور جس سال دارالعلوم کی ساٹھ سالہ جوبلی منائی گئی حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی بنا بھی ڈال دی گئی جس کی تمام تر کوششیں اُردو زبان کی ترقی واشاعت کے لئے وقف تھیں اور جس کا عملی نتیجہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ اس کانفرنس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ جملہ کارروائی اُردو میں عمل میں لائی گئی حتی کہ بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو اور پروفیسر ولنکر نے بھی اُردو میں تقریریں کیں۔ کانفرنس نے اپنے دوسرے اجلاسوں میں سائنس، طب، انجینرنگ، صنعت وحرفت کی تعلیم کے لئے بھی اُردو کی سفارش کی جس کو شرف قبولیت بخشا گیا۔

اس انجمن کے علاوہ انجمن ثمرۃ الادب، انجمن اسلامیہ، انجمن ارباب اُردو، مکتبہ ابراہیمیہ، مجلس علمیہ، بزم اُردو نظام کالج، لٹریری اکیڈیمی، انجمن طیلسانین عثمانیہ، انجمن طلبائے قدیم سٹی کالج، انجمن ترقی ڈرامہ، بزم تمثیل نے اپنے اپنے مقالہ جات تقاریر اور اشاعتوں کے ذریعہ اُردو کی عظیم خدمات انجام دی ہیں۔

مجلس اشاعتہ العلوم جس کے بانی مولوی انوار اللہ صاحب فضیلت جنگ بہادر تھے۔

پانچ چھ ہزار صفحوں کی ۵۰۲ کتابیں جو فلسفہ وحکمت، اصول وعقائد، حدیث وتفسیر، قانون وفقہ پر تھیں تصنیف فرماکر اردو زبان پر احسان عظیم کیا ہے۔

مذکورہ بالا انجمنوں کے مقابلہ میں انجمن ترقی اُردو عہد عثمانی کے بذل وکرم سے بہت زیادہ مستفید ہوئی ہے۔ اگرچیکہ اس کی تاسیس ۱۹۰۳ میں عمل میں آئی تھی لیکن اس پر جو جمود وخمود طاری تھا وہ اعلیحضرت کی تخت نشینی کے بعد ہی دور ہوسکا اور جب ہی اس کی خوابیدہ قوتیں بیدار ہوسکیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ انجمن مولوی عبدالحق صاحب کی جانفشانی اور ثابت قدمی کی مرہون منت ہے لیکن اگر اعلیحضرت انجمن کی مستقل سالانہ امداد منظور نہ فرماتے اور موقع بہ موقع دیگر قیمتی منظوریاں صادر نہ کرتے تو یہ کبھی کی صفحہ ہستی سے ناپید ہوچکی ہوتی۔ حضرت بندگان عالی نے ۱۹۱۶ میں پانچ ہزار کی اور اس کے دوسرے سال اصطلاحات علمیہ کی لُغت کی تیاری کے لئے تین سال تک تین ہزار روپیے کی امداد منظور فرمائی۔ نیز اس کی کتب اور رسائل خرید فرماکر اس کی سالانہ آمدنی کو ۲۳ ہزار تک پہونچادیا۔ ان منظوریوں کے علاوہ شاہ ذی جاہ نے مزید بارہ ہزار روپیے سالانہ کی گراں قدر رقم کی منظوری دس سال کے لئے اُردو کی بسوط لغت کی تیاری کیلئے صادر فرمائی ہے۔ اس وقت تک انجمن نے ۸۰ سے زیادہ کتب شائع کی ہیں جن میں تاریخ ادب اُردو، کمیاب تذکرے اور تراجم شامل ہیں دو سہ ماہی رسالے اردو اور سائنس بھی شائع کرتی ہے جو اپنی اپنی جگہ پر برابر اردو زبان وادب کے خزانہ میں بیش بہا اضافہ کررہے ہیں۔

حضرت سلطان العلوم کی تخت نشینی کے وقت صرف چار یا پانچ اخبار ورسائل جاری تھے لیکن ذات شاہانہ نے جب اس طرف توجہ مبذول فرمائی اور اپنے قلم مُبارک سے راست علمی وتنقیدی تبصرے اشاعت کے لئے اخباروں کو روانہ کرنے شروع کئے تو ملک میں ان سے ایک گونہ دلچسپی پیدا ہوگئی۔ مشیر دکن، دکن لارپورٹ، آصفیہ گزٹ اور ادیب الاطفال حضور کی تخت نشینی کے وقت موجود تھے۔ تخت نشینی کے بعد گلدستہ نادر، شاہد سخن، دربار، عثمان گزٹ، معارف، تاج، تزک عثمانیہ، رہبر مزارعین، ذخیرہ، صحیفہ، افادہ، المعالج، نظائر، وقائع، اتالیق، ثمرۃ الادب، شعلہ، دوست، رہبر، نونہال، ترقی، المعلم، النور، سائنس کی صدا، صراط المستقیم، ارتقا، تحفہ، نظام کالج میگزین، مجلہ عثمانیہ، حیدرآباد ٹیچر، کورا،

کشافہ، ہمجولی، تجلی، آئین دکن، رعیت، دکن پنچ، دکن گزٹ، صبح دکن، منشور، مجلہ مکتبہ، ورزش جسمانی، تاریخ، شباب، سفینہ، خلیق، ترجمان القرآن، حسن کار، مجلہ تحقیقات علیہ کلیہ جامعہ عثمانیہ، پیام، وقت، الموسیٰ، شائع ہونا شروع ہوئے، لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جس خوش خوشی سے اس ربع صدی میں ان اخبارات ورسائل نے جنم لیا تھا ان میں کی ایک کثیر تعداد عوام کی بے توجہی کی بھینٹ چڑھ گئی۔

عہد عثمانی کا سب سے درخشندہ کارنامہ جس نے اردو زبان کی بنیادوں کو ہمیشہ کے لئے مستحکم کر دیا اور اس کو شاہ راہ ترقی پر گامزن کر دیا وہ جامعہ عثمانیہ کا قیام ہے۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان پر جو سیاسی، معاشی نت نئی مصیبتیں ٹوٹیں اور بپتا پڑی اس کے فقط خیال ہی سے کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے زمانہ میں جبکہ جان ہی کے لالے پڑے تھے تعلیم و تعلم کو کون پوچھتا تھا۔ لیکن نہیں۔ جب لارڈ میکالے نے اس کا ذکر چھیڑا تو بڑے بوڑھے خاموش نہ رہے اور برابر اپنی قدیم تعلیم کے دلانے پر اڑے رہے۔ لیکن میکالے کی سحر طرازی کے سامنے کسی کی کچھ نہ چلی اور انگریزی کا دَور دورہ ہوگیا۔ ایک غیر زبان ہونے کی حیثیت سے اس نے ہم کو اصطلاحی مشکلات اور محاوروں کے پھیر میں سرگرداں رکھا۔ ہماری جدت، اصابت رائے، روشن خیالی سب غائب غلہ ہوگئی اور جودت طبع لسانی الجھنوں کے ادا کرنے میں خود الجھہ گئی۔ اگر کوئی اس "ڈانٹے کے جہنم" کو پار کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتا اور محمد علی بنتا تو فطرت کی ستم ظریفی سے ہم سے جلد ہی رخصت ہو جاتا۔ غرض جب اس تحصیل علم سے ہماری حالت نہ سنبھلی، ہماری دماغی اور روحانی ضرورتیں پوری نہ ہوئیں، قوائے عقلی نے جواب دینا شروع کیا تو سرزمین جاپان کے نامور کونٹ اوکوما کی سی ایک لاثانی ہستی نے جنم لیا۔ اس کی امیدیں شاہ جم جاہ کی نوازشوں سے جب پھلی پھولیں تو افق ہندوستان پر جامعہ عثمانیہ بن کر چمکیں۔ غرض وہ دن اور آج کا دن ہندوستان کے طول و عرض میں اسی جامعہ کا جس میں نئے اور پرانے علوم و فنون کا امتزاج کر دیا گیا ہے۔ طوطی بول رہا ہے اور بڑے بڑے فرعونوں نے اس موسیٰ کے سامنے سرتسلیم خم کر دیا ہے۔

دارالترجمہ جو امیر کبیر نواب فخر الدین خاں بہادر شمس الامراء ثانی کے عہد میں چھوٹے پیمانہ پر

لیکن گراں قدر کام انجام دے رہا تھا اس کا الحاق جامعہ عثمانیہ سے کردیا گیا۔ دارالترجمہ کے تراجم کی آبیاری سے نخل امید سرسبز اور شاداب ہوا، تعلیم کی خامیاں دور ہوئیں اور جسم و دماغ کے ساتھ روحانی تربیت کی امید بندھی۔ خلفائے عباسیہ اور اموریہ کے عہد حکومت میں صرف یونانی عبرانی اور سنسکرت کے ترجمے ہوئے مگر دربار آصفی میں انگریزی، فارسی، عربی، تراجم و تعلیم کے انمول موتی لٹنے لگے۔ ذیل کی تفصیل سے معلوم ہوگا کہ مامون رشید اور یحییٰ اور خالد برمکی کی فیاضیاں حضرت ظل سبحانی سلطان العلوم کی داد و دہش کے مقابلہ میں پاسنگ بھی نہیں اور اُن کی وہی حیثیت ہے جو ذرہ اور آفتاب کی ہے۔

(۱) دفتر سجل	۲۱،۶۵۷ روپیہ	(۱۰) گلبرگہ کالج۔	۳۴،۴۹۶
(۲) کلیہ جامعہ عثمانیہ	۷،۵۶،۹۲۹	(۱۱) دارالترجمہ	۲،۶۱،۴۱۵
(۳) کلیہ اناث	۳۳،۹۰۰	(۱۲) دارالطبع جامعہ عثمانیہ	۱،۵۰،۱۰۲
(۴) میڈیکل کالج	۱،۸۶،۰۸۶	(۱۳) رصدگاہ نظامیہ	۳۶،۱۶۴
(۵) ٹریننگ کالج	۲۵،۹۶۰	(۱۴) وظائف	۱،۳۵،۲۴۸
(۶) انجینیرنگ کالج	۲،۵۰،۰۰۵	(۱۵) محفوظ۔	۲۹،۸۱۵
(۷) سٹی کالج۔	۵۹،۷۱۵	(۱۶) بچت	۷،۳۱،۷۱۳
(۸) اورنگ آباد کالج	۵۳،۸۲۶	(۱۷) امدادی۔	۷،۶۵۷
(۹) ورنگل کالج	۳۳،۵۶۰		

جملہ ۲۹،۰۸،۱۷۶ روپیہ سکہ عثمانیہ سالانہ

سنہ ۱۹۳۲ء تک دارالترجمہ میں ۳۵۸ کتابیں تیار ہوئیں جن میں سے تاریخ ہند پر ۴۹ تاریخ انگلستان و یورپ وغیرہ پر ۳۶ تاریخ اسلام پر ۲۶ جغرافیہ پر ۵ سیاسیات پر ۳ دستور انگلستان پر ۴ معاشیات پر ۱۳ عمرانیات پر ۲ فلسفہ پر ۶ منطق پر ۶ مابعدالطبعیات پر ۲ نفسیات پر ۱۱ اخلاقیات پر ۱۱ ریاضیات پر ۲۲ طبعیات پر ۲۳ حیاتیات پر ۵ کیمیا پر ۸ طب پر ۳۳۔ انجینیری پر ۴۰ اور مختلف موضوعوں پر ۴ کتابیں لکھی گئیں۔ اس کے علاوہ فن تعلیم پر ٹریننگ کالج اور نظامت تعلیمات کی جانب سے ایک درجن سے زیادہ تراجم شائع ہوئے ہیں جو

اپنی نوعیت کی اُردو دنیا میں واحد کتابیں ہیں اور ملک کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کرتی ہیں
...... یہ فہرست صرف اُن کتب کی تھی جو سرکاری طور پر شائع ہوئی ہیں اگر اس میں ان
تمام کتب کو شامل کرلیا جائے جو اس مُبارک ربع صدی کے دوراں میں منصۂ شہود پر جلوہ گر
ہوئیں تو ان کی تعداد چار ہزار سے بھی متجاوز ہو جاتی ہے۔

متذکرۂ صدر واقعات کے مطالعہ کے بعد ہمیں امید ہے کہ یہ حقیقت آپ پر منکشف
ہو گئی ہو گی کہ اعلیٰحضرت قدرقدرت میر عثمان علیخان خلد اللہ ملکہ وسلطنتہٗ کی ذات بابرکات
کو اُردو سے کتنا شغف ہے اور وہ اس کی ترقی واشاعت میں کتنی ممکنہ سعی فرماتے ہیں۔
موجودہ کساد بازاری اور اقتصادی پستی کے زمانہ میں بھی جبکہ ہر ملک کے مالیہ کا توازن بگڑ گیا
ہے شاہ ذی جاہ بڑی سے بڑی منظوری دینے سے دریغ نہیں فرماتے۔ خوش قسمت ہیں
اہل دکن کہ ان کو ایسا بیدار مغز، صاحب الرائے روشن خیال تاجدار ملا۔ خوش بخت ہے
حیدرآباد کہ اسکو ایسا صاحب فطنت، دُور رس اور مدبر فرمانروا نصیب ہوا۔

حضرت بندگان عالی کی ذات گرامی دکن کے لئے وہی حیثیت رکھتی ہے جو ہٹلر کی
جرمنی کے لئے، مسولینی کی اٹلی کے لئے، مصطفےٰ کمال کی ٹرکی کے لئے، رضا شاہ کی ایران
کے لئے ہے۔ حضور اقدس و اعلیٰ کی ساری زندگی ملک و تاج کے گم شدہ نگینوں کے حصول
کی ایک مسلسل کوشش ہے۔ خدا کرے کہ برار کی طرح خسرو ذی شان کی دیگر مساعی بھی مشکور
ہوں اور جملہ نگینے زیب اکلیل شاہی ہوں۔

الٰہی رشتۂ عمر طویل آصف سابع
دراز از شاخ طوبیٰ محکم از حبل المتین باشد
فلک تا ہست بالائے زمین قائم ترا عثمان
ظفر در قبضہ و ملک جہاں زیر نگیں باشد
آمین

تعلیمات سلطنت آصفیہ
کی
ابتدائی تاریخ

مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب حیدر آبادی

عصر حاضر میں تاریخ نویسی کا اصلی مدعا کسی قوم یا ملک کے تمدنی یا تہذیبی پہلوؤں کو روشنی میں لانا قرار پایا ہے، مغربی قوموں نے اپنی تاریخ اس قالب میں پوری کامیابی سے ڈھال لی ہے، لیکن مشرقی ممالک کی قدیم کتابیں جن میں ان امور پر روشنی ڈالی گئی تھی ناپید ہو چکی ہیں، بعد کے زمانہ میں تاریخ زیادہ تر بادشاہوں کی ہنگامہ آرائیوں کے محور پر گھوم کر رہ گئی اب جبکہ جدید مغربی خیالات سے متاثر ہو کر ہم اپنے ملک کے تمدن و تہذیب کے اصلی اور ابتدائی بنیادوں کا پتہ چلانے کی کوشش کرتے ہیں تو راستہ کی تاریکی اور راہ کی صعوبت تھکا دیتی ہے۔

دکن کی گذشتہ حکومتوں کے زمانہ کو چھوڑ کر خود سلطنت آصفیہ کے عہد کو دیکھئے عام واقعاتی تاریخ خود اب تک مستند طریقہ سے نہیں لکھی جا سکی ہے، تمدنی اور تہذیبی تاریخ کا کیا ذکر، اس جانب توجہ کی بہت شدید ضرورت ہے، قدیم حالات سے واقف اصحاب جلد جلد اپنا دور ختم کرتے جاتے ہیں، ان کے ذاتی اور سینہ بسینہ چلے آنے والے حالات

بہ عجلت ممکنہ قلمبند نہ ہو جائیں تو ہماری تاریخ کو بہت نقصان اٹھانا پڑے گا، بہر حال اس تحریر کے ذریعہ اس قسم کی کوشش کی جانب قدم اٹھایا جاتا ہے۔

ارشاد نبی صلعم "طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم" کے تحت ہر مسلم حکومت نے یہ کوشش کی کہ اس کی جانب سے نشر و اشاعت تعلیم کا بھی پورا حق ادا ہو، رعایا کو اس نعمت سے مستفید کرنے کے ذرائع پوری فراخ دلی سے کئے جاتے رہے، اسلامی ممالک میں خواہ وہ عربوں کی حکومت کے تحت ہوں یا ترکوں کے مغلوں کے تحت ہوں یا افغانوں کے، تعلیم کسی نہ کسی طریقہ سے رائج رہی، اور حکومت کی جانب سے اہل علم کی واجبی سرپرستی برابر ہوتی رہی،

تاریخ کے صفحات پر صدہا اسلامی درسگاہوں کے نام سنہرے حروف میں نظر آتے ہیں، ان کی صرف فہرست طویل صفحات کی متقاضی ہے، حجاز، عراق، مصر، اسپین، ایران، ہندوستان کے قطع نظر خود دکن میں بھی ایسی درسگاہیں قائم تھیں جو تشنہ گان علم کے لئے آب حیات بنی ہوئی تھیں؛ بیدر کا مدرسہ محمود گاوان جس کے کھنڈر اب تک اپنے بانی کا نام زندہ رکھے ہوئے ہیں، نہ صرف دکن کا بلکہ ہندوستان کا ایک عظیم الشان مدرسہ تھا، اس کے فیض سے دُور دُور تک کے طلبہ مستفید ہوتے تھے، مدتوں تک یہ مدرسہ ہندو دکن اور عرب و عجم کے طلبہ کا سنگم بنا رہا۔

سلاطین قطب شاہی کو علم و فن سے خاص دلچسپی تھی ان کے کئی حکمران نہ صرف خود زیور علم سے آراستہ تھے بلکہ ان کو اپنی رعایا کی علمی ترقی کا بھی بڑا خیال دامن گیر تھا، اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ سلطان ابراہیم کے زمانہ میں بیسیوں مدرسے تعمیر ہوئے تھے۔[1]

سلطان ابراہیم کا جانشین محمد قلی قطب شاہ نے بھی علم و فن کی سرپرستی کے لحاظ سے زندگی جاوید حاصل کی ہے، سلطان کی داد و دہش اور قدردانی علم و فن کا شہرہ سنکر عرب عجم سے علماء و فضلاء، شعراء اور ادیب دربار میں آتے اور بادشاہ کی فیاضی سے بہرہ اندوز ہوتے تھے، اس کے زمانہ میں بھی کثرت سے مدرسے تیار ہوئے، اسی نے شہر حیدرآباد کو

[1] تاریخ قطب شاہی مخطوطہ انڈیا آفس صفحہ ۱۳۸ و ۱۷۰

آباد کیا، جامع مسجد بنائی تو مسجد کے ساتھ مدرسہ اور طلبہ کے رہنے کے لئے حجرے بھی بنائے چار مینار بھی دراصل ایک مدرسہ ہی تھا جو اسی سلطان کی یادگار ہے[۱]

سلطان محمد قلی کا جانشین سلطان محمد قطب شاہ کا نام مکہ مسجد کے تہجد گزار بانی کی حیثیت سے کبھی فراموش نہیں ہو سکتا،

سلطان محمد کو علم و فن سے بھی گہری دلچسپی تھی اس کا دربار بالاکثر ایک علمی مجلس کی صورت میں بدل جایا کرتا تھا، جہاں علوم عقلی و نقلی پر بحث و مباحثہ ہوتا، اور خود سلطان کی بحث و تنقید ہر طرف سے خراج تحسین حاصل کرتی، ایسے علم دوست اور ادب پرور سلطان نے علم و فن کی ترویج کے لئے کیا کیا نہ کیا ہوگا جس کی صراحت موجب طوالت ہے،

سلطان محمد کا جانشین عبداللہ قطب شاہ نے بھی اپنے باپ دادا کی طرح قدردانی کی روایات برابر قائم رکھے، برہان قاطع نعت اس کے نام پر معنون ہوا ہے، سلطان عبداللہ کے زمانہ میں خود امراء و ارکان سلطنت نے بھی بذات خود درس و تدریس کا سلسلہ قائم رکھا تھا، چنانچہ نواب علامی جو میر جملہ گی کی خدمت سے سرفراز تھے، خود درس دیا کرتے اس کے متعلق مولف حدیقۃ السلاطین نے لکھا کہ نواب علامی نے باوجود کثرت کار اور مشاغل مہمات سلطنت ہر روز صبح درس دینے کا شغل جاری رکھا تھا، علماء و فضلا شعراء اور طالبان علم کثرت سے جمع ہوتے علوم منقول، تفسیر، حدیث فقہ کے ساتھ حکمت اور ریاضی و منطق کا درس ہوتا تھا۔

دکن میں قطب شاہی سلطنت کے بعد مغلیہ دور میں بھی تعلیمات کی جانب برابر توجہ رہی، مدرسہ محمود گاوان کے دروازے تشنہ گان علم کے لئے کھلے ہوئے تھے، مولانا محمد حسین الملقب بہ امام المدرسین آخری صدر مدرسہ تھے، بجلی کے گرنے سے عمارت مدرسہ جب منہدم ہوئی انہوں نے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی[۲]

(ا)

سلطنت آصفیہ کی بنیاد ۱۱۳۶ھ میں رکھی گئی، حضرت آصف جاہ اول نے زمام حکومت

۱۔ تاریخ قطب شاہی مخطوطہ انڈیا آفس ص ۱۷۷، ۱۳۰ ۲۔ تاریخ احمدی مخطوطہ، خافی خاں۔

ہاتھ میں لینے کے ساتھ ہی جہاں سلطنت وحکومت کو مستحکم کرنے کے تدابیر عمل میں لائے وہاں دیگرانتظامات سے قطع نظر تعلیمات کی جانب بھی پوری توجہ مبذول کی۔

واضح ہو کہ سلطنت آصفیہ میں نشر واشاعت تعلیم کے لئے جو ادارے قائم ہوئے ان کی نوعیت دو طرح کی تھی، ایک وہ مدرسے جو سرکاری طور پر قائم تھے اوران مدارس کے اخراجات شاہی خزانہ سے ادا ہوتے تھے، ان مدارس کی اعلیٰ نگرانی صدر الصدور کے سپرد تھی، ان مدارس کے مدرسین کا تقرر اعلیحضرت یا دیوان وقت کی منظوری کا محتاج تھا،

دوسرے وہ مدرسے جو امرار ملک وغیرہ کے قائم کردہ تھے، جس کے اخراجات کا بار خود ہی امرا اٹھایا کرتے تھے۔

ان مدارس کے علاوہ علمار وفضلار حافظ قران، خوش نویس وغیرہ علیحدہ تھے، جو اپنی طور پر درس دیا کرتے تھے، طالبان علم اور شائقین فن ان کے مکانوں اور مسجدوں اور خانقاہوں میں ان کے فیض سے فیضیاب ہوتے، ان میں سے اکثر وبیشتر کو سرکار سے امداد یومیئے اور روزینے مقرر تھے، تاکہ یہ لوگ فکر معاش سے مستغنی ہو کر اپنی علمی خدمت کی بجاآوری میں مصروف رہیں۔

اس موقع پر جن مدارس کا پتہ چلتا ہے ان کی صراحت کی جاتی ہے۔

(۱) دفتر دیوانی ومال سرکار عالی کے کاغذات سے ثابت ہے کہ مقبرہ رابعہ درانی اورنگ آباد میں ایک مدرسہ تھا جس کا قیام ۱۱۲۵ھ کے پہلے مغلیہ عہد میں ہوا تھا۔ اور ایک بڑی جاگیر مدرسہ کے اخراجات کے لئے دی گئی تھی، سلطنت آصفیہ کے ابتدائی عہد میں یہ مدرسہ بدستور قائم رہا اوراس کے اخراجات کی جاگیر بحال تھی، اس مدرسہ کے صدر شیخ السلام خاں تھے، ایک زمانہ دراز تک یہ مدرسہ قائم تھا، اور درس وتدریس کا سلسلہ جاری تھا۔[۱]

(۲) مدرسہ فاروقیہ کے نام سے حضرت آصف جاہ نے اورنگ آباد میں ایک جدید مدرسہ قائم کیا، اس کا قیام کس سنہ میں ہوا، اس سے ہم واقف نہیں ہیں مگر یہ مدرسہ عرصہ دراز

---

[۱] کاغذات دفتر دیوانی ومال۔

تک قائم رہا اور اس مرکز علم و فن سے بیسیوں تشنگان علم نے فیض پایا ہے[۱]،

(۳) مدرسہ[۲] حیدرآباد، اس مدرسہ کی ابتدا بھی حضرت آصف جاہ اول کے زمانہ میں ہوئی۔ ۱۱۵۶ھ مطابق ۱۷۴۴ء میں اس کا قائم ہونا ممکن ہے ۱۲۱۷ھ کے بعد بھی یہ مدرسہ قائم رہا اس کے دو مدرس تھے، جو مدرس اول اور دوم کے لقب سے موسوم تھے، مدرس اول کو (۳) ماہوار اور مدرس دوم کو (۲) ماہوار ملا کرتی تھی،

اگرچہ یہ ماہوارہ آج کل کے لحاظ سے کوئی حیثیت نہیں رکھتی مگر اس زمانہ کے معیار زر کے لحاظ سے آج کل کے چار پانچ سو سے کم نہیں تھی،

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ مدرسہ صدر الصدور کی نگرانی میں تھا، مگر مدرسین کے تقرر و تبدل کا ان کو اختیار نہیں تھا، بلکہ خود اعلیٰ حضرت یا دیوان کی منظوری ضروری تھی،

اس کے محل وقوع اور نیز دوسرے ضروری امور کا کوئی علم ہمیں نہیں ہے، اس مدرسہ کے جن مدرسین کے نام ہم کو معلوم ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) مولوی قطب عالم، آپ مدرسہ حیدرآباد کے پہلے مدرس تھے، مدرس اول کی خدمت پر مامور تھے، ۱۱۶۵ھ کے بعد آپ کا انتقال ہوا۔

(۲) مولوی حافظ عبدالغفور، سید قطب عالم کے مرنے پر آپ کا تقرر نواب صلابت جنگ نے فرمایا تھا، ۱۱۷۹ھ تک یہ اپنی خدمت پر مامور تھے۔

(۳) حافظ عبدالغفور کے بعد ان کے لڑکے میر قدرت اللہ ۱۱۷۹ھ میں مامور ہوئے

(۴ تا ۶) پھر مولوی محمد سلیم کا تقرر ۱۱۹۹ھ میں آصف جاہ ثانی نے فرمایا ان کے بعد محمد یوسف مامور ہوئے۔ محمد یوسف نے منصب قضا پر ترقی پائی تو سید محمد کا تقرر عمل میں آیا۔

(۷) ملا فرخ مدرسہ حیدرآباد کے مدرس دوم تھے، ۱۱۵۶ھ میں ان کا تقرر ہوا تھا۔

(۸ تا ۱۲) ملا فرخ کے بعد محمد وارث، ان کے بعد حافظ محمد مخاطب شریعت اللہ خاں ۱۱۷۰ھ میں مامور ہوئے، ان کے بعد مولوی چراغ علی اور پھر ان کے بعد ان کے لڑکے محمد تقی کا تقرر ہوا مگر انہوں نے جائزہ نہیں لیا اس لئے مولوی محمد برہان ۱۲۱۷ھ میں مامور ہوئے[۲]۔

---

[۱] تاریخ دار العلوم مرتبہ مولوی مرتضیٰ مرحوم۔ [۲] کاغذات دفتر دیوانی و مال۔

(۴) حضرت آصف جاہ ثانی (۱۱۷۵ھ، ۱۲۱۸ھ) کے زمانہ میں مختلف اضلاع اور قصبات کے بعض چھوٹے مدرسوں کا پتہ چلتا ہے، جہاں ایک ایک مدرس درس دیا کرتا اور سرکار سے اس کے نام یومیہ کی اجرائی ہوتی تھی، اسی قسم کے کئی مدارس تھے۔[1]

(۵) مدرسہ حسینہ ضلع میدک میں ٹیکمال ایک قدیم قصبہ ہے، جو زمانہ سابق میں ٹیک محل سے موسوم تھا، یہاں مدرسہ حسینہ ۱۲۴۲ھ میں قائم ہوا تھا، اس کے بانی سید صاحب حسینی بادشاہ قادری تھے۔

سید صاحب حسینی نے اپنی وفات تک جو ۱۲۹۷ھ میں ہوئی اس مدرسہ کو قائم رکھا تھا، ان کے بعد بھی ان کے فرزند کی زندگی میں یہ مدرسہ موجود تھا، ۱۳۲۵ھ میں ان کے انتقال پر مدرسہ بند ہو گیا۔

سید صاحب حسینی کے والد سید شاہ عبدالرزاق قادری تھے، یہ ایک متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے، ان کو حضرت سید محمد معروف شاہد اللہ قدس سرہ سے نہ صرف بیعت حاصل تھی بلکہ ان کے خلیفہ بھی تھے، شاہ معروف ایک صاحب باطن مقدس بزرگ تھے، جنہوں نے ٹیکمال میں اقامت کر لی تھی، تبلیغ دین اسلام آپ کا بڑا مشغلہ تھا ٹیکمال ہی میں آپ کا وصال ہوا، یہاں ہی مدفون ہیں، آج بھی آپ کی درگاہ مرجع خاص و عام ہے۔

سید صاحب حسینی کی پیدائش ۱۲۱۹ھ میں ہوئی، حیدرآباد میں انہوں نے تعلیم کی تکمیل کی، ۱۲۳۸ھ میں اپنے وطن ٹیکمال کو واپس ہوئے مسلمانوں کی عام علمی پستی خصوصاً دینیات سے بے خبری کے باعث آپ نے مدرسہ حسینہ قائم کیا تاکہ اس کے ذریعہ مسلمانوں کی مذہبی حالت کی اصلاح ہو اور اس کے ساتھ دینوی تعلیم بھی ہوتی رہے، چنانچہ اس وقت کی عام علمی حالت کے متعلق صاحب حسینی کے حسب ذیل الفاظ قابل توجہ ہیں!

"فی زمانہ در امصار این دیار مرض لاعلمی جوارح و اعصاب طالب شرافت را آں چناں معذور و مفلوج کردہ کہ نیز تا چندے بجانب اصلاح و تدابیر آں اگر توجہی مبذول کردہ نشود خوف است کہ در اندک زمانہ وجود علم و نام

---

[1] کاغذات دفتر دیوانی۔

انسانیت از صفحۂ گیتی محو گردد۔"

چنانچہ مدرسہ حسینیہ میں نہ صرف مذہبی دینی تعلیم ہوتی تھی بلکہ اس وقت کے ضروریات کے موافق دنیوی تعلیم کا بھی معقول انتظام تھا، مدرسہ کے ساتھ دارالاقامہ بھی تھا اس لئے تربیت کا خاص طور سے لحاظ رکھا جاتا تھا،

ایک زمانہ دراز تک حیدرآباد اور اضلاع کے دفاتر کے لئے عہدہ دار اور اہلکار کی دستیابی اسی مدرسہ کے ذریعہ ہوتی رہے چنانچہ نواب مختار الملک اول کے الفاظ قابل ملاحظہ ہیں :۔

"دریں قحط الرجال ایں قدر مردم باکمال از یک قصبہ بہم رسیدن موجب خوشنودی کمال است، وجود فیض آمود جناب باعث افتخار ملک وممنونی سرکار است۔"

اس مدرسہ کے بعض مشاہیر طلبہ حسب ذیل ہیں:۔

مولوی محمد صدیق المخاطب صدیق یار جنگ (معتمد پیشی نواب مختار الملک) حسن بن عبداللہ المخاطب عماد نواز جنگ (صدر محاسب) وحید منور خاں متہور الملک (معتمد صرف خاص) مقتدر جنگ، قادر نواز جنگ، مولوی یوسف الدین مرحوم سابق صوبہ دار وغیرہم۔

بیان کیا جاتا ہے کہ آخر الذکر تینوں اصحاب دارالعلوم سے فارغ ہونے کے بعد تربیت کے لئے سید صاحب حسینی کے مدرسہ کو روانہ کئے گئے تھے۔

اس مدرسہ میں نہ صرف حیدرآباد کے طلبہ تعلیم پاتے تھے بلکہ قلمرو آصفی کے باہر سے بھی طلبہ آتے اور سید صاحب حسینی کے فیض سے مستفید ہوتے تھے۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ اس مدرسہ کے ساتھ طلبہ کے قیام کا بھی انتظام تھا، خورد ونوش وغیرہ کا بار سید صاحب حسینی ہی برداشت کرتے تھے، مگر اس کے باوجود سید صاحب حسینی نے سرکار سے کوئی امداد نہیں لی، جملہ اخراجات خود خرچ کرتے تھے وہ خود ہی مدرسہ کے پرنسپل خود ہی مدرس اور خود ہی مودب ومہتمم تھے۔

صاحب حسینی کے فرزند سید احمد بادشاہ کے انتقال پر جو ۱۳۲۵ھ میں ہوئی مدرسہ حسینیہ

برخاست ہوگیا[۱]

(۶) مدرسہ شجاعیہ، یہ وہی مدرسہ ہے جو سلطان محمد قلی قطب شاہ کے زمانہ میں جامعہ مسجد حیدرآباد میں قائم ہوا تھا، آصفی عہد میں ۱۲۴۵ھ م ۱۸۳۰ء سے یہ مدرسہ اپنے روح رواں مولانا حافظ شجاع الدین کے نام پر مدرسہ شجاعیہ کے نام سے مشہور ہوگیا۔

مولانا شجاع الدین کے اجداد اکبری عہد میں ہندوستان آئے، آپ کے والد مولوی میر کریم اللہ خاں نے برہان پور میں اقامت اختیار کی اور یہاں کے سادات میں جو خواجہ ہاشم قدس اللہ سرہٗ کی اولاد سے تھے بیاہ کیا، سنہ ۱۱۸۰ھ میں مولوی شجاع الدین کی پیدائش ہوئی، آپ کی ولادت کے ایک سال بعد آپ کے والد کا انتقال ہوگیا۔

مولوی شجاع الدین نے برہان پور ہی میں اقامت اختیار کی اور علم کی تکمیل کی اس زمانہ میں برہان پور علماء و فضلاء کا مرکز تھا اس لئے مولانا کو کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں ہوئی، چھتیس سال کی عمر میں آپ حج و زیارت سے فارغ ہوکر سنہ ۱۲۱۶ھ میں حیدرآباد آئے، حضرت شاہ رفیع الدین قندھاری رحمہ سے بیعت تھی اور خلافت بھی حاصل ہوئی تھی۔

مولانا شجاع الدین نے پہلے پہل جامع مسجد کے مدرسہ کے ایک کمرہ میں اقامت اختیار کی اور طلبہ کو درس دینے لگے، اس زمانہ میں اس مدرسہ کی حالت نہایت ابتر تھی، مدرسہ کے صحن میں مغل صاحب ایک جاگیردار کے ہاتھی باندھے جاتے، ان کے دانے چارہ کا ذخیرہ مدرسہ کے حجروں میں رہتا تھا۔

مولانا کے علم و فضل کا جب حیدرآباد میں شہرہ ہوا اور اہل شہر آپ کے علمی فیض سے بہرہ اندوز ہونے لگے تو نواب شمس الامراء ثانی کو بھی آپ سے عقیدت ہوگئی، آپ مہاراجہ چندولال کے ساتھ مولانا سے ملنے گئے، مدرسہ کی حالت دیکھی تو جاگیردار صاحب کو فوراً صفائی کا حکم دیا، خود شمس الامراء نے اپنے صرفے سے مولانا اور طلبہ کے لئے کمرے درست کردئے (۱۲۴۵ھ ۱۸۳۰ء) اس کے بعد مدرسہ کی خوب شہرت ہوئی اطراف اور

---

[۱]:۔ اس مدرسہ کے حالات فرہنگ حسینی اور مولوی ابوالحسن صاحب قیصر سے معلوم کئے گئے ہیں۔

اکناف سے تشنگان علم آتے اور مولانا سے فیضیاب ہوتے تھے[۱]۔

(۷) انگریزی مشن کا مدرسہ ۱۸۳۵ء۔ ۱۸۳۵ء میں انگریزی مشن کی جانب سے ایک مدرسہ قائم ہوا، جو آج بھی سینٹ جورجز گرامر اسکول کے نام سے موسوم ہے، اس مدرسہ میں ابتدأً اردو اور انگریزی تعلیم ہوتی تھی، رزیڈنسی میں یہ مدرسہ قائم ہوا تھا کچھ عرصہ کے بعد موجودہ عمارت میں منتقل ہوا، عمارت کی توسیع زمانہ مابعد میں ہوئی۔

(۸) مدرسہ فخریہ۔ مدرسہ فخریہ کا قیام ۱۲۵۸ھ م ۱۸۴۳ء میں ہوا، اس مدرسہ کے بانی نواب فخر الدین خاں امیر کبیر شمس الامرا ثانی ہیں۔

شمس الامرا کے مورث اعلیٰ ابو الخیر خاں عالمگیری امرا میں شامل تھے، حضرت آصف جاہ اول کے زمانہ میں نمایاں خدمات انجام دیکر منصب چار ہزار اور دو ہزار سوار پر فائز ہوئے، ناصر جنگ اور صلابت جنگ کے زمانہ میں اپنے وفاشعارانہ خدمات کے صلہ میں امام جنگ کے خطاب سے سربلند ہوئے، ۱۱۶۵ھ میں آپ کا انتقال ہوا،

ابو الخیر خاں کے فرزند ابو الفتح خاں تھے، ان کو ابو الخیر خاں تیغ جنگ شمس الدولہ شمس الامرا کا خطاب ملا تھا، سرکار نے لاکھوں کی جاگیر بھی عنایت کی جاگیر کا مقصد فوج کی فراہمی تھی، چنانچہ آپ اپنی تربیت یافتہ فوج کے ساتھ تخت و تاج کی خدمت گزاری میں ہمیشہ مصروف رہے، فوج جمعیت پائیگاہ کے نام سے موسوم ہوئی، ۱۲۰۵ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔

آپ کے فرزند محمد فخر الدین تیغ جنگ شمس الامرا ثانی امیر کبیر اول ہیں، آپ کی پیدائش ۱۱۹۴ھ میں بمقام برھان پور ہوئی، باپ کے انتقال کے وقت گیارہ سال کی عمر تھی، اس وقت سے نوازشات شاہی مبذول ہوتے رہے، حتیٰ کہ دامادی کے اعزاز سے بھی نوازا گیا، لاکھوں کی نئی جاگیر ذات اور جمعیت کے لئے عطا ہوئی، ۱۲۷۹ھ میں آپ کا انتقال ہوا، درگاہ برہنہ شاہ حیدر آباد میں مدفون ہیں۔

شمس الامرا ثانی بڑے ذی علم اور علم دوست تھے، بیسیوں ارباب علم اور

---

[۱] مناقب شجاعیہ، اور حیدر آباد کی گذشتہ تعلیم مرتبہ سروری صاحب۔

اصحاب دانش وظیفہ خوار تھے، شعرا، ادیب علما، اور فضلاء کے لئے شمس الامراء کی ذات ایک اصلی مربی اور حقیقی سرپرست کی حیثیت رکھتی تھی، مصنفین اور مولفین کو ان کی محنت کا صلہ دینے میں پوری دریا دلی برتی جاتی تھی۔

شمس الامرا کا مہتم بالشان کارنامہ جو تاریخ زبان اُردو میں آب زر سے لکھا جائیگا یہ ہے کہ ۱۲۲۱ھ (۱۸۲۶ء) میں انہوں نے مغربی علوم و فنون یعنی کیمیا، طبعیات، ریاضی اور ہیئت کی کتابوں کو انگریزی اور فرانسیسی زبان سے اُردو میں ترجمہ کرانے کا سلسلہ قائم کیا، یہ وہ زمانہ ہے جبکہ علی گڈھ میں سائنٹفک سوسائٹی قائم ہوئی تھی اور نہ کہیں اور اس قسم کے کام کی ابتدا ہوئی تھی، ارباب کمپنی نے کلکتہ میں اردو نثر کی ترویج میں قصہ کہانیاں یا تاریخ کی کتابیں ترجمہ کرائیں یہ کارنامہ اس زمانہ میں تاریخ ادب اردو کا ایک ممتاز باب سمجھا جاتا ہے، لیکن شمس الامرا نے جو کتابیں ترجمہ کرائیں اور اس کی بدولت زبان اردو میں جو اضافہ ہوا، وہ ان قصہ کہانیوں سے کہیں زیادہ برتر اور بلند تر ہے۔

شمس الامرا نے کئی مدرسے قائم کئے تھے، ان میں سے ایک مدرسہ فخریہ ہے، جو آج سے تقریباً ایک سو سال پہلے قائم ہوا تھا، اس مدرسہ کے مدرسین کی ماہوار معیّن قرار تھی، طلبہ کو وظائف بھی دئے جاتے تھے، اور ان کے دوسرے تعلیمی مصارف بھی شمس الامرا خود اپنی ذات سے ادا کرتے تھے، علوم عقلی اور نقلی کی تعلیم ہوتی تھی، صدہا طلبہ نے فارغ ہوکر دستار فضیلت باندھی!

اس مدرسہ کی خصوصیت یہ بھی تھی کہ یہاں مغربی علوم کی ترجمہ شدہ کتابیں بھی درس میں شامل تھیں جو تمام طلبہ کو مفت دی جاتی تھیں، اس طرح یہاں کے طلبہ نہ صرف حدیث فقہ، صرف و نحو، وغیرہ کے ماہر ہوتے بلکہ کیمیا، طبعیات، ریاضی اور ہیئت کے جدید مغربی مسائل سے بھی واقف ہوتے تھے، اس طرح آج سے ایک صدی پیشتر یہاں کے طلبہ سائنس اور ریاضی کی تعلیم اُردو زبان میں حاصل کرتے تھے، گویا جامعہ عثمانیہ کا نقش اول تھا شمس الامرا کے بعد اس مدرسہ کی حالت میں بہت زوال آگیا اس وقت یہ مدرسہ تحتانیہ مدرسہ کی صورت میں موجود ہے، نواب معین الدولہ بہادر کی پائیگاہ اخراجات کی

کفیل ہے۔[۱]

(۹) ۱۲۵۸ھ میں شمس الامراء نے مدرسہ فخریہ کے علاوہ کئی اور مدرسے بھی قائم کئے، ان کی حیثیت ابتدائی نوعیت کے مدارس کی تھی، ایک بڑا مدرسہ تھا اس میں ۱۲۵۸ھ میں (۴۲۸) طلبہ شریک تھے، یہ مدرسہ سید عبدالرزاق کی نگرانی میں تھا، جو فتح الدولہ کے رشتہ دار تھے، اس مدرسہ کے لئے ایک خاص کتب خانہ بھی قائم تھا کتب خانہ دار محمد جعفر نام کوئی صاحب تھے۔[۲]

(۱۰) مدرسۂ طبیہ، ۱۲۶۲ھ ۱۸۴۶ء میں مدرسہ طبیہ قائم ہوا، اس کے قائم ہونے کی وجہ یہ تھی کہ ایک مرتبہ اعلیحضرت ناصر الدولہ آصف جاہ رابع کا مزاج ناساز ہوا، یونانی اطباء کے علاج سے فائدہ نہیں ہوا، رزیڈنٹ مسٹر فریزر سے گفتگو ہوئی تو انھوں نے انگریزی علاج کی جانب توجہ دلائی، حضور نے اس شرط پر ڈاکٹری علاج سے رضامندی ظاہر کی کہ کسی دوا کا استعمال نہ کرایا جائے،

رزیڈنسی کے سرجن میکلین نے معائنہ کے بعد غذا کے ذریعہ علاج شروع کیا، تین ماہ میں اعلیحضرت کو صحت حاصل ہوگئی، اس پر مسرت کا اظہار کیا گیا اور حیدرآباد میں مدرسہ طبابت قائم کرنے کا حکم دیا۔

اس حکم کی بناء پر مدرسہ طبی قائم ہوا اور اردو زبان میں ڈاکٹری کی تعلیم ہونے لگی ۱۸۹۳ء تک اردو میں تعلیم ہوتی تھی، سنہ مذکور سے بجائے اردو کے انگریزی میں تعلیم ہونے لگی، اور اب جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد اس مدرسہ کو ضم کر دیا گیا اور پھر سے اردو میں تعلیم ہونے لگی ہے،

ایک زمانہ دراز تک حیدرآباد اور اضلاع میں وہی ڈاکٹر مامور تھے جنھوں نے یہاں کے مدرسہ طبی میں اردو زبان میں تعلیم حاصل کی تھی اس موقع پر بعض نامآور طلبہ کی صراحت بے محل نہیں ہوسکتی۔

(۱) ڈاکٹر وزیر علی، سلطان الحکماء کا خطاب ملا، اور ناظم طبابت کے عہدہ سے سرفراز ہوئے۔

---

[۱] تاریخ رشید الدین خانی، دکن میں اردو، [۲] تاریخ رشید الدین خانی، [۳] بستان آصفی اور گزیٹیر سرکار عالی۔

(۲) ڈاکٹر مرزا علی، حکیم الحکما رکا خطاب ملا تھا اور ناظم طبابت تک ترقی کی تھی
(۳) ڈاکٹر محمد حیدر، المخاطب اشرف الحکما رلقمان الدولہ مرحوم، جو مرحوم اعلیحضرت غفران مکان کے خاص ڈاکٹر اور اسٹاف سرجن تھے۔
(۴) ڈاکٹر عبدالحسین المخاطب نواب ارسطو یار جنگ بہادر جو بفضلہ اب تک زندہ ہیں اور تاحال اُردو میں نسخے لکھا کرتے ہیں، جن کی بے نظیر جرّاحی کا بڑے بڑے سرجنوں نے اعتراف کیا ہے۔
(۵) ڈاکٹر سید احمد مرحوم، جو ایک عرصہ دراز تک حیدرآباد کے مشہور ڈاکٹر تھے مسٹر سید اعظم پرنسپل سٹی کالج آپ ہی کے قابل فرزند ہیں۔

(۱۱) مدرسہ دارالعلوم مدرسہ دارالعلوم کا افتتاح ۲۰ رجب ۱۲۷۲ھ م ۱۸۵۶ء میں ہوا، چند سال کے عرصہ میں اس مدرسہ نے خاصی ترقی حاصل کر لی، اس زمانہ میں یہاں نہ صرف عربی اور فارسی کی تعلیم ہوتی تھی بلکہ انگریزی تلنگی اور مرہٹی کے درس کا انتظام بھی تھا، اور تعلیم المعلمین کا کام بھی اس مدرسہ سے لیا جاتا تھا؛
ایک خاص کمیٹی کے سپرد اس مدرسہ کی نگرانی وغیرہ تھی، جس کے ارکان معتمد الدولہ شیخ علی منصبدار، جمشید جی اور مسٹر براؤن تھے، کچھ عرصہ کے بعد انگریزی شاخ اس مدرسہ سے علٰحدہ ہو گئی اور سٹی ہائی اسکول کی بنیاد قائم ہوئی،
مدرسہ دارالعلوم کے چار دور قائم کئے جا سکتے ہیں:
(۱) پہلا دور ابتدا قیام سے پنجاب یونیورسٹی سے تعلق ہونے تک یعنی ۱۲۷۲ھ تا ۱۳۰۱ھ، اس زمانہ میں درس نظامیہ کی تعلیم ہوتی تھی، حیدرآباد کی بڑی بڑی ہستیوں نے اس زمانہ میں استفادہ کیا، چونکہ یہی پہلا سرکاری مدرسہ تھا جو نواب مختار الملک بہادر نے قائم کیا تھا اس لئے اس کی ترقی اور انتظام کا بڑا خیال تھا؛
اس زمانہ میں جن اصحاب نے استفادہ کیا تھا ان میں سے بعض لوگوں کے نام درج کئے جاتے ہیں۔
نواب آصف یار الملک وزیر علی بادشاہ، نواب مکرم الدولہ، نواب شہاب جنگ

رفعت یار جنگ اول، عماد جنگ اول، معتضد جنگ، معین یار الدولہ، مقتدر الدولہ، قادر نواز جنگ، محمد نواز جنگ، لطیف یار جنگ، مولوی یوسف الدین، ملا عبد القیوم، مرزا محمد علی خاں، مرزا مہدی خاں، مولانا عبد الحی مرحوم۔ شیخ چراغ علی فرنگی محل لکھنو وغیرہم۔

(۲) دوسرا دور ۱۳۰۸ھ سے ۱۳۲۴ھ تک جبکہ اس کا تعلق پنجاب یونیورسٹی سے رہا، منشی، منشی عالم، منشی فاضل، مولوی، - ، مولوی عالم، اور مولوی فاضل کی تعلیم ہوتی رہی، اور صدہا طلبہ فارغ التحصیل ہو کر ملک اور مالک کی خدمت میں مصروف ہوئے دار العلوم کے طلبہ اکثر وبیشتر پنجاب یونیورسٹی کے طلبہ میں اول آتے رہے۔

اس دور کے بعض طلبہ کے اسماء کی صراحت بھی بے موقع نہیں ہو سکتی، جو یہ ہیں نواب اظہر جنگ نواب صدیق یار جنگ مولوی عبد القدیر، مولوی سید غلام نبی، مولوی سید جمال الدین نوری مرحوم، مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم، مولوی محمد اکبر علی، ملا عبد الباسط، احمد اللہ ایچ سی ایس، حضرت امجد، کیفی، ذہین، خواجہ فیاض الدین، مرزا محمد بیگ، فیض الدین کمیل وغیرہم۔

(۳) دار العلوم کا تیسرا دور پنجاب یونیورسٹی، کا تعلق منقطع ہونے کے بعد شروع ہوتا ہے (۱۳۲۴ھ) اس زمانہ میں دار العلوم کی کشتی قریب تھا کہ ڈوب جائے مگر مرحوم عزیز مرزا، اور ڈاکٹر نواب سراج یار جنگ کی توجہ سے مدرسہ نے سنبھالا لیا، جدید تنظیم کے لئے، مولانا شبلی نعمانی کو بلایا گیا، نصاب میں ترمیم ہوئی، ڈاکٹر الماسلطیفی سر مسعود جنگ کی نظامت اور آنریبل نواب سر حیدر نواز جنگ کی معتمدی کے زمانہ میں جدید اسکیم مرتب اور نافذ ہوئی، علامہ شبلی مرحوم کے بھائی مولانا حمید الدین بی۔اے مرحوم اس کی صدارت کے لئے طلب کئے گئے۔ تا آنکہ وہ زمانہ آیا جبکہ دار العلوم نے جامعہ عثمانیہ کا جنم لیا، یا یوں کہ دار العلوم جامعہ عثمانیہ میں ضم ہو گیا، (۱۳۳۷ھ) اور دار العلوم کا نام صرف فوقانیہ مدرسہ کی حد تک باقی رہ گیا۔ یہ اس کا چوتھا دور ہے۔

دار العلوم کے تیسرے دور میں بھی کئی نامور طلبہ اس کے بوسیدہ مگر پر عظمت اور تاریخی عمارت سے فارغ التحصیل ہو کر ملک کی خدمت بجا لا رہے ہیں جن میں سے

بعض حسب ذیل ہیں :۔

احمد عبد اللہ پروفیسر نظام کالج، حبیب الرحمٰن، ڈاکٹر نظام الدین ڈاکٹر کلیم اللہ ڈاکٹر ظہیر الدین پروفیسران جامعہ عثمانیہ حضرت صابر حسینی، مولانا حسام الدین فاضل، وغیرہم

۱۲۔ مدرسہ انجینیرنگ[1] مدرسہ دار العلوم کے بعد سرکار نے ایک مدرسہ انجینری کی تعلیم کے لئے قائم کیا، ابتداً ورنگل میں اس کو قائم کیا گیا بعد میں حیدر آباد منتقل کیا گیا،

۱۳۔ اضلاع کے مدرسے[1] مدرسہ دار العلوم کے قائم ہونے کے پانچ سال بعد ۱۸۵۹ء میں احکام جاری کئے گئے کہ ہر تعلقہ میں ایک فارسی مدرسہ اور ایک ملکی زبان کا مدرسہ قائم کیا جائے، اس کے انتظام کے لئے ایک مجلس ہر تعلقہ میں ہوتی تھی، جس کے میر مجلس تحصیلدار اور ارکان پٹیل پٹواری ہوتے تھے، سوم تعلقدار کے ذمہ نظارت کے فرائض سپرد تھے، ۱۸۶۸ء میں تعلیمات کا کام مال گذاری سے علیحدہ ہوا، اور صدر المہام متفرقات سے اس کا تعلق قائم کیا گیا۔

مرزا موسیٰ خاں کی حیثیت گویا ناظم تعلیمات کی، مرزا موسیٰ خاں صاحب مرحوم مرزا حسین علی خاں صاحب نائب صدر جامعہ عثمانیہ کے، دادا تھے،

موضوع مضمون کے لحاظ سے ہمارا تذکرہ یہاں ختم ہو جاتا ہے، ۱۸۶۸ء کے بعد جدید انتظامات عمل میں آئے اور تعلیمات کا قالب ہی بدل گیا، اس کی صراحت طویل صفحات کی متقاضی ہے،

(۲)

اب ہم بعض ان علماء کا تذکرہ کرتے ہیں، جنہوں نے درس و تدریس کے فرائض انجام دئے ہیں ان میں سے بعض تو مذکورہ مدارس میں تعلیم دیا کرتے تھے، جن کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ یہاں صرف ان علماء کو متعارف کرایا جاتا ہے جن کے مکانات ہی مدارس اور مکاتب کی حیثیت رکھتے تھے،

سلطنت آصفیہ کی جانب سے اکثر ایسے علماء، حفاظ، مفسر، خوشنویس وغیرہ کو

---

[1] دار العلوم کے حالات ہم نے اپنے زیر ترتیب کتاب سے انتخاب کئے ہیں جو "دار العلوم" کے نام سے مرتب کیگئی ہے، ۱۹۳۰ء ۔ گزیٹیر، مرتبہ مرزا مہدی خاں۔

یومیے اور منصب مقرر تھی، اسلامی علمار کے ساتھ ساتھ پنڈتوں، شاستریوں، مٹھوں وغیرہ کے نام بھی معاش جاری تھی، ان سب کے فرائض یہی تھے کہ علم کی خدمت گزاری کیجائے اور شایقین علم کو بغیر کسی فیس وغیرہ کے مفت تعلیم دیا کریں۔

اس قسم کے بیسیوں نام ہم کو معلوم ہیں جو درس قرآن، دینیات، ادبیات، خوشنویسی وغیرہ اور تعلیم سنسکرت، نجوم وغیرہ کے لئے وظائف پاتے تھے، نہ صرف مردوں کے نام ہی دستیاب ہوتے ہیں بلکہ بعض خواتین کے نام بھی ملتے ہیں[۱]۔

علما، اور فضلا، پنڈتوں شاستریوں کے ساتھ ساتھ طلبہ کو بھی وظائف "یومیے" کے نام سے ملا کرتے تھے، اور اکثر وبیشتر ایسے وظائف زمانہ طالب علمی کے بعد ملا کرتے، بلکہ بعض تو دوامی ہو کر ان کی اولاد اور متعلقین بھی اس سے مستفید ہوئے ہیں، جس طرح درس و تدریس کے وظائف میں مذہب کی تخصیص نہیں تھی اسی طرح طلبہ میں بھی کوئی فرق مذہب و ملت نہیں تھا۔ بلکہ مسلمانوں کے بہ نسبت ہندوں کی تعداد زیادہ پائی جاتی ہے[۲]۔

اگرچہ آج کل کے لحاظ سے اُس وقت کے یومئے جو طلبہ وغیرہ کو دئے جاتے تھے حقیر معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ کم از کم یومیہ دو آنے دیا گیا ہے، مگر یہ وظائف اس زمانہ کی معاشرت، جنس کی ارزانی کے لحاظ سے کافی سے زیادہ تھے، اس کے علاوہ طلبہ کو مدرسہ کی کوئی فیس ادا کرنی نہیں ہوتی تھی، امتحان کی شرکت کے اخراجات نہیں تھے، کتابوں نوٹ بکوں وغیرہ کی ضرورت نہیں تھی، جن کتابوں کا درس ہوتا تھا وہ اکثر وبیشتر طلبہ خود نقل کر لیتے یا مدرسہ کے کتب خانہ سے حاصل کر لی جاتی، ان وجوہ سے آج کل کی بہ نسبت زمانہ سابق کے طلبہ اچھی حالت میں ہوتے تھے۔

بعض علما، ایسے بھی تھے جو طالب علم کے روزمرہ اخراجات اور اُن کے خورد نوش کے مصارف بھی خود اپنی ذات سے ادا کرتے تھے، ان کا مکان ہی گویا دارالاقامہ کی حیثیت رکھتا تھا۔

۱و۲۔ کاغذات دفتر دیوانی و مال۔

ایسے علماء جو درس اور تدریس کے فرائض انجام دیا کرتے تھے بیسیوں ہیں۔ ان
میں سے چند کا تعارف کرایا جاتا ہے:-

(۱) مولانا غلام علی آزاد بلگرامی، ۱۱۱۶ھ میں آپ کی ولادت ہوئی، ۱۱۵۶ھ
میں آپ نے اورنگ آباد سے آکر یہاں اقامت اختیار کرلی، نواب ناصر جنگ کے
دربار میں باریاب تھے، آپ کی قابلیت کا شہرہ نہ صرف دکن یا ہندوستان میں تھا، بلکہ حجاز،
ایران اور مصر میں بھی آپ کی قابلیت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔

آپ شب و روز درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے، آپ کی مجلس میں ہر وقت
مباحثہ، مناظرہ اور مذاکرہ کا چرچا رہا کرتا، شعر وسخن کی اصلاح کا سلسلہ بھی جاری تھا، آپ
کے حلقہ درس میں عرب وعجم کے طلبہ شامل ہوتے تھے، آپ کے کئی شاگرد مشہور ہیں، ان
میں سے چند حسب ذیل ہیں:-

مولانا عبدالوہاب افتخار تخلص مولف تذکرہ بے نظیر، عبدالقادر مہربان، افضل بیگ
قاقشال مولف تحفۃ الشعرا، لالہ لچھمی نارائن شفیق مولف چمنستان شعرا و گل رعنا وغیرہم۔

مولانا آزاد کی کئی تصانیف مشہور و معروف ہیں، ۱۲۰۰ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔[۱]

(۲) حافظ محمد علی خیرآبادی، مہاراجہ چندولال کے زمانہ میں حیدرآباد آئے تھے
مثنوی مولانا روم کا درس دیا کرتے، مہاراجہ صاحب نے یومیہ اور منصب مقرر کرنا چاہا،
مگر حافظ صاحب نے اس کے لینے سے انکار کیا، روزانہ آپ کے ساتھ پچاس آدمی کھانا
کھاتے تھے ۱۲۵۰ھ میں آپ اپنے وطن کو واپس ہوگئے۔[۲]

(۳) مولوی میر ابوتراب، مشاہیر علماء سے تھے، حرمین کی زیارت کے بعد حیدرآباد
آکر درس و تدریس میں مشغول ہوگئے، میر عالم بہادر نے فقہ کی تعلیم آپ سے حاصل کی تھی،
صدہا لوگوں نے آپ کے فیض سے استفادہ کیا۔[۳]

(۴) مولوی صفدر اورنگ آبادی، بڑے محدث تھے، اور حدیث کی تعلیم بھی دیا
کرتے تھے۔[۴]

۱۔ محبوب الزمن، ۲۔ گلزار آصفیہ، ۳۔ گلزار آصفیہ، ۴۔ گلزار آصفیہ۔

(۵) مولوی حیدر، علمائے فرنگی محل لکھنؤ سے تھے، درس و تدریس کے علاوہ مکہ مسجد میں وعظ بھی کہا کرتے، سرکار آصفیہ کی جانب سے جاگیر مقرر ہوئی جو آج تک ان کے خاندان میں باقی ہے[1]

(۶) مولوی ظہور، مولوی حیدر کے فرزند ہیں، مسلمہ قابلیت تھی، درس کا سلسلہ جاری تھا[2]

(۷) مولوی بسم اللہ، برہان پوری، امیر کبیر کے ملازم تھے، طلبہ کو خانگی طور پر درس دیا کرتے[3]

(۸) مولوی عماد الدین حسین، آپ کے خاندان کا مشغلہ ہی درس و تدریس تھا آپ کے والد مولوی عطا حسین اور دادا محمد اعظم حسین کے حلقہ ہائے درس نہایت وسیع ہوتے تھے[4]

(۹) مولوی محمد علی نظر، اورنگ آبادی شاعری کے ساتھ ساتھ درس کا سلسلہ بھی جاری تھا، عموماً دوپہر کے بعد آپ کے درس کا حلقہ قائم ہوتا تھا[5]

(۱۰) مولوی حافظ شمس الدین فیض، آپ کے دادا مولوی رحمت اللہ دہلوی سے تھے آصف جاہ ثانی کے زمانہ میں حیدرآباد آئے، حضور کی قدردانی سے منصب جاری ہو گیا، درس و تدریس میں مشغول رہے، فیض کے والد مولوی امیر الدین کی پیدائش حیدرآباد میں ہوئی امیر الدین اپنی جوانی میں برار چلے گئے یہاں فیض کی ولادت ۱۱۹۵ھ میں ہوئی، تحصیل علم کے لئے فیض حیدرآباد آئے، اور پھر یہاں ہی اقامت کر لی،

اپنے باپ دادا کی طرح درس کا سلسلہ جاری رکھا، ایک طرف آپ کا حلقہ درس قائم تھا تو دوسری طرف شعر و شاعری کا بازار گرم رہا کرتا۔ مدتوں اُن کا فیض جاری رہا صدہا اشخاص مستفید ہوئے، باقی، عصر، پاس وغیرہ آپ کے قابل تلامذہ ہیں ۱۲۸۲ھ میں آپ کا انتقال ہوا[6] حیدرآباد میں مدفون ہیں۔

(۳)

اب ہم قدیم نصاب کی طرف توجہ کرتے ہیں، افسوس ہے کہ ہمارے پاس ایسے معلومات نہیں ہیں جن کے لحاظ سے قدیم نصاب کی تفصیلی صراحت کی جا سکے، مگر قدیم

---

[1] تا [5] گلزار آصفیہ۔ [6] طبقات الشعرا مولف کریم الدین۔ محبوب الزمن۔

عربی نصاب کی ہمیں جو آگاہی ہوئی اس کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ صرف و نحو، فقہ و اصول فقہ تفسیر و حدیث، منطق و فلسفہ، تصوف اور ادب ہمارے نصاب کے اہم جز ہوتے تھے، ان میں سے کبھی کسی فن کی کتابیں زیادہ ہوتی تھیں اور کبھی کم، اس کے بعد جب مولانا نظام الدین بانی درس نظامیہ نے اپنے درس کا نصاب مقرر کیا تو عام طور سے مولانا کا مقرر کردہ نصاب ہی مقبول عام و خاص ہو گیا، آپ کے درس کے نصاب میں حسب ذیل فنوں کی کتابیں شامل تھیں۔

تفسیر و حدیث، صرف و نحو، منطق و حکمت، ریاضی، بلاغت فقہ و اصولِ فقہ، کلام۔

یہ تو عربی نصاب کی حالت تھی فارسی نصاب میں بھی تغیر و تبدل ہوتا رہا مگر فارسی میں مندرجہ صدر فنون کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا، فارسی صرف، ادب و اخلاق اور انشاء کی حد تک محدود ہوتی تھی، اس کے لئے مختلف زبانوں میں مختلف کتابیں مقبول رہیں، اخلاق محسنی، اخلاق جلالی، کیمیا سعادت، اخلاق ناصری وغیرہ کتابیں اخلاقی درس میں شامل ہوتی تھیں، ادبیات میں مختلف دیوان مثنویات اور قصائد نصاب میں شامل ہوتے تھے، گلستاں بوستاں سہ نثر ظہوری وغیرہ کتابیں جزو لاینفک ہوتی تھیں، انشاء پر خاص زور دیا جاتا تھا، کئی کتابیں اس فن کی پڑھائی جاتی، خطوط نویسی کی مشق بھی کرائی جاتی، خطاطی اور قرآن شریف بھی درس کے لازمات تھے، عموماً صبح اول وقت قرآن شریف، اور دوپہر میں بعد ظہر خطاطی کے لئے مخصوص ہوتا تھا۔

شمس الامرائ کے مدرسہ کو اس امر کا فخر حاصل ہے کہ وہاں علوم مغربی کیمیا، طبعیات، ریاضی، ہیئت وغیرہ کی تعلیم اردو زبان میں ہوتی تھی، اسی طرح مدرسہ طبیہ میں طب مغربی کی تعلیم اردو میں ہوتی تھی۔

نصاب کے بعد اوقات درس اور طریقہ درس کے متعلق بھی مختصر صراحت ضروری ہے، قدیم زمانہ میں تعلیم کا وقت دس سے چار یا نو سے تین تک نہیں ہوتا تھا،

بلکہ تعلیم کا وقت عموماً طلوع آفتاب کے بعد ہی شروع ہو جاتا تھا۔ کوئی دوپہر کے بعد تعلیم دیا کرتا، مگر عام طور سے دوپہر میں خطاطی ہوتی تھی، سہ پہر میں عموماً تعلیم نہیں ہوتی تھی، البتہ بعد مغرب درس ہوا کرتا، اکثر علماء جو اپنے طور پر خانگی درس دیا کرتے وہ عموماً صبح یا شام میں وقت مقرر کرتے تھے۔

زمانہ سابق میں آج کل کی طرح ایک فن کی تعلیم کے لئے ایک پروفیسر مختص نہیں ہوتا تھا، اکثر و بیشتر کئی کئی فنون کی تعلیم ایک ہی شخص سے حاصل کی جاتی تھی، مگر بعض علماء کسی خاص فن پر زیادہ زور دیتے تھے، کتابوں کے انتخابات یا اُن کے حصے شریک نصاب نہیں ہوتے عموماً پوری کتاب پڑھائی جاتی۔

درس کا طریقہ عام طور سے یہ ہوتا کہ ایک طالب علم کتاب پڑھتا اور دوسرے اس کو سماعت کرتے، کچھ حصہ پڑھنے کے بعد مدرس مطالب کو واضح کرتا اور لغات وغیرہ کو حل کرتا۔ پروفیسر کے لکچر دینے کا طریقہ نہیں تھا۔

ابتدا میں جماعت بندی کا قاعدہ نہیں تھا، مگر زمانہ مابعد میں اس کا طریقہ رائج ہو گیا، افسوس ہے کہ ہم اس امر کی صراحت نہیں کر سکتے کہ عموماً کتنے سال تک تعلیم ہوتی تھی، کیونکہ اس کا کوئی مواد ہمدست نہیں ہوا ہے۔

امتحان کا طریقہ بھی مروج تھا مگر زیادہ تر زبانی امتحان ہوتا تھا، آج کل کی طرح سوالات کے پرچے مرتب نہیں ہوتے تھے، مدرسہ فخریہ اور مدرسہ دارالعلوم کے ابتدائی زمانہ میں بھی امتحان کے بعد اسناد دئے جاتے تھے،

ٹیکمال کے مدرسہ حسینہ میں تعلیم کے ساتھ تربیت پر زیادہ زور دیا جاتا تھا، اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ اسی تربیت کے لئے بھی طلبہ وہاں روانہ کئے جاتے تھے۔

جو چیز خاص طور سے ہماری قدیم تعلیم میں مابہ الامتیاز نظر آتی ہے وہ تربیت ہی ہے، ہمارے قدیم اساتذہ اور طلبہ کا تعلق صرف درس و تدریس کے حلقہ میں محدود نہیں ہوتا تھا بلکہ تعلیم کے دوران اور ختم تعلیم کے بعد بھی زندگی کے ہر شعبہ میں وہ ایک دوسرے کے شریک و معاون ہوتے تھے، استاد شفیق باپ کی طرح اور شاگرد

سعادت مند لڑکے کی طرح ہوتا تھا، بلکہ شاگرد حقیقی فرزند کی طرح عزیز ہوتا تھا۔
امید ہے کہ اس تفصیلی سے ہماری قدیم تعلیمات کی حالت ذہن نشین ہو جائے۔

نصیرالدین ہاشمی
(حیدرآبادی)

عہد عثمانی میں صنعتی اور سائنس سے متعلق ترقیاں

از

سید عبدالحکیم۔ ایم۔ ایس۔ سی۔ ایل۔ ٹی

فی زمانناہماری ضروریات زندگی کی اکثر و بیشتر بنیادیں سائنس پر قائم کی گئی ہیں ہماری صنعت و زراعت، ذرائع نقل و حمل، وسائل تبادلہ خیالات، طریقہ ہائے صفائی و حفظ صحت، آرائش و آسائش، تفریحی مشاغل غرض کہ ہر شعبہ زندگی میں سائنس کی شرکت ہے۔ کسی قوم یا ملک کی معیاری ترقی کی جانچ اس امر سے کی جاتی ہے کہ اُس قوم یا ملک نے سائنس کو کس حد تک اپنا شریک زندگی بنایا ہے۔ مُبارک دَورِ عثمانی میں ملک کو جدید سائنٹیفک طریقہ پر آراستہ کرنے میں جو کوششیں عمل میں آئی ہیں۔ ماضی کے کسی دَور میں اس کی نظیر نہیں ملتی ہے۔ آج سے پچیس یا تیس برس قبل یہاں نہ تو سیمنٹ اور ڈامبر کی کشادہ سڑکیں تھیں اور نہ ان پر تیز رو موٹروں بسوں اور لاریوں کی یہ دوڑ دھوپ تھی۔ عام گذرگاہیں تقریباً ۲۰ یا ۲۵ فٹ چوڑی مورم اور پتھر کے ٹکڑوں کی بنی تھیں۔ موٹروں کے بجائے فٹن، بگھیاں اور دوسرے فیشن کی گھوڑا گاڑیاں امرار کی سواریوں کا کام دیتی تھیں۔ ان کے آگے آگے رنگ برنگ کی وردیوں میں ملبوس ملازمین کی قطاریں ہٹو بچو کرتی ہوئی چلتی تھیں۔ عورتوں کی سواریوں میں رتھیں جن میں رنگیں پردے پڑے رہتے تھے۔ چھما چھم کرتی ہوئی نکلتی تھیں۔ ہاتھی اور اونٹ جن پر گنگا جمنی جھولیں

پڑی رہتی تھیں کافی تعداد میں صبح و شام سڑکوں پر نظر آتے تھے۔ سڑکوں کے کنارے فاصلے، فاصلے پر تیل سے روشن ہونے والے لالٹیں برقی قمقموں کی جگہوں پر نصب تھیں۔ اور ۹ یا ۱۰ بجے تک سناٹا ہوجاتا تھا۔ غرضکہ بقول ایک مضمون نگار کے "وہ شورش زندگی جو تمدن جدید کا خاصہ اور ترقی پذیر قوموں کا طرۂ امتیاز ہے یہاں یکسر مفقود نہیں تو اتنی مدھم ضرور تھی کہ بغیر کافی فکر و کاوش کے اس کا پتہ نہیں چلتا تھا لیکن اب صورت حال بدل گئی۔ فی الوقت" وہ شورش زندگی" اتنی نمایاں ہے کہ کسی" فکر و کاوش" کی مطلق ضرورت باقی نہیں اس ضمن میں حیدرآباد کے لاسلکی نشرگاہ سے ابتدا کی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ سائنس سے متعلقہ جدید ترین سرکاری محکمہ ہے۔

لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد میں سرکاری طور پر لاسلکی نشرگاہ یکم فروردی ۱۳۴۴ف میں قائم ہوا۔ یہ کوچہ چراغ علی میں ایک بلند پایہ عمارت میں ہے اس عمارت کے ایک کمرہ میں ٹرانسمیٹر (آلہ رسانی) ہے ایک حصہ بطور کنٹرول روم استعمال کیا جاتا ہے۔ اور ایک تیسرے کمرے میں موسیقی کا انتظام ہے۔ اس کمرے میں متعدد پردے مختلف زاویوں پر اس طرح لگادیئے گئے ہیں کہ مقرر یا گانے والے کی آواز بجائے اِدھر اُدھر منتشر ہونے کے پردوں سے منعکس ہوکر مائکروفون کو زیادہ سے زیادہ توانائی سے متاثر کرے۔ پھر ٹرانسمیٹر کے ذریعہ تبادل برقی رَو کی صورت میں یہ آواز Aerial (ہوابند) جو عمارت کے بالائی حصے میں نصب ہے جاتی ہے اور وہاں سے برقی تموج فضا میں پھیل کر آلہ سماعت کو متاثر کرتی اور پھر اصل آواز کی صورت میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ اس قسم کے آلہ سماعت کی تعداد حیدرآباد اور اضلاع پر تقریباً ایک ہزار کے قریب پہونچ چکی ہے۔ حیدرآباد کے بعض بعض موٹروں میں بھی آلہ سماعت نصب ہے۔ اور اس میں شام کو ساکن ہوں یا حرکت میں گانا سنا جاسکتا ہے فی الوقت حیدرآباد کا نشرگاہ ۵۰۰ واٹس سے زیادہ قوت کا نہیں ہے۔ لیکن ہماری حکومت اس کی ترقی میں نمایاں دلچسپی لے رہی ہے۔ حیدرآباد میں لاسلکی نظام کے واسطے ۱۵ لاکھ کی اسکیم ہے۔ جس وقت یہ نشرگاہ معہ جدید آلات کے تیار ہوجائے گا تو یہ ہندوستان کی بہترین نشرگاہوں میں سے ہوگا۔ اور حالات

موافق ہونے پر نصف دنیا میں اس کی آواز پہونچ سکیگی۔ یہ نشر گاہ ۲ تا ۵ کلیواٹس کی طاقت سے عمل کرے گا۔ اور حسب ضرورت اس کی طاقت میں (۱۰) کلیواٹس تک اضافہ ہوسکیگا۔ اس کے علاوہ ایک دوسری اسکیم تقریباً ۱½ لاکھ روپیہ کی اور ہے۔ اس سے اورنگ آباد، گلبرگہ اور ورنگل میں پانچ، پانچ سو واٹس کے نشر گاہ قائم کئے جائیں گے اور ان میں مرہٹی، کنڑی اور تیلگو زبان میں علی الترتیب تقاریر نشر ہونگی۔ ان نشریات کا مدعا دیہات کی کثیر آبادی کی اخلاقی و معاشرتی اصلاح ہوگی۔ زرعی، امداد باہمی اصول صحت اور صفائی، بیماریوں کے روکنے کے طریقے کفایت شعاری، بہبودی اطفال۔ اور اسی نوعیت کی دیگر تقاریر جن سے دیہی آبادی کی تندرستی، دولت اور مدت میں اضافہ ہو ایک وقت میں شام کو مختلف دیہاتوں کے کھلے میدانوں میں نشر کی جائینگی۔ بنگال اور پشاور کے متعدد اضلاع میں اس قسم کی دیہی ترقی کی اسکیم رائج ہوچکی ہے اور شام کے وقت بعض بعض مقامات پر لڑکے، جوان بوڑھے، مرد عورتوں کی تعداد ایک ہزار کے قریب پہونچ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ تعلیمی نقطۂ نظر سے بھی نشریات کی اہمیت دن بدن بڑھتی جارہی ہے۔ حال میں روزانہ ایک ساعت تعلیمی اطفال کے نام سے حیدرآباد کی نشر گاہ کے نظام العمل میں اضافہ ہوا ہے اس میں اصول تعلیم سے متعلقہ نشریات کا انتظام ہوتا ہے۔ جو طلباء اور اساتذہ کے لئے نہایت دلچسپ اور ساتھ ہی ساتھ نہایت مفید ہے۔ جشن سیمین شاہانہ کے سلسلہ میں محکمۂ لاسلکی کی مصروفیات میں بہت اضافہ ہوجائے گا۔ اسی سلسلہ میں اہم تقاریر نشر کرنے کا اس طرح انتظام کیا جائے گا کہ وہ نہ صرف بیرون ممالک محروسہ بلکہ بیرون ہند بھی بخوبی طور پر سنی جائیں جوبلی ہال اور نمائش گاہ باغ عامہ میں آلات ترسیلی اور موصولی کی تنصیب عمل میں آئے گی۔ اور شہر کے گوشہ گوشہ میں آلات سماعت نصب کئے جائیں گے۔ جن پر عوام جشن، جوبلی سے متعلق نشر گاہ سرکار عالی کے نشریات کے علاوہ دیگر سرکاری تقاریب کی روئداد وغیرہ کی سماعت کرسکیں گے۔ اطراف بلدہ میں محکمہ لاسلکی کی موٹر لاریاں جو آلہ جات موصولی سے لیس ہونگی چکر لگائیں گی جن پر

مواضعات کی رعایا موسیقی وغیرہ کی سماعت لاسلکی کے ذریعہ کرکے جشن شاہانہ میں شرکت کرسکے گی۔

محکمۂ برقی وٹیلیفون ۱۳۱۸ف سے قبل اعلیحضرت مرحوم کے زمانہ میں مختلف تجارتی کمپنیوں نے دارالسلطنت کی سربراہی قوت برقی کے متعلق تجاویز پیش کیں۔لیکن ان سب نے اپنی تجاویز کے ساتھ یہ شرط لگائی کہ ان کمپنیوں کو اختیار ہوگا کہ وہ برقی ٹراموے بھی تعمیر کریں۔حضرت غفران مکان نے بالکل بجا طور پر اس شرط کی مخالفت کی۔لہذا کچھ عرصہ تک حیدرآباد میں برقی سربراہی کا انتظام نہ ہوسکا۔اسی زمانہ میں کہیں کہیں برقی رَو پیدا کرنے والی چھوٹی چھوٹی مشینیں نصب تھیں جن سے خاص خاص موقعوں پر برقی روشنی حاصل کرلی جاتی تھی اس قسم کی ایک چھوٹی مشین قصر فلک نما میں تھی اور ۴۲ کلوواٹس کی ایک دوسری مشین دارالضرب میں تھی۔ابتدا میں اس مشین سے دارالضرب کے بنگلہ میں برقی سربراہی کی جاتی تھی۔لیکن بعد میں اسی مشین کے ذریعہ قریبی دفاتر فینانس،تعمیرات اور محکمہ سیاسیات میں برقی پنکھے چلانے کا انتظام کیا گیا۔ان برقی پنکھوں کا انتظام دیکھکر اکثر ذی اثر حضرات نے خواہش ظاہر کی کہ آیا ان کیلئے بھی ایسا انتظام ممکن ہے۔لیکن عام طور پر برقی سربراہی کی پہلی باقاعدہ اسکیم ۲۱ف سے قبل عمل میں نہ آسکی۔اسی سال محکمۂ برقی کے لئے ۱۱ لاکھ کی منظوری ہوئی اور آغاز ۲۲ف میں ایک باقاعدہ چھوٹا سا Power House (پاورہاؤس) جس میں دو برقی مشینیں مع ضروری ساز وسامان کے نصب کی گئیں تعمیر ہوا۔چنانچہ برقی روشنی بند حسین ساگر کے ہر دو جانب اور بلدہ میں براہ رزیڈنسی مہاراجہ سرکشن پرشاد کی ڈیوڑھی تک کیگئی۔اس مشین کے ذریعہ سکندرآباد میں تالاب حسین ساگر سے برقی پمپ چلاکر آبرسانی کا بھی انتظام کیا گیا اور اوائل ۱۳۲۲ف میں سکندرآباد کے گلی کوچوں میں بھی اس مشین کے ذریعے برقی روشنی کی سربراہی عمل میں آئی اس وقت برقی رَو کی مقدار ۵۰۰ کلوواٹس کی حدتک پہونچ گئی۔اس چھوٹی سی مشین پر اتنا بار بھی زیادہ تھا۔اور مانگ دن بدن بڑھتی جاتی تھی۔چنانچہ جلد ہی دو مشینوں کا اضافہ کرنا پڑا جس سے ۱۰۰۰ کلوواٹس تک کی سربراہی ممکن ہوسکی۔لیکن اعلیحضرت واقدس کی زیر قیادت دارالسلطنت جس سرعت سے ترقی کررہا تھا۔اس کے لئے بھلا اس

قسم کی داغدوزی سے کیسے کام چل سکتا تھا۔ چنانچہ ضرورت کے مدِ نظر اعلیٰ پیمانہ پر جدید
پاور ہاؤس تعمیر کرنے کا فیصلہ ہوا۔

موجودہ پاور ہاؤس | یہ پاور ہاؤس اپنی موجودہ جگہ پر تالاب حسین ساگر کے کنارے
مکمل طور پر سنہ ۱۳۲۰ف میں تیار ہوا ختم سنہ ۱۳۲۱ف میں جملہ مصارف ۸۰ لاکھ ۸ ہزار ۶ سو اڑتالیس
روپیہ ہوئے۔ چونکہ مسلسل بارش کی قلت کی وجہ سے تالاب حسین ساگر کا پانی خشک ہوکر
کناروں سے دور ہٹ جاتا تھا۔ اور پانی حاصل کرنے میں دقت ہوتی تھی۔ اس لئے عثمان ساگر
سے ایک نہر کھود کر پانی لانے کا انتظام کیا گیا۔ موجودہ پاور ہاس جدید ساخت کی مشینوں سے
کامل طور پر آراستہ ہے۔ چار بہت بڑے بڑے ڈائنموز جملہ ۱۰ ہزار کلوواٹس کی برقی سربراہی
کرسکتے ہیں۔ ان میں سے تین ڈائنموز تو بڑے بڑے ٹربائین (بڑے پہیے جو بذریعہ اسٹیم
چلتے ہیں) کے ذریعہ چلائے جاتے ہیں۔ اور چوتھا وقتی ضروریات کے لئے محفوظ ہے جو تیل سے
چل سکتا ہے اسٹیم پیدا کرنے کے لئے جدید ساخت کے جوشدآں (Boilers) ہیں ان
بائلرس کی بھٹیوں میں سنگرینی کا کوئلہ جلایا جاتا ہے۔ یہ کوئلہ ہوا کے تیز جھونکوں سے خودبخود
بھٹیوں میں داخل ہوتا رہتا ہے یہ بھٹیاں ۱۲۰۰ فارن ہائیٹ کی تپش پر شعلہ زن رہتی ہیں۔
اس بلند تپش سے وقت واحد میں سینکڑوں ٹن پانی بھاپ کی صورت میں تبدیل ہوتا رہتا
ہے۔ بھاپ کے دباؤ سے اول ٹربائین اور ٹربائین سے ڈائنموز حرکت میں آکر برق پیدا کرتے
ہیں۔ ختم سنہ ۱۳۴۲ف میں سررشتہ برقی بلدہ پر جملہ اخراجات ۸۶ لاکھ تک پہونچ گئے اور اس
کی سالانہ آمدنی ۷ لاکھ ۱۶ ہزار روپیہ ہوئی۔ اضلاع اورنگ آباد ورائچور اور نظام آباد
کے برقی اسکیموں کے اخراجات ۱۱ لاکھ ۸۰ ہزار روپیہ ہوں گے اور توقع کیجاتی ہے کہ
بہت جلد سودبخش ثابت ہوں گے۔ یہی حال سررشتہ ٹیلیفون کا بھی ہے جس پر بلدہ میں
۹ لاکھ ۶۴ ہزار اور اضلاع میں ۴ لاکھ ۲۹ ہزار کے اخراجات عائد ہوئے۔

دارالضرب ومتعلقہ ورکشاپ | سنہ ۱۳۰۲ف سے قبل روپیہ ہاتھ سے بنایا جاتا تھا سنہ ۱۳۰۲ف
میں ایک مشین قائم ہوئی ابتداءً میں جو سکّہ اس میں مضروب ہوئے وہ سکہ چرخی کے نام سے
موسوم ہوئے سنہ ۱۳۱۲ف میں دارالضرب کی نئی عمارت موجودہ جگہ پر تعمیر ہوئی اور اس میں جدید

مشینری نصب ہوئی ۔ اس مشین سے بنے ہوئے سکہ کو سکہ حالی کہتے ہیں ۔ جس کے معنی سکہ رائج کے ہیں ۔ یہ سکہ وزن میں ½ ۱۷۲ گرین ہے اور یہ بمقابلہ ۱۸۰ گرین سکہ انگریزی کے ہے ۔ جو سکہ میر محبوب علیخاں بہادر کے زمانہ میں مضروب ہوئے اُن پر حرف "میم" لکھا ہے اور جو موجودہ تاجدار دکن کے زمانہ میں بنے ان پر حرف میم کے بجائے "عین" (ع) لکھا ہے ۔ جب ۱۳۱۳ف میں دار الضرب اپنی موجودہ جگہ پر منتقل ہوا تو ایک چھوٹی سی ورکشاپ بطور جزو دار الضرب مشینری کی ترمیم اور ضروری پرزے وغیرہ بنانے کے لئے قائم ہوئی جس زمانہ میں روپیہ کثرت سے بنتا تھا اس زمانہ میں تو ورکشاپ کے ملازمین کو کام رہتا تھا مگر جس زمانہ میں روپیہ کم بنتا تھا یا بالکل نہ بنتا تھا تو ورکشاپ کے انجام دینے کے لئے عملی طور پر کوئی کام باقی نہ رہتا تھا ۔ اس بیکاری کا تدارک اعلیحضرت واقدس کی تخت نشینی کے ایک سال بعد عمل میں آیا ۱۳۲۱ف میں بعض تعمیرات اور اضافہ جات کے ساتھ ورکشاپ کو دار الضرب سے علحدہ کر دیا گیا ۔ اور اس میں دار الضرب کے وقتی کام کے ساتھ ساتھ عام صنعتی باغراض سرکاری و عام خلایق کے کام کا بھی آغاز ہوا ۔ اور ساتھ ہی ساتھ صنعت و حرفت کی تعلیم کا کام بھی اس سے لیا جانے لگا ۔

جنگ عظیم کے دوران میں اس ورکشاپ نے بارود، شل کے گولے، بار برداری کی گاڑیاں گھوڑوں کا ساز و سامان بنا کر برٹش گورنمنٹ کی سربراہی کی فی الوقت یہ شاپ اپنے کام کی نوعیت کے لحاظ مختلف حصّوں میں منقسم ہے ۔ ہر حصّہ مکمل طور پر عصری آلات اور مشینوں سے آراستہ ہے ۔ دھات کی ڈھلی ہُوئی تجوریاں، پانی کے نل، مہریں، چپراس، تمغہ جات، فولادی جھنڈیاں، ہٹن لکڑی کا ہمہ اقسام کا فرنیچر ان حصّوں میں تیار ہوتا رہتا ہے

رصدگاہ نظامیہ یہ رصدگاہ ۱۳۱۸ف ۱۹۰۸ء میں اعلیحضرت مرحوم کے زمانہ حکومت میں قائم ہوئی تھی ۔ اس وقت سے اب تک حکومت کی سرپرستی میں یہ ادارہ برابر ترقی کر رہا ہے اور اس وقت اس کا شمار دُنیا کی بہترین رصدگاہوں میں ہے ۔ ابتدا میں یہ سررشتہ فینانس کے تحت میں تھا ۔ لیکن ۱۳۲۹ف میں اس کا الحاق جامعہ عثمانیہ سے کر دیا گیا ۔ اس میں دو بڑی بڑی استوانی دُور بین ہیں ۔ ان میں سے ایک اٹھ انچ والی عکسی اور دوسری پندرہ انچ والی

بصری عطاف پر جس کے ساتھ آلۂ مرور اور وقت نگار بھی ہے مشتمل ہیں۔ پندرہ انچ والی دوربین آج سے دس برس پیشتر نصب کی گئی تھی اور یہ خصوصی طور پر متغیر تنویر کے ان ستاروں کے باضابطہ مشاہدات میں استعمال کی جاتی ہے جن کی اقل تنویر بہت کم ہے رصدگاہ میں زلزلوں کا پتہ چلانے کے واسطے دو زلزلہ نگار بھی ہیں انسے حاصل شدہ معلومات خلاصہ زلزلیات بین الاقوامی میں اندراج کے واسطے آکسفورڈ بھیجے جاتے ہیں۔ علاوہ بریں اس رصدگاہ میں ایک جویاتی رصدگاہ بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہاں طلایہ گرغباروں کا مستقر بھی قائم کیا گیا ہے۔ جہاں حکومت ہند کے محکمہ جویات کے تعاون سے مشاہدات عمل میں لائے جاتے ہیں۔

اس رصدگاہ کا شمار ان ادارہ جات میں سے ہے جو نقشہ فلک کی بین الاقوامی ترتیب میں حصہ لیتے ہیں چنانچہ رصدگاہ مذکور نے اپنے مفوضہ منطقہ (انصراف ۱۷ تا ۲۳) کی عکسی تصاویر کی پیمائش کا کام ختم کر کے اب منطقہ ۳۶ تا ۳۹ کی فہرست کی تیاری میں مشغول ہے اس کی اہم مطبوعات حیدرآباد کی فہرست انجم نگاری کی آٹھ جلدیں اور متعدد مختصر مقالات پر مشتمل ہیں یہ مقالہ فلکیات کے بعض ممتاز جرائد میں شائع ہو چکے ہیں ایک باقاعدہ دارالمطالعہ بھی اس رصدگاہ سے متعلق ہے اس میں کتب علم فلکیات اور متعلقہ رسالہ جات کافی تعداد میں موجود ہیں۔

محکمہ آب رسانی زمانہ قدیم سے لوگ سائنس کے اس اصول سے واقف ہیں کہ پانی ہمیشہ اپنی سطح ہموار رکھتا ہے یا رکھنے کا متقاضی رہتا ہے اس اصول کی تحت شاہان سلف اپنے محلات یا باغات کی آرائش میں پانی کے حوض بنا کر ان کے درمیان فوارے نصب کرتے تھے۔ چنانچہ حصار گولکنڈہ میں قطب شاہی محلات کے وسیع خشک حوضوں کے درمیان خاموش فوارے آج بھی بطور یادگار موجود ہیں۔ اورنگ آباد اور دیگر مقامات پر بھی قدیم زمانہ کی اس قسم کی بہترین یادگاریں ملتی ہیں۔ اعلیحضرت مرحوم کے زمانہ میں سرسالار جنگ کی یادگار میں ایک محکمۂ آبرسانی کا قیام عمل میں آیا تھا۔ پانی کا انتظام میرعالم کے تالاب سے کیا گیا تھا۔ اس کے لئے دس انچہ قطر کے نل لگائے گئے

اور ایک نل ۲۲ انچ قطر کا تھا جس سے فلٹر بڈ کو پانی جاتا تھا۔ وہاں سے صاف ہو کر یہ پانی ایک حوض میں آتا تھا جو راجہ چندو لال کی بارہ دری کے مغرب میں تھا۔ وہاں سے شہر میں تقسیم ہوتا تھا۔ نلوں کا مجموعی طول ۲۷ میل تھا۔

۱۳۲۸ف میں خزانہ آب عثمان ساگر سے حیدرآباد کو پانی پہونچانے کی اسکیم سرکار عالی سے منظور ہوئی۔ اور کام جاری ہو کر ختم ۱۳۳۱ف تک اس پر ۴۸ لاکھ ۲۹ ہزار ایک سو چھبیس روپیہ صرف ہوئے۔ عثمان ساگر سے ایک چینل تقریباً چھ فٹ چوڑی آصف نگر تک آتی ہے۔ ہر دو مقامات کی سطح میں تقریباً ۔ افٹ کا تفاوت ہے یہاں اس چینل کا پانی دو وسیع حوضوں میں جمع ہو کر آہستہ آہستہ تقطیری چھوٹے چھوٹے حوضوں میں داخل ہوتا ہے ان حوضوں میں نیچے سے اوپر تک مختلف جسامت کے سنگریزوں کی متعدد تہیں ہوتی ہیں۔ آخر میں سب سے اوپر باریک ریت کی تہہ رہتی ہے پانی ان سنگریزوں سے ہو کر جب اوپر نکلتا ہے تو تقطیر ہو کر خوب صاف ہو جاتا ہے یہ ریت اور سنگریزے وقتاً فوقتاً ایک مشین کے ذریعہ پمپ کی ہوئی ہوا سے خوب دھوئے جاتے ہیں۔ ہوا پمپ ہوتے وقت جو تلاطم پانی میں پیدا ہوتا ہے وہ دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ اس تقطیر کئے ہوئے پانی میں مائع کلورین سے بھرے ہوئے اسطوانے سے کلورین گیس داخل کی جاتی ہے۔ تاکہ مختلف جراثیم کا خاتمہ ہو جائے۔ بعد از ان نلوں کے ذریعہ یہ پانی شہر کے ہر حصہ میں پہونچ جاتا ہے۔ چونکہ شہر دن بدن ترقی پذیر ہے لہذا موجودہ ذخیرہ سے خصوصاً موسم گرما میں کام چلانا مشکل پڑ جاتا ہے۔ تقریباً دولاکھ کی منظوری سے ایک دوسرا حوض زیر تعمیر ہے۔ اس حوض کو پہلے سے زیادہ بہتر سائنٹیفک طریقوں پر تعمیر کیا جائے گا۔

محکمۂ زراعت اور ڈرینج مبارک عہد عثمانی میں جو جدید سررشتہ جات قائم ہوئے ان میں سررشتہ زراعت اور ڈرینج بھی شامل ہیں۔ ابتداءً سررشتہ زراعت کے قائم کرنے کی بڑی ضرورت یہ تھی کہ گورانی یعنی دیسی بڑے ریشہ دار روئی کی جگہ جو بہارت یعنی باہر کی درآمد کردہ چھوٹے ریشہ کی روئی لے رہی تھی۔ اس کو روکا جائے بڑے ریشہ کی

روئی کی سائنٹفک طریقہ پر کاشت کے لئے مزرعہ جات کھولے گئے۔ عمدہ قسم کی موزون کھاد اور تخم فراہم کئے گئے اور گورانی کپاس کو دوسری روئی کے مقابلہ میں از سرِ نو فروغ دیا گیا اگر یہ کوشش نہ کی جاتی تو بڑے ریشہ دار روئی چند سال کے بعد اس ریاست سے ناپید ہو جاتی۔ سررشتہ کی توجہ صرف روئی تک ہی محدود نہ رہی۔ نیشکر، تمباکو، الیری ریشم اور دیگر فصول کی سائنٹفک اصولوں کے تحت کاشت پر بھی تجربات کئے اضلاع نظام آباد، ورنگل محبوب نگر، سنگاریڈی۔ پربھنی اور ریاست کے دیگر مقامات پر مزرعہ جات کھولے گئے اور انہیر انگلستان اور دیگر جامعات کے زراعت سے متعلقہ صاحبِ اسناد کا تقرر کیا گیا۔ سررشتہ ہذا کا یہ بھی کام ہے کہ وہ اپنی تحقیق و تجربہ سے پیدا ہونے والے مفید معلومات کی اشاعت کرے اور اس طرح عام کاشتکاروں کو بہتریں تخم، موزون کھاد اور کاشت کے جدید طریقوں سے روشناس کرے چونکہ ملک کی معاشی حالت کی بہتری یا ابتری کا انحصار ایک بڑی حد تک زراعت پر ہے لہذا حکومت سرکار عالی نے ملک کی زراعتی حالت کو بہتر بنانے میں کسی ممکنہ کوشش سے دریغ نہیں کرتی۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے آبپاشی کے عظیم الشان انتظامات وسیع اخراجات کے بعد عمل میں لائے گئے ہیں۔ پانی کو روکنے کے واسطے یہاں کی بڑی بڑی جھیلوں پر بندوں کی تعمیر کی گئی ہے چنانچہ حال میں فرمان خسروی کے ذریعہ نظام ساگر کے بند کی تعمیر عمل میں آچکی ہے جو پچاس مربع میل سے زیادہ رقبہ پر پھیلا ہوا ہے اور اس کا پشتہ دو میل طویل ہے اندازہ یہ ہے کہ اس کی مدد سے ۳ لاکھ ایکڑ زمین کی آبپاشی ہو سکے گی۔

محکمہ ڈرینج | حیدرآباد میں بصرفہ ۲ کروڑ جدید تریں طریقہ ڈرینج اور آبرسانی رائج کیا گیا ہے اس طرح پر شہر کا تمام فضلا زمین دوز نالوں کے ذریعہ شہر کے باہر یہاں کے نشیب ترین علاقے عنبرپیٹھ میں پہونچا دیا جاتا ہے فضلے کے بہانے کے لئے جو پانی درکار ہوتا ہے وہ حمایت ساگر سے جو ۹۲ لاکھ ۷ ہزار روپیہ کے اخراجات سے پشتہ باندھ کر تیار ہوا ہے۔ حاصل کیا جاتا ہے۔ عنبرپیٹھ میں سائنٹفک طریقوں سے اس فضلے کی صفائی کی جاتی ہے۔ اور آخر میں نائٹروجنی مرکبات کا ہلکا یا ہوا آبی محلول ان مزرعہ جات پر پھیلا دیا جاتا ہے۔

جن پر نشکر اور مختلف قسم کی ترکاریوں کی کاشت ہوتی ہے۔ اس طرح پر شہر کی صفائی بھی ہوجاتی ہے اور فضلے کے زراعت کے لئے منفعت بخش مرکبات کو بھی ضائع نہیں ہونے دیا جاتا۔ ۱۳۳۳ف سے اضلاع کی ضروریات کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اور باقاعدہ سالانہ امداد کے ذریعہ جس کی مقدار نصف کروڑ تک پہونچ گئی ہے یہ اُمید کی جاتی ہے کہ ریاست ہذا کے بڑے بڑے اضلاع بہت جلد ڈرینج، آبرسانی اور دیگر لوازمات زندگی سے اس طرح فیضیاب ہوں گے جس طرح کہ باشندگان حیدرآباد ہو رہے ہیں۔

ریلویز۔ موٹر بس اور ہوائی سروس:- جنوری ۱۸۸۵ء میں انگلستان کی ایک کمپنی نے ایک عہدنامہ کے مطابق جو ہس کے اور سرکار عالی کی گورنمنٹ کے مابین ہوا تھا۔ یہاں کی ریلویز ۲ کروڑ ۱۸ لاکھ روپیہ میں خرید لی۔ اس کمپنی کا سرمایہ ۴۵ لاکھ پونڈ تھا۔ اس رقم پر بیس برس تک فی صد پانچ ٹکے سود دینے کی سرکار عالی کی گورنمنٹ نے ضمانت کی تھی۔ یہ ضمانتی نظام اسٹیٹ ریلوے حسب منشا جریدہ مُبارک واقع ۱۰ امرار دی بہشت ۱۳۲۹ف ایک محفوظ رقم سے خرید لی گئی۔ اس طرح پر آج سے نصف صدی قبل ہاتھ سے نکلی ہوئی چیز پھر واپس لی گئی۔ یہ اعلیحضرت بندگان عالی کے دورِ حکومت کا ایک نہایت شاندار کارنامہ ہے۔ ریلوی کی خریدی کے بعد اس کساد بازاری کے زمانہ میں بھی فرسودگی کی کامل رقم کی وضعات کے بعد سالانہ ۱۰۸ لاکھ روپیئے وصول ہو رہے ہیں۔ اس وقت ریاست ہذا کی ریلوے ۱۳۴۸ میل پھیلی ہوئی ہے۔ جدید ریلوے کی تعمیر کی تجاویز بھی حکومت کے زیر غور ہیں ریلوئے کے علاوہ گذشتہ ۲ سال میں بس سرویسوں کا آغاز تقریباً ۵۰ لاکھ روپیہ کے سرمایہ سے ریاست میں ہوا۔ فی الوقت حیدرآباد سے ریاست کے مختلف اضلاع تک ۲۸۳ بسیں چل رہی ہیں۔ اور ان کی مسافت ۳ ہزار ۲ سو ۴۸ میل طویل ہے۔ بسوں کی وجہ سے ریاست کے مختلف اضلاع اور حیدرآباد کے باشندوں کو ایک باقاعدہ آرام دہ ارزاں ذریعہ نقل وحمل حاصل ہے ریلوں اور بسوں کے علاوہ ذاتی ہوائی ذرائع نقل وحمل استعمال کرنے کی تجویز بھی سرکار عالی کے زیر غور ہے بالفعل ایک ربع لاکھ سالانہ کی امداد کے ذریعہ جو ٹاٹا کو دیگئی ہے۔ ٹرانس کانٹیننٹل ایرمیل (بری ہوائی میل) کا رخ حیدرآباد کی جانب

پھیر دیا گیا ہے اور اس طرح حیدر آباد دنیا کے دُوسرے اہم ہوائی راستوں سے ملا دیا گیا ہے۔ حیدر آباد میں پرواز گاہ کے لئے موزوں گنجائش مہیا کرکے اُس کا افتتاح بھی کیا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ مملکت ہٰذا میں ہوا بازی کی تربیت کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔

معدنیات دکن کی سرزمین خصوصاً خطہ حیدر آباد قدیم زمانہ میں اپنے ہیروں کیلئے خاص طور سے شہرت رکھتی تھی لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اب یہاں ہیرے کے معادن ختم ہو چکے ہیں۔ البتہ دریائے کرشنا کی وادی میں پرتیال کے گرد و نواح کالی مٹی میں کچھ ہیرے ملتے ہیں۔ لیکن یہ ہیرے اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ ان کے نکالنے میں کوئی فائدہ نہیں ہوتا ہے۔ دوآبہ رائچور میں سُونا دستیاب ہونے کی اُمید پر باقاعدہ کام شروع کیا گیا۔ مگر یہاں سونے کا حاصل اتنا کم ہوا کہ یہ کام بھی ترک کر دیا گیا۔ حال میں ضلع ورنگل میں سنگ مرمر کی ایک چٹان دریافت ہوئی۔ جہاں ایک کمپنی کی تحت سنگ مرمر نکالنے کا کام سرگرمی سے ہو رہا ہے۔ ادنیٰ پیمانہ پر مختلف اقسام کے خام لوہے کے ذخائر بھی گونڈوانہ کی وادی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن ریاست کی اہم ترین معاشی اہمیت رکھنے والی معدنیات کوئلہ ہے۔ کوئلہ کے معادن سنگارینی تعلقہ یلندو میں اور ٹانڈور ضلع آصف آباد میں واقع ہیں۔

سنگارینی کا کوئلہ سنگارینی میں کوئلہ کی کانوں کے کام کی ابتدا آج سے ۶۰ برس پیشتر ہوئی گذشتہ ۲۵ سال میں اسی کان سے تقریباً ایک کروڑ ۳۵ لاکھ ٹن کوئلہ نکالا گیا اور روزآنہ تقریباً ایک ہزار ۷سو ٹن کوئلہ نکالا جاتا ہے یہاں فی الوقت دو کانیں کام دے رہی ہیں ان میں سے ایک کان ۵۰۰ فیٹ گہری اور دوسری ۴۵۰ فیٹ گہری ہے یہ کانیں کوئلہ نکالنے کے تمام جدید سائنٹیفک آلات سے آراستہ ہیں۔ برقی طاقت گاہ دو ٹربینی ملوتن (Turbo-generator) جن میں سے ہر ایک، ایک ایک ہزار کیلو واٹس کی قوت کے ہیں اور چار جوش دان جو جالی دار آتش دان اور ذیلی سامان سے مکمل طور پر آراستہ ہیں مشتمل ہے۔

ٹانڈور کا کوئلہ | ٹانڈور کی کانوں کا کام آج سے ۱۰ برس قبل شروع ہوا تھا اور اس وقت سے برابر ترقی پذیر ہے۔ گذشتہ ۱۰ سالوں میں اس کان سے تقریباً ½ ۶ لاکھ ٹن کوئلہ نکالا گیا۔ یہاں پر بھی فی الوقت دو کانوں میں کام جاری ہے ان میں سے ایک قعر مارگن کے نام سے جو ۵۰۰ فیٹ گہرا ہے مشہور ہے اور دوسری کراسلے کا ڈھوان جس کا میلان ½ ۴ میں ایک ہے ان دونوں کانوں سے مجموعی طور پر روزانہ ایک ہزار ۵ سو ٹن کوئلہ نکالا جاتا ہے۔ یہاں کی طاقت گاہ میں دو تربینی متبادل (Turboalternator) جو ایک دوسرے سے براہ راست مربوط ہیں ایک ایک ہزار کیلواٹس کی گنجائش کے ہیں علاوہ ازیں تین جوش دان بھی ہیں جو زنجیر والے جالی دار آتش دان اور دوسرے ذیلی سامان سے مزین ہیں۔ ان دونوں کانوں میں تقریباً ۱ ہزار آدمی کام کرتے ہیں جن میں سے اکثر کے لئے کانوں کے آس پاس ہی سکونت کا انتظام کیا گیا ہے۔ اور انتظامات آبرسانی حفظ صحت اور سکونت پر خاص توجہ کی جاتی ہے۔

صنعت وحرفت | سائنس کے موجودہ زمانہ میں کسی ملک کی خوش حالی اور بہبودی کا انحصار ایک بڑی حد تک اُس مُلک کی صنعت وحرفت پر مبنی ہے مبارک عہد عثمانی میں دیگر شعبہ جات کی طرح یہاں کی صنعتی ترقیوں کی جانب بھی ہر ممکنہ کوشش عمل میں لائی گئی ہے اس غرض کی تکمیل کے لئے ایک محکمہ صنعت وحرفت قائم کیا گیا۔ نیز سرمایہ ترقی مصنوعات کے نام سے جس کی مالیت ایک کروڑ روپیہ ہے ریاست کی صنعتی نشو ونما کی غرض سے قائم کیا گیا اس فنڈ میں سے بعض بڑے پیمانہ کی صنعتوں مثلاً شاہ آباد سمنٹ فیاکٹری نظام ساگر کارخانہ شکر سازی کو امداد دیجاتی ہے۔ اور اس طرح جو فائدہ حاصل ہوتا ہے اُسے چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کو مدد دینے کے علاوہ ان طلباء کی جو صنعتی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں مدد کی جاتی ہے۔ اب ہم ذیل میں ان مختلف تدابیر کا ذکر کریں گے جو ریاست کی صنعتی ترقیوں کی اغراض کی خاطر اختیار کی گئیں ہیں۔

عثمانیہ مرکزی صنعتی اسکول | عثمانیہ صنعتی مرکزی اسکول ریاست ہذا کی اوّلیں باقاعدہ صنعتی درس گاہ ہے۔ جس کا قیام آذر ۱۳۲۳ف میں ایک فرمان خسروی کے ذریعہ عمل میں لایا گیا۔ اور چونکہ ذات شاہانہ کو ملک کے نوجوانوں کی صنعتی تربیت کا خاص خیال ہے۔ لہٰذا اس درس گاہ کے

قیام کے منظوری کے ساتھ ساتھ اس کو اپنے نام نامی سے موسوم کیئے جانے کا شرف بھی بخشا گیا۔ فی الوقت یہ درس گاہ پتھر کی ایک نہایت شاندار عمارت میں حسین ساگر کے کنارہ واقع ہے۔ طبیعات، کیمیا اور میکنکس کے دارالتجارب تمام ضروری جدید، سائنس کے ساز و سامان سے کامل طور پر آراستہ ہیں ان دارالتجارب کے علاوہ طلباء کو دارالضرب اور محکمۂ برقی کے کارخانوں میں بھی عملی تربیت حاصل کرنے کی تمام سہولتیں حاصل ہیں۔

اس صنعتی درس گاہ کے علاوہ تین اور صنعتی مدارس محکمۂ تعلیمات کے زیر نگرانی ریاست میں موجود ہیں ان میں سے دو مدارس (اورنگ آباد اور نظام آباد) سرکاری ہیں۔ تیسرا مدرسہ واقع نام پلی ایک امدادی مدرسہ ہے۔ ملک میں صنعت و حرفت کے فروغ کے لئے۔ فی الوقت تعلیم کی جدید تنظیم کی تجاویز حکومت سرکار عالی کے زیر غور ہیں۔ ان تجاویز کے نفاذ پر عام تعلیم کے ساتھ ساتھ کثیر حرفتی تعلیم بھی شامل نصاب ہو جائے گی۔ اور اس طرح سائنس اور فنون کی ادبی تعلیم کے ساتھ صنعتی تعلیم بھی عام ہو جائے گی۔ ان کثیر حرفتی اِدارات کے علاوہ جن کا قیام زیر غور ہے آج سے دو سال قبل ہماری حکومت نے پست اقوام کی حالت درست کرنے کے لئے متعدد ابتدائی صنعتی مدارس کھول دیے ہیں۔ ان مدارس میں پست اقوام کے بچوں کو ابتدائی لکھنے پڑھنے کے ماسوا زردوزی، کشیدہ کاری، بیدبافی، سفال سازی اور دیگر دستی صنعتیں سکھائی جاتی ہیں۔ اُمید ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد برکات دَورِ عثمانی سے یہاں کی پست اقوام کا شمار پست اقوام میں باقی نہ رہیگا۔

ادارہ مصنوعات ملکی یہ اِدارہ ۱۹۲۳ء میں ایک لاکھ ۲۰ ہزار کے صرف سے ممالک محروسہ کی گھریلو صنعتوں کی نشو و نما کی خاطر قائم کیا گیا اس کے قیام کی ایک غرض یہ بھی تھی۔ کہ ملک کی قدیم صنعتوں کو جو یورپ کی صنعتوں کے مقابلے میں آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جارہی ہیں زندہ رکھا جائے چنانچہ ریاست کی مشہور قدیم صنعتیں۔ مثلاً بیدری برتن، ورنگل کے قالین، گدوال، اور جگدیو پور کے تلوار کے پھل، نرل کے کھلونے اورنگ آباد اور پائیٹن کے ریشمی کپڑے دولت آباد کے قریب کاغذ پورے کے کاغذ اور دیگر صنعتیں اب بھی نیم جان حالت میں تھوڑی بہت باقی ہیں۔ یورپ اور جاپان کے عظیم الشان کارخانوں میں مشین کے ذریعہ تیار ہونے والی صنعتوں کے سیلاب سے ان مقامی ادنیٰ پیمانوں پر چلنے والی صنعتوں کو محفوظ رکھنے کا صرف یہی ایک

طریقہ تھا۔ کہ ان ملکی قدیم دستی صنعتوں میں مشین کا کام بھی شریک کر دیا جائے۔ چنانچہ اس ادارہ میں دستی صنعتوں میں چھوٹی چھوٹی مشینوں کی مدد بھی شامل کر دی گئی ہے۔

یہ ادارہ مشیر آباد میں ایک حال کی تیار کردہ عمارت میں ہے۔ اس عمارت میں ایک وسیع ہال ہے۔ ادارہ کا تقریباً تمام کام اسی ہال میں ہوتا ہے۔ ایک حصہ میں نساجی کا کام ہوتا ہے۔ کپڑا مشین اور ہاتھ دونوں طریقوں سے بنا جاتا ہے۔ ہاتھ کے ذریعہ جو کپڑا بنا جاتا ہے اس میں فلی شٹل لوم (جدید ساخت کا کرگہ) استعمال ہوتا ہے۔ موزہ بافی اور بنیاین کا کام بھی سکھایا جاتا ہے ساڑیوں اور شالوں پر ہاتھ اور مشین کے ذریعہ کشیدہ کاری بھی ہوتی ہے۔ اسی ہال میں دوسری طرف کمبل، نمدے۔ دریاں بننا سکھائی جاتی ہیں۔ بید بافی، رنگ سازی اور وارنش کا کام بھی جدید طریقہ پر کیا جاتا ہے۔ قلم دوات اور دیگر اشیا بنا کر ان میں نہایت خوبصورتی سے پنیٹنگ کی جاتی ہے۔ حال میں جارجٹ اور کریپ سلک بنانے کے واسطے فرانس سے مشینوں کا ایک بڑا ذخیرہ آیا ہے۔ مثل عثمانیہ صنعتی اسکول کے یہاں بھی طلبار کی عملی اور نظری تعلیم کا انتظام ہے۔ تقریباً ان تمام طلبار کو وظائف دیئے جاتے ہیں۔

اس ادارہ سے متعلق ایک فروخت گاہ بھی ہے اس فروخت گاہ کے نمائش خانہ میں جو باقاعدہ آراستہ کیا گیا ہے۔ اس ادارہ کا تیار شدہ مال ورنگل کے مشہور قالین اور نمدے، بید کے کام کی مصنوعات، نرل کے کھلونے اور اورنگ آباد کا مشہور ہمرو بغرض نمائش رکھا اور فروخت کیا جاتا ہے۔

تجربہ گاہ کیمیائی ریاست ہذا میں سررشتہ صنعت و حرفت کے قیام کے بعد جلد ہی اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک کیمیائی تجربہ گاہ ایسا تیار کیا جائے جس سے یہاں کی صنعت کو خاطر خواہ مدد مل سکے۔ اس مقصد کے لئے ایک موزوں عمارت تیار کی گئی۔ اور اس کو ضروری آلات و مرکبات کیمیائی سے آراستہ کیا گیا۔ یہاں سے پانچ کیمسٹ بنگلور تعلیم کے واسطے بھیجے گئے۔ تاکہ وہاں کی انڈین انسٹیوٹ آف سائنس میں فن کیمیا کی خصوصی تعلیم حاصل کریں بعد میں ایک کیمسٹ انگلستان اس غرض سے بھیجا گیا کہ لیڈس یونیورسٹی میں مصنوعات چرم کا معائنہ کرے۔ دوسرا کیمسٹ بنگلور اس غرض سے روانہ کیا گیا کہ وہاں لاکھ کی تیاری کا کام

سیکھے۔ حصول تعلیم کے بعد ان اصحاب نے یہاں باقاعدہ کام شروع کر دیا۔ سرکاری محکمہ جات اور عوام کی جانب سے وصول شدہ مختلف اشیا پر تجربات کے علاوہ اس شعبہ نے حفاظت گل مہوہ، الکوہل کی تیاری۔ موٹر اسپرٹ، تیاری سریش، انڈین ڈرگس اور دوسرے تشریحی و تالیفی تجربات کئے۔ اس کیمیائی تجربہ گاہ سے متعلق ایک باقاعدہ کتب خانہ بھی ہے اور عمارت کے ایک حصہ میں جراثیم کے امتحان کا بھی انتظام ہے۔

صنعتی کارخانہ جات | شاہ آباد سیمنٹ فیاکٹری۔ یہ کارخانہ اگست ۱۹۲۵ء میں شاہ آباد میں قائم ہوا شاہ آباد۔ جی۔ آئی۔ پی ریلوے پر گلبرگہ کے قریب واقع ہے۔ اور اپنے سنگ سیلو اور چکنی مٹی کے لئے مشہور ہے۔ یہ اشیا سیمنٹ کی تیاری میں بطور خام مال کے استعمال ہوتی ہیں۔ خام مال ابتدا میں پیس لیا جاتا ہے پھر اُس کو پانی کی موجودگی میں خاص تناسب سے ملاکر ایک لزج مائع کی صورت میں جس کو سلری کہتے ہیں۔ تبدیل کرتے ہیں سیمنٹ کی اس طریقہ سے تیاری کا نام گردشی بھٹی کا تر طریقہ ہے۔

یہ کارخانہ پتھر توڑنے کے آلات، چکنی مٹی دہونے کی گرنیاں اور پمپ، خام مال کا تر آمیزہ بنانے کی گردشی بھٹیاں۔ تبریدی آلات سیمنٹ پیسنے کی چکیاں اور دیگر متعلقہ ساز و سامان سے کامل طور پر آراستہ ہے۔ دخانی طاقت حاصل کرنے کے لئے پانی کو گنا ندی سے جو کارخانہ سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر واقع ہے پمپ کے ذریعہ لایا جاتا ہے۔ پانی کو بھاپ میں تبدیل کرنے کے لئے تین آبی نلی والے جوشدان ہیں۔ یہ جوشدان میکانکی زنجیر والے جالیدار آتش دانوں متوازن رات، گرین کے کفائیت گردں اور تکمیلی پر گرم کنندوں اور قائم بالذات فولادی دودکشوں کے ساتھ آراستہ ہیں۔ ان جوشدانوں کی پُرگرم بھاپ ۲۰۰ پونڈ فی مربع انچہ کے دباؤ سے تربینوں کو گردش میں لاتی ہے۔ تربینوں کی گردش سے ایک ایک ہزار کلیواٹس کے دو متبادل حرکت کرنے لگتے ہیں ان کی حرکت سے برقی رَو اور برقی رَو کی قوت سے تمام مشینری حرکت میں آجاتی ہے۔ اس طرح تقریباً ایک لاکھ ۴۰ ہزار ٹن سیمنٹ سالانہ تیار ہوتی ہے۔

گلاس فیکٹری | یہ شیشہ کا کارخانہ بیگم پیٹ سے شمال جانب فتح نگر میں ریلوے لائن کے

کنارے واقع ہے۔ ابتدا میں یہ ایک نیم سرکاری کارخانہ تھا۔ سرکار نے تقریباً ۲۰ ہزار روپیہ سے اس کی مدد کی۔ لیکن مالک کارخانہ کو کئی سال تک مسلسل نقصان برداشت کرنا پڑا اور مجبوراً اس نے اس کارخانہ کو حیدرآباد کے ایک معزز شخص کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس کارخانہ کی ابتدائی ناکامی کے وجوہات پر غور کیا گیا۔ سوڈا، چونا اور سلکا کے آمیزہ کو پگھلانے کے لئے جاپان کے آتشی گھڑوں کی بجائے جدید ساخت کی مستطیل نما بھٹیاں تیار کی گئیں۔ بنگال کے کوئلہ کی بجائے جس کی قیمت حیدرآباد پہنچتے پہنچتے بڑھ جاتی ہے۔ سنگرینی کے ادنی قسم کے کوئلہ کو پوری کامیابی کے ساتھ استعمال میں لانے کی اسکیم زیر غور ہے۔ فی الوقت یہ کارخانہ بغیر کسی نقصان کے چل رہا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اہل ملک اپنے ملک کی ساختہ اشیاء کو خرید کر اس قسم کے کارخانہ جات کی حوصلہ افزائی کریں۔

کارخانہ صابن سازی | چونکہ ریاست ہذا میں بنور روغنی کثرت سے دستیاب ہوتے ہیں۔ اس لئے ایک کارخانہ چھوٹے آلات کے ساتھ جو یہیں بنتے ہیں قائم کرنے کا انتظام کیا گیا۔ تاکہ خانگی استعمال کا صابن تیار کیا جائے ۱۳۲۵ف میں کارخانہ صابن کی مزید توسیع کی گئی اور زیادہ بہتر صابن تیار ہونے لگے۔ اوائل ۱۳۳۴ف میں کارخانہ صابن سازی بحیثیت ایک سرکاری کارخانہ کے بند کر کے اس کو ریاست کے ایک تاجر کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا۔ اب یہ کارخانہ خانگی طور پر چل رہا ہے۔

دیاسلائی سفال سازی بٹن اور متفرق کارخانجات | ریاست ہذا میں دیاسلائی بنانے کے دو کارخانے۔ اسال کے اندر ہی اندر قائم ہوئے یہ کارخانہ محبوب آباد اور حیدرآباد میں واقع ہیں۔ جدید آل انڈیا اکسائیز ڈیوٹی کے نفاذ سے دیاسلائی کے ہر دو کارخانجات میں عارضی طور پر کچھ بے ترتیبی واقع ہو گئی تھی لیکن اب یہ دونوں کارخانجات باقاعدہ کام کر رہے ہیں۔ ریاست میں سفال سازی کے بھی متعدد کارخانہ ہیں۔ بنگلور مینوفیکچرنگ ٹائلس اور پائیپس کمپنی میں مٹی کے روغن دار بڑے بڑے نل، کمروں کے فرش کے واسطے رنگین مختلف نمونوں کے چوکے چھتوں کے واسطے ولایتی کھپرے برقی مشینوں کے ذریعہ تیار کئے جاتے ہیں۔ دکن بٹن فیاکٹری واقع حسینی علم میں مختلف نقش و نگار کے بٹن برقی مشینوں کے ذریعہ اعلی پیمانہ پر تیار ہوتے ہیں

اور تجارتی نقطہ نظر سے کامیابی کے ساتھ چل رہی ہیں۔ دکن فیکٹری کے علاوہ ریاست میں بٹن اور ٹوپی کے پھندنے بنانے کے تین کارخانہ اور ہیں۔ ان کارخانوں میں مختلف قسم کے بٹن پر رَو پہلی، سنہری، رولڈ، گولڈ اور مینا کا کام نہایت خوب ہوتا ہے۔ چار کاغذ سازی کی انجمنیں کاغذی پورہ اورنگ آباد گوڈورویلور واقع میدک اور کورٹلہ واقع کریم نگر میں کام کر رہی ہیں۔ دیسی صنعت کے کاغذ کو مقبول عام بنانے کے لئے سرکار ہر طرح کی کوشش اور توجہ کر رہی ہے۔ آزمائشی کارخانہ قالین بانی ورنگل میں اعلیٰ قسم کے قالین تیار ہوتے ہیں۔ گذشتہ سال ۶۵۶۴ قالین یہاں سے یورپ بھیجے گئے۔ ان کے علاوہ سگریٹ، کشید الکوہل، تیزاب گری برف کے کارخانے۔ کپڑے کی ملیں۔ روئی کی گرنیاں۔ اور متفرق کارخانجات اس مبارک عہد میں قائم ہوئے اور کامیابی سے چل رہے ہیں۔

عطوفات خسروانہ بیرون ممالک محروسہ اعلیٰ حضرت واقدس کی فیاضیاں اور نوازشیں صرف باشندگانِ حیدرآباد ہی تک محدود نہیں ہیں۔ بلکہ ذات شاہانہ کا ابر کرم بیرون ممالک محروسہ پر بھی دُور، دُور برستا ہے ذیل میں وہ عطوفات شاہانہ درج کئے جاتے ہیں جن کا تعلق صرف سائنس سے متعلقہ ادارات اور تعلیمی درسگاہوں سے ہے۔

(نام ادارہ یا درسگاہ)	(عطیہ شاہانہ)
انسٹیٹیوٹ آف سائنس بنگلور	۱۲۰۰۰ روپیہ سالانہ
مسلم علیگڈھ یونیورسٹی	۱۵ لاکھ ۶۰ ہزار روپیہ سالانہ
بھنڈارکر انسٹیٹیوٹ	½ لاکھ ایک ہزار روپیہ کلدار سالانہ
راس انسٹیٹیوٹ لندن	ایک ہزار پونڈ
لیڈی ہارڈنگ میڈیکل کالج دہلی	ایک لاکھ روپیہ
وشوبھارتی کلکتہ	ایک لاکھ روپیہ
جامعہ فلسطین	ایک لاکھ روپیہ
زراعتی پبلک سکول ڈیرہ دون۔	دو لاکھ روپیہ
لیڈی اروِن کالج۔	دو لاکھ روپیہ
امپیریل کونسل آف اگریکلچرل ریسرچ۔	دو لاکھ روپیہ

الغرض ہمارے شفیق بادشاہ عالیجاہ کے ۲۵ سالہ دور حکومت میں سائنس سے متعلقہ ترقیات پر اندرون و بیرون ممالک محروسہ سرکار عالی جس فیاضی سے روپیہ خرچ کیا گیا اور کیا جا رہا ہے اُسکی نظیر ریاست کی تاریخ کے کسی عہد میں نہیں ملتی۔ ہم بارگاہ ایزدی میں بکمال ادب دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ پاک ہمارے فیاض بادشاہ ذیجاہ کی عمر و اقبال میں ترقی اور برکت روز افزوں اضافہ فرما۔

دورِ عثمانی

از

جناب مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ام اے۔ ال ال بی
اُستاد تاریخ جامعۂ عثمانیہ

اس عہدِ مسعود پر روشنی ڈالنے کے لئے جو مہتم بالشان ترقیوں کا مخزن ہے سلطنت آصفیہ کی پچھلی تاریخ بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کیونکہ جس پاکیزہ نصب العین کے ساتھ یہ سلطنت قائم ہوئی تھی اور جو اصول اور اخلاقی محاسن اس سلطنت کی تعمیر میں شامل تھے وہ برابر جاری اور ہر عہد میں ترقی پذیر رہے اور موجودہ پچیس سالہ مُبارک عہد جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور جس کا ہم جشن منا رہے ہیں تمام پچھلی ترقیوں کا تتمہ ہے۔ آج سلطنت آصفیہ کو قائم ہوئے کم و بیش دو سو سال ہوتے ہیں اور یہ عجیب بات ہے کہ اس سلطنت کا ہر عہد اپنی نت نئی ترقیاں لے کر آیا اور اس طریقہ سے یہ سلطنت درجہ بدرجہ دکن کی سیاسی اور اخلاقی تعمیر کرتی رہی جس کو دکن اور دکھنی قومیں کبھی فراموش نہیں کرسکتیں لیکن ان تمام ترقیوں کے باوجود جو اس عہدِ مسعود کے آغاز تک ہوتی رہیں حیدرآباد کو ابھی بہت کچھ کرنا تھا اور اخلاقی اور سیاسی تعمیر کا بہت کچھ سامان جمع کرنا تھا جو زمانہ حال کی خصوصیات کا پورا جواب دے سکے۔ یہ کام قدرت کی طرف سے موجودہ اعلیحضرت خلد اللہ ملکہٗ کے عہدِ مسعود کے لئے ودیعت تھا۔ اس مُبارک عہد نے ایک طرف سلطنت آبدمدت کی دیرینہ روایات اور نصب العین کا پورا احترام کیا اور دوسری طرف زمانہ حال کے اقتضا کے مطابق ترقی کی وہ قوتیں جمع کیں جو ایک متمدن مملکت کے لئے ضروری ہیں۔

اس سلطنت ابدمدت کے قائم کرنے والے دنیا کے بڑے بڑے تاریخ ساز بنے جو بڑے علم و فضل اور تمدنی سرمایہ کے ساتھ ترکستان سے آئے تھے۔ اگرچہ سلطنت آصفیہ کے بانی حضرت مغفرت مآب آصف جاہ اول ہیں لیکن اس سلطنت کی تاسیس میں آپ کے

مقدس باپ اور دادا کا بھی بڑا حصّہ تھا۔ مغفرت مآب کے باپ و دادا شہنشاہ اورنگ زیب کے ابتدائے عہد میں ترکستان سے آئے تھے۔ مغفرت مآب کے دادا خواجہ عابد تھے جو عابد خاں اور قلیج خاں کے خطابات سے سرفراز ہوئے تھے اور باپ شہاب الدین خاں تھے جو غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ کے جلیل القدر خطابات سے ممتاز تھے۔
غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں شخصیتیں دوگونہ قابلیت کی حامل تھیں ایک تو ان کا علم و فضل اور خاندانی وجاہت ان کو تمام امرائے ہندوستان میں ممتاز کرتی تھی۔ کیونکہ جس خاندان سے ان بزرگوں کا تعلق تھا وہ ترکستان کا بڑا نامور خاندان تھا اور جس کے علم و فضل اور پاکیزہ اخلاق کے تمام ترکستان میں چرچے ہوتے تھے۔ ترکستان کی سیاست اور ارادت کی دونوں طاقتیں اس خاندان کے ہاتھ میں تھیں۔ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کو کون نہیں جانتا یہ اکیلی شخصیت آصف جاہی خاندان کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قلیج خاں اور غازی الدین خاں دونوں نوواردوں نے ہندوستان میں بہت جلد اپنی قابلیت کا سکہ بٹھا دیا دوسری بات یہ تھی کہ یہ دونوں بزرگ بڑے اچھے سپاہی بھی تھے۔ انہوں نے شہنشاہ کے ہر آڑے وقت میں کام دیا۔ راجپوتانہ کی کٹھن مہم کھڑی ہوگئی تو شہاب الدین خاں نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال دی اور اس کے بعد مرہٹوں کے معرکے شروع ہوئے اور گولکنڈہ اور بیجاپور کی تسخیر کا سوال پیدا ہوا تو ان دونوں باپ بیٹوں نے اپنے پورے سپاہیانہ دم خم سے کام لیا۔ ان مہموں کے لئے خود شہنشاہ دکن میں آگئے اور سب کام اپنے سامنے سر کئے۔ گولکنڈہ کی تسخیر ۱۶۸۷ء میں ہوئی اس قلعہ کے مشہور محاصرہ میں خواجہ عابد کا انتقال ہوا تھا لیکن مغل مورخ بیان کرتے ہیں کہ اس جگر دار سپاہی نے مرتے وقت جو ہمت اور استقلال کا ثبوت دیا تھا وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ توپ کے گولے سے اُن کا شانہ چور چور ہوگیا تھا اور شاہی جراح مرہم پٹی کے لئے بھیجے گئے تھے۔ جب یہ جراح شکستہ شانہ کی ہڈیاں جوڑ رہے تھے تو لوگوں نے دیکھا کہ خواجہ عابد دوسرے ہاتھ سے قہوہ پی رہے تھے اور پوری خاطر جمعی کے ساتھ اپنے مخاطبین سے گفتگو کر رہے تھے لیکن صدمہ اس قدر

جانکاہ تھا کہ وہ اس سے جانبر ہو سکے اور حمایت ساگر کے نیچے دفن ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ جس وقت خواجہ عابد یہاں دفن ہوئے تھے کسی کو معلوم نہ تھا کہ اُن کا مقدس پوتا سرزمین دکن کا مالک ہو گا۔

جس طرح خواجہ عابد کا نام گولکنڈہ کے محاصرہ کے ساتھ وابستہ ہے ان کے بیٹے غازی الدین خاں فیروز جنگ کا نام بیجاپور کی تسخیر کے ساتھ مربوط ہے۔ یہ تسخیر گولکنڈہ سے ایک سال پہلے عمل میں آئی تھی اورنگ زیب کے منجھلے بیٹے شاہزادہ اعظم اس مہم کے کماندار بنائے گئے تھے۔ لیکن جوں ہی محاصرہ شروع ہوا اندر سے دکھنی فوج اور باہر سے مرہٹہ فوج نے یورشیں شروع کر دیں۔ مرہٹوں نے تو ایسا اودھم مچا دیا کہ مغلوں کو مقابلہ کرنا تو کجا زندہ رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ کیونکہ مرہٹوں نے جنگل اور کھیت جلا دئیے اور رسد کے تمام راستے بند کر دئیے۔ مغل فوج فاقوں مرنے لگی اور ایک مغل مورخ کے الفاظ میں تمام مغل سپاہی پوست و استخواں ہو کر رہ گئے تھے۔ شاہزادہ اعظم اور اس کی بیوی جانی بیگم بصد مشکل ہاتھی پر سے آواز کر کے پژمردہ فوجوں کو آگے بڑھایا کرتی تھیں۔ جب شہنشاہ کو معلوم ہوا تو شہنشاہ نے رسد پہنچانے کی کوشش کی اور اس اڑے وقت شہنشاہ کی نظر میں غازی الدین خاں سے بہتر کوئی اور آدمی نہیں ہو سکتا تھا۔ غازی الدین خاں کو غلہ دیا گیا کہ وہ بیجاپور تک پہنچائیں۔ لیکن مرہٹوں کے ٹڈی دل کو چیر کر مغل فوج تک غلہ پہنچانا غایت درجہ مشکل تھا۔ مرہٹوں نے بھی سمجھ رکھا تھا کہ مغل فوج کی فتح و شکست اس رسد پر موقوف ہے۔ اس لئے اس رسد کو روکنے کی انہوں نے پوری کوشش کر لی اور غازی الدین خاں کو قدم قدم پر مقابلہ کرنا پڑا۔ اگرچہ اس دار و گیر میں بہت کچھ غلہ ضائع ہوا اور دشمنوں کے ہاتھ میں چلا گیا لیکن اس کی ایک کثیر مقدار مغل فوج تک پہنچ گئی۔ غلہ کا پہنچنا حقیقت میں ایک آیۂ رحمت تھا۔ اگر اس وقت غلہ نہ پہنچتا تو مغل فوج کا موت کے مُنہ میں جانا یقین تھا۔ مغل مورخ کہتے ہیں کہ غازی الدین خاں کو دیکھتے ہی شاہزادہ اعظم ہاتھی سے اتر پڑا اور "آفرین کناں غازی خاں را در بغل گرفتہ" شہنشاہ بھی غازی الدین خاں کی اس کوشش سے بہت محظوظ ہوئے اور ان کو ان الفاظ میں دل سے دعا دی "چنانچہ حق سبحانہ تعالےٰ از تر دو خاں فیروز جنگ

شرم اولاد تیمور بہ نگاہ داشت آبروئے اولاد او تا روز قیامت خدا نگاہ دارد" دعا کے ان پرخلوص الفاظ سے جو شہنشاہ کے صمیم دل سے نکلے تھے غازی الدین خاں کا عظیم الشان کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے کس طرح اس اڑے وقت مغل سلطنت کی مدد کی تھی اور یہ دعا اب تک غازی الدین خاں کی اولاد کے شامل حال ہے اس کے بعد غازی الدین خاں مرہٹہ لڑائیوں میں مصروف رہے اور نابینا ہونے کے باوجود وہ فوجوں کی رہنمائی کی نیز برار اور گجرات کی صوبہ داری کی۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ حضرت مغفرت مآب آصف جاہ اول کو جن کا اصل نام قمر الدین خاں تھا دکن میں رہنے کا موقعہ ملا تھا۔ یہ باپ دادا کے ساتھ دکن میں رہے اور بچپن سے دکن کے سیاسی اور جغرافی ماحول کا مطالعہ کرتے رہے اور یہ آئندہ سلطنت آصفیہ کی تاسیس کا سامان تھا۔ چونکہ قدرت اُن کو دکن کی عنان حکومت تفویض کرنے والی تھی اس لئے ایسے حالات بھی فراہم کر دیئے کہ یہ قبل از وقت دکن کی سیاست سے واقف ہو جائیں۔ ورنہ ایک نئے آدمی کے لئے جس کے باپ دادا ترکستان کے نو وارد ہوں دکن میں حکومت کرنا اور اس کے نظم و نسق کے لئے نہایت خوشگوار دستور بنانا آسان نہ تھا۔ لیکن یہ دکن کی خوش قسمتی تھی کہ اس سرزمین میں مغفرت مآب جیسی لائق شخصیت دستیاب ہوگئی جو دکن کے سیاسی ماحول اور اس کی ضروریات کے ہر طرح اہل تھی۔ اس کا اندازہ مغفرت مآب کے لائق نظم و نسق سے ہو سکتا ہے۔ جب مغفرت مآب دکن کے حکمراں ہوئے تو اپنی سیاسی دوراندیشی اور فرض شناسی صرف کر کے آئندہ سلطنت کا جو نظام حکومت تیار کیا اور اپنے جانشینوں کے لئے جو لائحہ عمل تیار کیا تھا وہ سب اس بات کی دلیل ہے کہ مغفرت مآب اس زمانہ میں واحد آدمی تھے جو یہ بار گراں برداشت کر سکتے تھے۔ اگر کچھ نہیں تو مغفرت مآب کی وہ زرین وصیتیں جو اُنہوں نے اپنے انتقال کے وقت فرمائی تھیں ان کی سیاسی قابلیت ظاہر کرتی ہیں کہ وہ دکن اور اہل دکن سے کس طرح واقف تھے اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مغفرت مآب کی زرّین وصیتیں جو اُنہوں نے آخری وقت فرمائی تھیں ہمیشہ سلطنت آصفیہ کے زیب عنواں رہیں۔

لیکن ایک اور قابل قدر چیز جو اس سلطنت کی تعمیر میں شامل ہے وہ اس کے بانیوں کے اخلاقی محاسن ہیں۔ وہ چیز ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیئے کہ حضرت مغفرت مآب نے سلطنت آصفیہ قائم تو کرلی لیکن اپنے جذبہ وفاشعاری کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ سلطنت آصفیہ کی تاسیس کو مغفرت مآب کی بغاوت پر محمول کریں۔ لیکن واقعات بتاتے ہیں کہ یہ تاسیس انتہائی وفاداری کا مظاہرہ تھا۔ اول تو مغفرت مآب سادات بارہہ کے مقابلہ میں مالوہ سے نکلکر برہان پور آئے تھے اور حسین علی خاں بارہہ کی فوجوں کو شمال اور جنوب دونوں جگہ شکست دیکر اورنگ آباد میں قدم جمایا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ فعل تو سرتاپا شہنشاہ کی وفاداری پر مبنی تھا اور اس سے شہنشاہ بھی بہت خوش ہوئے تھے۔ اس کے بعد حسین علی خاں اور اس کے بھائی قطب الملک کا خاتمہ ہوا اور جس سازش سے ان کا خاتمہ ہوا تھا اس میں مغفرت مآب اور اُن کا خاندان شریک تھا اور یہ مغل سلطنت کی عین خدمت تھی یعنے اس سے محمد شاہ کو سادات بارہہ جیسے بیوفاؤں سے آزاد کیا گیا تھا اور اس طرح شہنشاہ اس ترکمان خاندان کے دل سے بہی خواہ تھے۔ جب شہنشاہ آزاد ہو گئے اور عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی تو اس کے رتق وفتق کے لئے مغفرت مآب کی ضرورت تھی اور یہ دکن سے بلائے گئے۔ مغفرت مآب کو کیا عذر ہو سکتا تھا یہ فوراً شمال گئے۔ آصف جاہ خطاب اور مغل سلطنت کی وزارت جلیلہ حاصل کی۔ چنانچہ عنان وزارت ہاتھ میں لینے کے بعد مغفرت مآب نے مغل سلطنت کی دیکھ بھال شروع کی۔ لیکن اورنگ زیب کے انتقال کے بعد سے دس پندرہ سال کے عرصہ میں سلطنت میں جگہ جگہ رخنے پڑ گئے اور ہر طرف گھن لگ رہا تھا۔ چونکہ مغفرت مآب اورنگ زیب کے زمانہ کے منجھے ہوئے آدمی تھے اور ان کی نظر اس قدر وسیع تھی کہ وہ سلطنت کی ہر کمی پوری کر سکتے تھے۔ اس لئے اُن کی دور رس نظر نے تمام حقائق سے واقفیت پیدا کرلی کہ اب حکومت کو کیا کرنا ہے اور اس کے مطابق انہوں نے پیش نامہ مرتب کرلیا جو اس زمانہ کے حالات کا لحاظ کرتے مغل سلطنت کے بچاؤ کا پورا سامان تھا۔ اور یہ کامیاب پیش نامہ صرف آصف جاہ ہی بتا سکتے تھے۔ یہ کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔ لیکن مشکل یہ تھی محمد شاہ اور اُن کا دربار اس پیش نامہ کی حقیقت

سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس کا مضحکہ اڑایا گیا۔ جب کبھی یہ اپنا پیش نامہ لکھکر دربار میں جاتے تھے تاکہ اس کو روبراہ کیا جائے محمد شاہ رنگیلے کا دربار ہنسی اڑاتا تھا۔ ان حالات میں مغفرت مآب اور ان کا پیش نامہ بالکل بے کار ثابت ہوا مغفرت مآب نے دو سال انتظار کیا اور شہنشاہ کو مفید مشورے دینے کی کوشش کی لیکن حالات ایسے ہمت شکن تھے کہ ان کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی تھی۔ بالآخر مغفرت مآب مجبور ہو کر دکن چلے گئے اور ۱۷۲۴ء میں خود مختار ہو گئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مغفرت مآب کے دکن آنے سے محمد شاہ بہت خفا ہوئے اور ان کو باغی قرار دیا تھا لیکن جن حالات میں مغفرت مآب دکن آئے تھے وہ خود ثابت کرتے ہیں کہ ان کا یہ فعل ہر طرح جائز اور ہندوستان کی آئندہ سیاست کے لئے ہر طرح مفید مطلب تھا۔ دو سال کے تجربہ سے معلوم ہو گیا تھا کہ مغفرت مآب مغل سلطنت کی کوئی خدمت نہیں کر سکتے تھے۔ مغل سلطنت زوال کے گڑھے میں جارہی تھی اس کا روکنا اب کسی مُدبّر کے بس کی بات نہ تھی۔ کیا ایسی صورت میں مرکزی حکومت کیلئے دکن کو بھی مرہٹوں کے بھینٹ چڑھانا مفید ہوتا۔ اگر مغفرت مآب دکن نہیں آتے تو دکن کی سلطنت آصفیہ جو مغل سلطنت کی نام لیوا ہے کبھی نہیں قائم ہوتی بلکہ یہاں اُس کی جگہ مرہٹہ طاقت ہوتی غالباً اُس کی پیش بندی کرکے مغفرت مآب نے شمال کو چھوڑ دیا اور دکن میں خود مختاری حاصل کرکے مغل سلطنت کی تمام روایتیں محفوظ کر دیں اور یہ اُن کی عین وفاداری تھی۔ لیکن ان کی وفاداری کے اس سے زیادہ شواہد ہیں مغفرت مآب خود مختار تو ہو گئے لیکن خود مختاری کے شاہی لوازم۔ تخت، چتر اور شاہی القاب استعمال نہیں کئے۔ حیدرآباد کا سکہ بنایا گیا تو اس کے ایک طرف اپنا نام رکھا تو دوسری طرف شہنشاہ اورنگ زیب کا نام رکھا۔ یہ سب چیزیں مغفرت مآب کی وفاداری کے بین ثبوت ہیں۔ اس کے علاوہ دکن میں آنے کے بعد مغفرت مآب نے محمد شاہ کو جو خط لکھا تھا وہ بھی اُن کی وفاداری کا ثبوت دیتا ہے۔ اس خط میں پہلے شہنشاہ کی کوتاہی بتائی کہ ان کے پیش نامہ کو چلنے نہیں دیا۔ اب وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے تھے اس میں شہنشاہ کا قصور ہے۔ ان حالات میں ان کا دکن آنا بہت ضروری تھا ورنہ شمال کی طرح

دکن بھی مغل حکومت کے پنجہ سے باہر نکل جاتا۔ لیکن آخر میں حضرت مغفرت مآب نے یہ کہا کہ جب مغل سلطنت کو میری خدمات کی ضرورت ہو میں حاضر ہوں۔ یہ صرف الفاظ ہی نہیں تھے بلکہ مغفرت مآب نے اس کی پوری پابندی بھی کی۔ چنانچہ جب ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے حملہ کیا تو اس نازک وقت میں مغفرت مآب کی ضرورت محسوس ہوئی اور محمد شاہ نے ان کو شمال بلایا یہ فوراً چلے گئے اور فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لی۔ جب نادری فوجیں دہلی میں آگئیں اور قتل عام شروع ہوا تو اس قتل کو انہوں نے ہی مسدود کروایا۔ اس کے علاوہ انتقال کے وقت اپنے بیٹے ناصر جنگ کو جو وصیتیں فرمائی تھیں ان میں ایک وصیت وفاداری کے متعلق تھی۔ ناصر جنگ سے کہا کہ جس طرح میں مغل سلطنت کا وفادار رہا ہوں اسی طرح تم کو بھی وفادار رہنا چاہیئے۔ اس سے زیادہ اور کیا وفاداری کا ثبوت ہو سکتا ہے۔

ان اخلاقی محاسن کے ساتھ اس سلطنت کی تعمیر میں ترقی پذیر مادہ بھی شامل کیا گیا تھا کہ جیسے حالات ہوں انہیں کے مطابق سلطنت کو آگے بڑھایا جائے۔ اور عجیب اتفاق ہے کہ دو سو سال کے دوران میں اس سلطنت ابد مدت کو بیسیوں انقلابات سے دوچار ہونا پڑا لیکن اس سلطنت کی تعمیر میں کچھ ایسا ترقی پذیر مسالہ جمع کیا گیا تھا کہ وہ ہمیشہ ہر جدید حالات کا مقابلہ کرتا رہا اور سلطنت کو انہیں حالات کے قالب میں ڈھالتا رہا۔ حضرت مغفرت مآب کے انتقال کے بعد جو دور آیا وہ کچھ کم پر آشوب نہ تھا۔ جب غفراں مآب نواب نظام علی خاں سریر آرائے سلطنت ہوئے تھے سلطنت آصفیہ متعدد دشمنوں کے نرغے میں گھری ہوئی تھی۔ کمپنی مرہٹے اور جنوب میں میسور کی مخالف طاقت تھی اور اس سخت منجدھار میں سے سلطنت کے سفینہ حیات کو صحیح سالم نکالنا تھا۔ اور یہ حضرت غفراں مآب کی غیر معمولی قابلیت تھی کہ انہوں نے نہ صرف دشمنوں کا مقابلہ کر لیا اپنی ہستی باقی رکھی بلکہ سلطنت کو نظم ونسق کے اعتبار سے اس قابل بنایا کہ موجودالوقت حالات کا مقابلہ کر سکے۔ انیسویں صدی کے وسط میں جب غفراں منزل نواب ناصر الدولہ بہادر کا انتقال ہوا اور مغفرت مکان نواب افضل الدولہ بہادر سریر آرائے سلطنت ہوئے تو ہندوستان میں غدر پھوٹ پڑا اور ہندوستان کی فضا اس قدر وحشتناک ہو گئی کہ تمام مدبروں کے حوصلے پست ہو گئے تھے۔ لیکن حضرت مغفرت مکان اور ان کے

وزیر باتدبیر نواب مختار الملک کی قابلیتیں برابر کام کرتی رہیں۔ غدر کا کامیاب مقابلہ کیا گیا اور حالات اطمینان بخش ہو گئے لیکن اس غدر سے جو سیاسی اور معاشرتی تبدیلیاں ہوئی تھیں اُن کا اثر رُکنے والا نہ تھا۔ ہندوستان کے ساتھ حیدرآباد بھی ان سے متاثر ہو کر رہا۔ نواب مختار الملک نے جو حیدرآباد کے بہت بڑے محسن ہیں جدید حالات کا مطالعہ کر کے حیدرآباد کو بھی اسی راستہ پر ڈالنے کی کوشش کی۔ حضرت غفراں مکان کی کمسنی کے زمانہ میں ملک کے تمام سیاہ و سفید نواب مختار الملک کے ہاتھ میں تھے ایک طرف ملک رانی تھی کھوئے ہوئے مقبوضات کو دوبارہ حاصل کرنا تھا لیکن سب سے زیادہ کام یہ تھا کہ حیدرآباد کو جدید نظم و نسق کی زنجیروں میں جکڑ کر جدید ہندوستان کا مقابل بنایا جائے۔ اس میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی اور سچی بات یہ ہے کہ اس وقت جو نظام حکومت ہے اس کا پچاس فیصدی سے زیادہ مختار الملک کا بنایا ہوا ہے یا کم از کم اس کی تمام بنیادیں اور پائے ان کے ڈالے ہوئے ہیں۔

جب ۱۹۱۱ء میں موجودہ اعلیحضرت قدر قدرت نے تخت پر جلوس فرمایا تو ہندوستان کیا تمام دنیا کے حالات دگرگون ہونے لگے۔ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم چھڑ گئی۔ اس میں تمام دنیا کا باوا آدم نرالا ہو گیا۔ پرانی سلطنتیں ٹوٹ پھوٹ گئیں نئی سلطنتیں بن گئیں سلطنتوں کے دساتیر بدل گئے۔ معاشرہ کی تمام ساخت بدل گئی۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں دو سو سال کا پرانا نظام حکومت کام نہیں دیسکتا تھا تاوقتیکہ اس میں جدید اقتضاء کے مطابق ضروری تبدیلیاں نہ کی جاتیں۔ اعلیحضرت حکیم السیاست کی علمی اور عملی قابلیت ہر موقعہ پر کارفرما رہی۔ اعلیحضرت قدر قدرت نے اپنی مملکت اور دنیا کے جدید حالات کا مطالعہ کر کے وہ علمی اور عملی تبدیلیاں کیں جس کی برکتیں سالہائے سال تک بلکہ صدیوں تک حیدرآباد اور اہل حیدرآباد کو فیضیاب کرتی رہینگی اور بعض تبدیلیاں اور کارنامے تو ایسے ہیں کہ ان سے ہندوستان بھی فیضیاب ہو رہا ہے اور کئی پشتوں تک ہوگا۔ بات یہ ہے کہ اول تو سلطنت آصفیہ کی تاسیس اور تعمیر خود ایسے مسالہ سے ہوئی تھی جو ہر زمانہ کے جدید حالات کا مقابلہ کر سکے دوسرے حیدرآباد کی یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ اس کو ایک بہت بڑا لائق ناخدائے سیاست

رہ گیا جس کا شمار دنیا کے بڑے مشاہیر میں ہے۔ اعلیٰحضرت قدر قدرت کی علمی و عملی قابلیت
پوری طور پر واضح کی جائے تو اس کے لئے ایک جداگانہ کتاب کی ضرورت ہے۔ اعلیٰحضرت
کے فطری جوہر سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اس پر طرّہ یہ کہ تعلیم و تربیت کے بیش بہا اثرات
نے جو کام کیا وہ چھپے ہوئے نہیں ہیں بلکہ وہ ملک رانی کے ہر پہلو سے واضح ہیں۔ اس
وقت دنیا کا کوئی حکمراں ایسا پیش نہیں کیا جا سکتا جو مشرقی اور مغربی علوم کا جامع ہو مشرقی
اور مغربی سیاست اور حکمرانی کے قیمتی تجربوں سے پوری طور پر بہرہ اندوز ہو۔ باوجود دولت
و کامرانی کے سادہ زندگی بسر کرے اور اپنے پر عیش و آرام حرام کر کے دن رات ملک
اور عزیز رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے وقف ہو سچ تو یہ ہے کہ صرف حیدرآباد کو ہی تنہا
اس بات کا فخر حاصل ہے کہ دنیا کا بہت بڑا حکمراں اس کا ناخدا ہے۔

ہر مملکت کا نصب العین جو اس کے پیش نہاد ہمت ہونا چاہیئے ہمیشہ بحث طلب
رہا ہے کہ مملکت کو بالآخر کیا کرنا چاہیئے۔ قدیم زمانہ میں کچھ رہا اور قرون وسطیٰ میں کچھ ــــ
اس کی تاریخ بتانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ زمانہ حال جس مقصد اور نصب العین کا قائل ہے وہ
صرف اس قدر ہے کہ ایک طرف مملکت کے تمام قدرتی ذرائع سے جو قدرت کی طرف سے ودیعت
ہیں پورا فائدہ اٹھایا جائے اور دوسری طرف اہل مملکت کی ذہنی اور جسمانی تعمیر کی جائے۔
اس زمانہ میں بھی دو مقاصد ہر مملکت کے نصب العین میں شامل ہوتے ہیں یعنے ہر مملکت
چاہے وہ مشرقی ہو یا مغربی پہلے اپنے قدرتی ذرائع کو دریافت کر کے ان سے فائدہ اٹھاتی
ہے یعنے معاشی ترقی کے ہر ممکنہ وسائل سوچتی ہے اور اُن کو روبراہ کرتی ہے تاکہ ملک
کی دولت میں اضافہ ہو اور وہ معاشی اعتبار سے دنیا کا مقابلہ کر سکے دوسرے اہل ملک
کی ذہنی اور جسمانی تربیت کر کے اُن کو ایک زندہ قوم بناتی ہے قوم کی زندگی کا راز یہ
ہے کہ ان کے دل و دماغ کو مانجھکر ان کی خفتہ قوتوں کو جگایا جائے تاکہ وہ ان قوتوں سے
خود اپنی خدمت کریں اور ان قوتوں کو یکجا کر کے ملک کی خدمت کریں۔ اور اگر یہ دونوں
مقاصد مملکت کے پورے ہو جائیں تو اس کا شاہراہ ترقی پر گامزن ہونا یقینی ہے اور وہ
ایسی طاقت ہو گی کہ اس کا مقابلہ ناممکن ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت جو بڑی مملکتیں ہیں

ان کا راز صرف اس قدر ہے کہ ایک طرف انہوں نے ملک کے قدرتی ذرائع سے پورا فائدہ اُٹھایا اور دوسری طرف اہل ملک کی ذہنی اور جسمانی تربیت کی اور اس طرح وہ ناقابل تسخیر ہو گئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حیدرآباد نے ان مقاصد کی کہاں تک تکمیل کی۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو پچیس سالہ عہد مسعود کی تمام کارفرمائیوں کو حصر کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حیدرآباد کا نصب العین بھی صرف یہی تھا۔ یہی دو مقاصد اس کے پیش نہاد ہمت تھے اس نے اپنے قدرتی ذرائع سے پورا فائدہ اُٹھایا اور اہل ملک کی ذہنی تربیت کے ذخیرے جمع کر دئے۔

ان دونوں کارفرمائیوں کو الگ الگ کر کے دیکھنا چاہیئے۔ جہاں تک قدرتی ذرائع کا تعلق ہے وہ درحقیقت اچھی تفصیل کا محتاج ہے۔ یہ چھوٹا مضمون اس تفصیل کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ باغ عام کی نمائش ان تمام ترقیوں اور کارفرمائیوں کا زندہ مرقع تھا ہر سررشتہ کی رپورٹ زبان حال سے اس کی وضاحت کرتی ہے۔ لیکن یہاں اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ اس پچیس سالہ عہد نے ملک کے قدرتی ذرائع کی پوری چھان بین کی۔ ان چیزوں اور مواقع کو دیکھا جہاں ترقی کی گنجائش تھی، معدنیات دیکھے۔ جنگلات دیکھے، زراعت کو ترقی دینے کے ممکنہ وسائل سوچے۔ یہ ہر شخص جانتا ہے کہ دکن ایک زراعتی ملک ہے۔ زراعت کے ساتھ یہاں ایسی پیداوار خام ہی پیدا ہو سکتی ہے جو صنعت و حرفت میں ترقی دے۔ لیکن دکن کی بارش قابل اعتبار نہیں۔ کبھی دکن کی بارش پر اعتماد نہیں ہو سکا۔ اب زراعت کو فروغ دینے کا ایک ہی ذریعہ ہے یعنے پانی کی ایسے خزانے جمع کئے جائیں جو استقلال کے ساتھ زراعت کی مدد کر سکیں۔ عثمان ساگر، حمایت ساگر اور نظام ساگر کی تعمیر لاکھوں روپیوں کے خرچ سے کی گئی اور یہ عظیم الشان خزانہ آب اپنی تمام امید افزا وسائل ترقی کے ساتھ برطانوی ہند میں بھی بہت کم پائے جاتے ہیں تنگبھدرا کا منصوبہ پورا ہو جائے تو اس سے بھی بہت بڑا اضافہ ہوگا ان خزانوں کے جو فائدے ہیں وہ کسی بیان کے محتاج نہیں ہیں۔ ہزاروں ایکڑ زمینیں جو خشک اور بنجر پڑی ہوئی تھیں وہ سیراب ہو گئیں اور وہ دن دور نہیں کہ وہ اہل زراعت کی محنتوں سے سونا اگلنے لگیں گی۔ محکمہ زراعت کی ترقی اور اس کی زندگی سے بھی

اس موضوع میں جان پڑگئی۔ زراعت کے ہر شعبہ میں فروغ محسوس ہو رہا ہے۔ اس طرح معدنیات جنگلات اور صنعت و حرفت کا حال ہے۔ غرض تمام قدرتی ذرائع سے فائدہ اُٹھایا جارہا ہے اور آئندہ ترقی کے لئے راستے صاف کئے گئے۔

اب رہی ذہنی ترقی وہ پچیس سالہ عہد مسعود کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ذہنی تربیت کے قریبی وسائل سوچنے اور اُن کو مرتب کرنے سے پہلے ان کے تمام محرکات کو پیدا کرنا بھی ضروری تھا جو بالواسطہ ذہنی تربیت کے باعث ہوسکتے ہیں۔ منجملہ اور محرکات کے خود حکومت کے آلات کو منظم اور زمانہ حال کے اقتضا کے مطابق شگفتہ کرنا تھا۔ جنگ کے بعد جو حالات بدلے تو ہر جگہ حکومت میں جمہوریت اور عمومیت کے عناصر پیدا ہونے لگے ملوکیتیں قائم رہیں لیکن ان میں حسب ضرورت عُمومی عنصر بڑھائے گئے۔ اعلیٰحضرت قدرقدرت نے بھی حیدرآباد کے نظام حکومت میں تھوڑی تبدیلی کرکے وہ شان پیدا کردی جو عمومی حکومتوں میں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ "باب حکومت" قائم کی گئی جس میں تمام وزرأ باہمی مشورہ سے مملکت کی تجاویز سوچیں اور ان کو روبراہ کریں۔ یہ مشورہ باب حکومت کے قیام سے پہلے مفقود تھا ہر وزیر جو معین المہام کہلاتا تھا اپنے ذاتی صوابدید سے کام کرتا تھا اور غالباً اس کے نتائج اتنے اچھے نہیں ہوتے تھے۔ لیکن اب باب حکومت کی اجتماعی تشکل سے مملکت کے رتق وفتق میں ایک عمومی شان پیدا ہوگئی ہے جو عمومی مملکتوں کو حاصل ہے۔ اور اس کے اُوپر رئیس وقت کی بلندتریں قابلیت ہر کمی پوری کرنے اور ملک کی صحیح رہنمائی کرنے کیلئے موجود رہتی ہے۔ یہاں باب حکومت کے فیصلوں اور مشوروں میں جو خامی ہوتی ہے وہ اُوپر کی رہنمائی سے دفع ہوجاتی ہے۔

جدید آلات حکومت کی رہنمائی سے جس میں ایک عمومی شان پائی جاتی ہے جو مفید نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔ ظاہر ہے اس سے ملک کی ذہنی تربیت کا بہت بڑا سامان جمع ہوگیا۔ ذہنی تربیت اچھی تعلیم اور اس کے خاطر خواہ انتظام پر موقوف ہے۔ تعلیم کی کئی منزلیں ہوتی ہیں۔ تعلیم کی پہلی منزل جہاں ایک بچہ اپنے گھر سے نکل کر مدرسہ میں داخل ہوتا ہے بہت اہمیت رکھتی ہے اور یہ اس وجہ سے اہم ہے کہ اس کے

نقوش ایک بچے کے دماغ میں آخری عمر تک رہتے ہیں اچھے نقوش ہوں تو اچھے اور برے ہوں تو برے اور ان کے اچھے اور برے نتائج ایک طالب علم کے عمر بھر تک شامل حال رہیں گے۔ اس کے بعد ثانوی تعلیم کی منزل آتی ہے اور یہ بھی اپنی جگہ کم اہم نہیں ہے۔ ان چیزوں کی اہمیت کے مدِنظر اس پچیس سالہ عہد مسعود میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے انتظام میں جس قدر مبالغہ کیا گیا ہے وہ کسی تعریف کا محتاج نہیں ہے خود ملک کے تمام ارباب تعلیم اس کام کے لئے مصروف کئے گئے، اور ہندوستان اور ہندوستان کے باہر جہاں اچھے نظام تعلیم پائے جاتے ہیں ان کا مطالعہ کیا گیا۔ چنانچہ جاپان اور ٹراونکور کے مخصوص نظام تعلیم سے استفادہ کیا گیا اور جو کمی تھی ان سے پوری کی گئی۔ ابتدائی تعلیم بالکل مفت کی گئی تاکہ ہر طالب علم بلا دقت تعلیم سے استفادہ کر سکے نیز یہ آئندہ جبری تعلیم کا پیش خیمہ بنایا گیا۔ جب اس طرح راستہ صاف ہو جائے تو جبری تعلیم کا بھی انتظام ہو سکتا ہے۔ مقامی زبانوں پر بھی زور دیا گیا کہ بچوں کی تعلیم سہل اور عام فہم ہو سکے۔ اور یہ سب انتظام کچھ کم اُمید افزا نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود حکومت وقت کی نظر اس قدر وسیع اور حوصلے اس قدر بلند ہیں کہ یہ انتظام بھی کافی نہیں سمجھا جا رہا ہے چنانچہ اعلیحضرت قدر قدرت نے اپنے جواب اڈریس میں ارشاد فرمایا تھا کہ ابھی ترقی کی بہت گنجائش ہے۔

اعلیٰ تعلیم کے دائرہ میں حیدرآباد نے جو خدمت انجام دی وہ عہد آفریں کہی جا سکتی ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام اس عہد مسعود کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اگر اور چیزوں کو نظر انداز کر دیا جائے جامعہ عثمانیہ اکیلی اس عہد کی عظمت واضح کرنے کے لئے کافی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جامعہ عثمانیہ کا قیام اور اس کے انوکھے اسلوب تعلیم کا نہ صرف حیدرآباد بلکہ ہندوستان ہمیشہ ممنون رہے گا اور اس عہد کو دنیا صدیوں تک یاد کرے گی۔ مادری زبان صرف صحیح ذریعہ تعلیم ہے۔ تعلیم اس کے ذریعہ اچھی طرح سرایت کر سکتی اور جزو بدن ہو سکتی ہے گویا دوسرے الفاظ میں ایک بچہ کی پرورش مصنوعی دودھ سے نہیں بلکہ شیر مادر سے ہوتی ہے۔ اس کی اہمیت اس جامعہ کے نتائج سے ہو سکتی ہے

یہ اگرچہ ایک نوخیز جامعہ ہے اور اس کو قائم ہوئے ابھی بیس سال نہیں ہوئے لیکن قلیل مدت میں اس جامعہ نے جو امید افزا نتائج ادب اور علوم کی شکل میں حاصل کئے ہیں وہ ملک کا بڑا سرمایہ ہے اور وہ کسی جامعہ کو حاصل نہیں ہے۔ ہر شعبہ میں ایک نئی اُپج ہے۔ ہر شعبہ علم و ادب اپنی پوری قوت کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے اور اگر جامعہ اور اس کی پیداوار کی یہی رفتار رہی تو یہ دنیا کی بہت بڑی جامعہ ہو کر رہیگی اور پورے ہندوستان کو سیراب کرے گی۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ ملک میں اس جامعہ کی مدت سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ جب ملک میں تمام کاروبار اُردو میں ہوتے تھے۔ دفتر اُردو میں تھا۔ قانون اور تمام قانونی کارروائیاں اُردو میں ہوتی تھیں تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ تعلیم اُردو میں نہ ہو۔ اُردو حیدرآباد کی زبان ہے جو سب بولتے ہیں اور اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں اور تعلیم بھی آسانی سے ہوسکتی تھی چنانچہ جب جامعہ قائم کردی گئی تو ہر علم و فن اُردو میں پیش کردیا گیا جو حیدرآباد اور اہل حیدرآباد کے لئے نئی چیز نہیں تھی۔ باہر کے لوگ اس تعلیم اور ذریعہ تعلیم کو دیکھکر حیرت کرتے تھے لیکن حیدرآبادیوں کو حیرت کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی کیونکہ حیدرآباد میں ہر چیز اُردو میں ہوتی ہے۔ نیز حیدرآبادیوں کو ملک کے اُردو کاروبار کے لئے تیار کرنا ہے کہ یہ طلبہ جامعہ سے خارج ہوکر ملک کے ہر گوشہ میں پھیلیں اور ملک کے نظم ونسق میں حصہ لیں اور ظاہر ہے کہ یہ غرض انگریزی ذریعہ تعلیم سے پوری نہیں ہوسکتی۔ انگریزی ذریعہ تعلیم جو بہت زمانہ سے حیدرآباد میں رائج تھا وہ کسی طرح مفید مطلب ثابت نہیں ہوا اور اس کی پیداوار کبھی اُمید افزا نہیں ہوئی اور اس سے ملک کو کوئی مواد نہیں ملا۔

عہد عثمانی میں اُردو ادب کی ترقی

از

جناب عبدالقادر صاحب سروری ام۔ اے، ال ال۔ بی (عثمانیہ)
پروفیسر اُردو جامعہ عثمانیہ

آج سے ربع صدی قبل، اُردو زبان اور ادب، اپنے مصلحین کی مساعی کی پہلی کرنوں سے منور ہونے لگے تھے، اور شمالی ہند میں حالی، نذیر احمد، شبلی اور شرر اور دکن میں کیفی، توفیق وغیرہ ابھی بقیدِ حیات تھے، اور برابر اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ اپنی زبان اور ادب کا ذخیرہ بھی اگلی رسم پرستی کی زنجیروں سے خلاصی پائے اور دنیا کی متمدن زبانوں اور ادب کی صف میں آجائے۔ لیکن ان کی اصلاحی تحریکات کی مخالف قوتوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ قدیم اساتذہ کی ایک بڑی تعداد ایسی تھی، جو ان مصلحین کی جدت طرازیوں کو شبہ کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اور جب موقع ملتا اس کے خلاف اپنے خیالات کے اظہار سے؛ ان تحریکات کے خلاف ردّعمل پیدا کرنے کی کوشش سے نہیں چوکتی تھی۔ یہ ایسے اسباب تھے کہ ان کی وجہ سے مصلحین ادب کے ذہنوں میں بھی، آئندہ کے متعلق کوئی معین تصور جمنے نہیں پاتا تھا۔ اور یہ لوگ ملک کی قدامت پرستی سے نالاں تھے۔ قدامت پرستی کے جذبہ کی کارفرمائی کے سبب کسی نئی تحریک کا اثر جمنے نہیں پاتا تھا۔ ایسی فضا میں سرزمینِ دکن کی عنانِ حکومت ایک روشن خیال اور زبردست حکمران کے ہاتھوں میں آتی ہے۔ یہ ہستی اپنی روشن خیالی اور علم و ادب سے غیر معمولی شغف کے سبب ان مصلحین کی سرپرستی پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ نئی تحریکات کے بانیوں کی ذاتی اور شخصی طور پر مدد کی جاتی ہے تاکہ انہیں پشت پناہی حاصل ہو۔ اور وہ مایحتاج زندگی کی فکر سے آزاد ہو کر اپنے مقدس کام میں اطمینان کے ساتھ منہمک ہو سکیں۔ حالی، شبلی، نذیر احمد، مشتاق حسین، سید احمد، غرض ہند کے دُور دراز خطوں کے اہلِ کمال پر اس ذاتِ شاہانہ کا پرتو سایہ فگن ہوتا اور بواسطہ یا بلاواسطہ

ان کی ہمت افزائی کا باعث ہوتا ہے۔ اور وہ اپنی علمی و ادبی خدمات میں برابر منہمک رہتے ہیں۔

ان شخصی اعانتوں کے باوجود، مرکز کا فقدان، ان باکمالوں کی مساعی کے اجتماعی زور اور اہمیت حاصل کرنے میں سدراہ بنا رہتا ہے۔ ذات شاہانہ کی دوربین نظریں اسکو بھی تاڑ لیتی ہیں۔ اور سارے ہندوستان کی اُردو دنیا کے لئے آپ کی فیاضی اور روشن خیالی ایک مرکز، جامعہ عثمانیہ کی صورت میں تشکیل فرماتی ہے۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ، ایک نازک مرحلہ پر، اور ایک ایسے دَور میں کہ اُردو ادب اصلاح کی شاہراہ پر داخل ہونے کے لئے آمادہ ہو رہا تھا، اعلیحضرت سلطان العلوم کی علمی دلچسپیوں اور شہرۂ آفاق فیاضیوں نے اس کی ایسی خدمات انجام دیں، جو عہد آفریں ثابت ہوئیں۔ ان دلچسپیوں اور فیاضیوں کی بدولت اُردو زبان اور ادب کے منتشر حواس کو مجتمع اور ہم آہنگ ہو کر، اپنی زبان اور ادب کی عظمت کے لئے کارنمایاں انجام دینے کا موقع ملا۔

ذات شاہانہ کی سریرآرائی کے وقت، اُردو ادب، نظم اور نثر دونوں میں جدید خیالات سے روشناس ہونے لگا تھا لیکن ہر چیز ابھی تک غیر معین تھی۔ اس عظیم الشان زبان اور اس کے پرعظمت ادب کے امکانات پوری طرح ظاہر نہیں ہو سکے تھے۔ کیونکہ منتشر تحریکات کو، ایک جسم نامیہ میں تشکیل دینے والے کی کمی تھی۔ پھر ہندوستان کی قدامت پرستی کے مدنظر، اس مہتم بالشان کام کے لئے ایک ایسی شخصیت کی ضرورت تھی، جو مختلف الخیال اجزا کے درمیان، ترکیبی اور تعمیری اثر ثابت ہو۔ بالفاظ دیگر، ایک روشن خیال سماجی آمر کی ضرورت تھی، جو زمانہ کا رخ پہچان کر اس کے لئے راہ ہموار کرے اور اپنی ملت کو اس کے خیر مقدم کے لئے تیار کرے۔ یہ خصوصیت، مشیت نے، حضرت سلطان العلوم کے حصے میں لکھی تھی۔ چنانچہ آپ نے، ہندوستان کی اس ضرب المثل قدامت پرستی کے خلاف جہاد کیا، جو انہیں اپنی ہر چیز کے متعلق احساس پستی میں مبتلا رکھتی ہے اور انہیں ابھرنے نہیں دیتی۔ اور اپنے ملک میں علم و فن کی سوتیں جاری کرنیکے لئے

ہندوستان کی سرزمین ہی کی ایک سوت کھول کر، اس کے منبع کو ایک طرف مغرب اور دوسری طرف ایران و عرب کے سرچشموں کے ساتھ استوار کر کے، خود اپنے پایۂ تخت میں اپنی خاص نگرانی میں، ایک عظیم الشان مخزن اور مرکز علم تیار کر لیا، جس کے فیض جاری سے آج سارا ہندوستان سیراب ہو رہا ہے۔

جامعہ عثمانیہ، ایک ہندوستانی زبان کے ذریعہ ہندوستان کے طول و عرض میں جدید علوم کی اشاعت اور ترویج کا واحد ذریعہ ہے۔ اس سلسبیل علوم سے ہندوستانی علوم اور ادب کے جو جو خطے سیراب ہو رہے ہیں۔ ان کا تھوڑا بہت اندازہ ابھی سے ہونے لگا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ آزادؔ اور حالیؔ نے، قدیم اصناف سخن کی صوری پابندیوں کا پورا احترام محفوظ رکھتے ہوئے بھی، جب نئے مضامین کو ان میں داخل کرنے کی جرات کی تو زبان اور قلم کے دربان قدم قدم پر حائل ہو رہے تھے یا اب یہ حال ہے کہ جدید سخن سرا، صوری پابندیوں کو بھی پس پشت ڈالنے کو تیار ہیں، لیکن کوئی محسوس نہیں کر سکتا۔ اردو نثر پر ایک دور ایسا بھی گذرا ہے کہ سرسید احمد خاں جیسا جبری مصلح بھی ''رائے عامہ'' سے مرعوب ہو کر، اپنی کتاب ''آثار الصنادید'' کو مولانا امام بخش صہبائی سے ان کے خاص اسلوب میں لکھانے پر مجبور ہو جاتا تھا، اور میر امن جیسا مقبول انشا پرداز، ''باغ و بہار'' میں سادہ سیدھی اور عام بول چال کی زبان استعمال کر کے، رجب علی بیگ سرورؔ کے حملوں کا مورد بنتا تھا، یا اب یہ حال ہے کہ علم و فن کی ترویج کے سبب، اسلوب بیان میں مغربی انداز کے تغیرات کا ایک حشر برپا ہے، اور لفظیات میں ہر صوبے اور ہر زبان کے اثرات کی وجہ سے ہر روز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور ادبی تحریروں میں ان کو جگہ ملتی جا رہی ہے، لیکن کسی قدامت پرست کو کچھ کہنے کی جرات نہیں ہوتی!

مذکورہ بالا اجمال کی کچھ تفصیل، اس دور کے حیدرآبادی کارناموں کے ذریعہ ذیل میں کی جاتی ہے۔ اس مبارک عہد میں، حیدرآباد جن ادبی کارناموں کی وجہ سے ممتاز رہا، ان میں سب سے پہلے قابل ذکر تنقید، تاریخ زبان اور ادب اور خاص طور پر قدیم زبان اور ادبی کارناموں کی تحقیقات ہے۔ اس وقت حیدرآباد میں منتخب ادیبوں

اور اداروں کی ایک خاصی تعداد اس کام کے لئے ہمہ تن وقف ہے۔ اس سلسلہ میں جو کارنامے منظر عام پر آچکے ہیں ان میں "ہندوستانی صوتیات"۔ "ہندوستانی لسانیات"۔ "اُردوئے قدیم"۔ "دکن میں اُردو"۔ "اُردو شہ پارے" کے علاوہ انجمن ترقی اُردو کے بیسیوں قدیم تذکرے، جو شعرائے قدیم کے حالات پر مشتمل ہیں اور قدیم شعرا کے ادبی کارنامے قابل ذکر ہیں۔ تذکروں میں، میر کا "نکات شعرا"۔ گردیزی کا تذکرہ، شفیق اورنگ آبادی کا "چمنستان شعرا" مصحفی، لطف قائم چاندپوری اور خلیل کے تذکرے۔ فائق کا تذکرہ شعرائے گجرات۔ اور ادبی کارناموں میں "سبرس"۔ "کلیات ولی"۔ "دیوان تاباں"۔ "انتخاب کلام میر" مثنوی خواب و خیال" جیسی اہم کتابیں شامل ہیں۔ انجمن ترقی سے شائع کئے ہوئے تذکروں کے علاوہ بعض اور قدیم تذکرے بھی شائع ہوئے جن میں "گلشن گفتار" (خواجہ حمید اورنگ آبادی) بہت قدیم ہے۔ "انتخابات شعرائے دکن" اور "سلسلہ ادبیات اُردو" کی بعض تصنیفات بھی قابل ذکر ہیں جیسے "سراج سخن"۔ "کیف سخن"۔ "متاع سخن"۔ "ایمان سخن" وغیرہ۔ سلسلہ ادبیات کا "مرقع سخن" نہایت ضخیم اور قیمتی کارنامہ ہے۔

یہ کارنامے درحقیقت اُردو زبان کے بنیادی مسائل پر حاوی ہیں۔ ان کی اشاعت سے اُردو زبان کی قدامت اور وسعت کے متعلق جو خوشگوار حقایق بے نقاب ہوئے ہیں، ان کے اثرات دوررس اور پائدار ہیں۔ ان تحقیقات کی روشنی میں قدیم انشاء پردازوں کی تحقیقیں افسانہ معلوم ہونے لگی ہیں۔

اس قدیم اور اہم دور کے علاوہ، نسبتاً بعد کے ادوار پر بھی جو وسیع تحقیقاتی کام اس دوران میں انجام پا تا رہا ہے۔ اس کا حصر کرنا دشوار ہے۔ کیونکہ اس میں سے بہت کم مواد کتابی صورت میں منظر عام پر آسکا ہے۔ جو کتابیں شائع ہوچکی ہیں اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) مثنویات میر (۲) سودا، اور اُن کا عہد (۳) دیوان یقین (۴) دیوان اثر (۵) دیوان تاباں (۶) دہلی میں اُردو شاعری کا آغاز (۷) اردو ادب میں لکھنو کی حقیقی خدمات (۸) ارباب نثر اُردو (۹) مثنوی رموز العارفین (میر حسن) (۱۰) داغ

(۱۱) جدید اُردو شاعری (۱۲) انگریزی ادب کا اثر اردو ادب پر (بزبان انگریزی) (۱۳) غالب (بزبان انگریزی جس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہوچکا ہے) (۱۴) اردو کے اسالیب بیان (۱۵) تنقیدی مقالات (۱۶) عہد عثمانی میں اُردو کی ترقی وغیرہ۔

مذکورہ بالاشائع شدہ کتابوں کے علاوہ، اتنی کتابیں جامعہ کے مقالوں یا مسودوں کی شکل میں ابھی منتظر اشاعت ہیں ذیل کے عنوانات سے ان کا تھوڑا بہت اندازہ ہوسکیگا ولی، اُن کی حیات اور شاعری، دکن کی مرثیہ نگاری مغربی زبانوں کے اردو ترجم — ماہ لقا بائی چندا، اکبر الہ آبادی (حیات اور شاعری) انگریزی ادب کی مختصر تاریخ، عربی ادب کی مختصر تاریخ، سوانح نگاری، چکبست کی حیات اور شاعری۔

تاریخ ادب اور زبان سے ہٹ کر، ادب خاص میں نظم اور شاعری کو خاص فروغ حاصل ہورہا ہے۔ اس کا سب سے بڑا محرک، خود اعلیحضرت سلطان العلوم کا شعری اور ادبی ذوق، آپ کا دربار ابتدا ہی سے ہند اور دکن کے ممتاز شعرا کا مرکز رہا۔ اور ان پر آپ کے الطاف طرح طرح سے ہوتے رہے۔ اس سلسلہ میں مہاراجہ یمین السلطنت سرکشن پرشاد بہادر شاؔد کی سرپرستیوں کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ آپ کا دامن اتنا وسیع ہے کہ جتنے باکمال شعرا، دکن میں پیدا ہوئے، یا شمالی ہند سے یہاں وارد ہوئے، سب کو اس سے حصہ ملا۔

حیدرآباد کی موجودہ ادبی چہل پہل میں قدیم اساتذہ اور جدید طرز کے نوجوان شعرا دونوں کا حصہ ہے۔ اُردو شاعری میں جدید صوری اصلاح کے اولیں علمبردار، عظمت اللہ خاں مرحوم، اس عہد کی پیداوار ہیں ان کی دلکش نظمیں جو اس وقت اولیں تھیں، ہمیشہ اولیں رہیں گی۔ مولانا سلیم مرحوم نے جو اپنی شاعری کے ذریعہ نوجوانوں میں روح عمل پیدا کرنے کے لئے لازوال شہرت حاصل کرچکے ہیں، اپنی عمر کے آخری اور بہترین سال اس عہد خوش بختی میں گذارے۔

جدید شاعری کا ذوق، جو اس وقت سارے ہندوستان میں جاری اور ساری ہے، اس کو آگے بڑھانے میں جامعہ عثمانیہ کے خوش فکر شعرا کا بڑا حصہ ہے۔ وہ

نہایت خلوص کے ساتھ اپنی زبان اور ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں ان کے کارناموں میں حسن فطرت کے جو پہلو بے نقاب ہوتے نظر آتے ہیں، اور عمل کی جو روح مضطرب دکھائی دیتی ہے، اس سے توقع ہے کہ وہ جلد ہی لازوال شہرت حاصل کریں گے۔

جدید شاعروں کے کارنامے زیادہ تر رسائل میں محفوظ ہیں، اس وقت صرف چند مجموعے شائع ہوئے ہیں جیسے "من کی بانسری" - "شیب و شباب" - "مزامیر" - وغیرہ - اور کچھ اب شائع ہو رہے ہیں۔ ان کی اشاعت سے حیدرآباد کے جدید شعرا کی فکر کے متعلق بہت سے امور روشنی میں آسکیں گے۔

قدیم اساتذہ میں حضرت شاد، امجد، توفیق، کیفی، عزیز، جلیل، باقی (گردھاری پرشاد) حسرت (مولانا عبدالقدیر صدیقی) نظم طباطبائی، ذہین مرحوم آزاد، کے کئی کئی مجموعے اس وقت شائع ہو چکے ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ہمارے نوجوان شعرا جہاں جدید ترین اسلوب شعر کو فروغ دینے میں کوشاں ہیں، کچھ نوجوان ادیب، مشرق اور مغرب کے چوٹی کے شعرا کے کلام پر تنقیدیں ان کے نمونے، اور ان کے سوانح حیات کی اشاعت کی طرف بھی متوجہ ہیں۔ اس وقت اس طرح کی چند کتابیں مثلاً "ورڈسورتھ اور اس کی شاعری" - "ٹیگور اور اُن کی شاعری" "منتخبات ہندی" - "براؤننگ" وغیرہ شائع کر کے ملک میں شاعری کے صحیح ذوق کو ترقی دینے میں مدد کر رہے ہیں۔

اُردو ادب کو ڈراما اور اس کے صحیح مفہوم سے روشناس کرنے میں بھی حیدرآباد کے ادیب ہندوستان کے ترقی پسند ادیبوں کی کوششوں میں ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ اس مقصد کے لئے "انجمن ترقی ڈراما" - "بزم تمثیل" اور "حیدرآباد ڈرامٹک ایسوسی ایشن" اور چند ادارے برابر کام کئے جا رہے ہیں۔ ان کی کوششوں کے نتائج حسب ذیل ڈراموں کی شکل میں نمودار ہو چکے ہیں۔

"نئی روشنی" - "ظاہر باطن" - "حشرات الارض" - "فریب تخیل" - "صلائے عام" - "ہوش کے ناخن" - "غلط در غلط" - "مالن" - "مستقبل" - "کالج کے دن" - "خیام" وغیرہ۔

ان ڈراموں میں سے بعض مغربی شہ کاروں سے ماخوذ ہیں۔ اور اکثر ایک سے زیادہ دفع اسٹیج پر بھی کامیابی کے ساتھ پیش کئے جا چکے ہیں۔ یہ کام بڑی محنت ذوق اور سلیقے کا تھا، لیکن تجربہ کار اداآموزوں، اور صاحب ذوق پیش کنندوں اور اداکاروں نے اس میں جو کامیابی حاصل کی ہے، اس سے، حیدرآباد میں ڈرامے کی ترقی کے لئے شاندار مستقبل پیدا ہوگیا ہے۔

بعض خوش فکر شاعر مغربی شہ کاروں کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کی سعی میں برابر لگے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ایک مشہور سخن پرداز، جو جرمنی کے فلسفی شاعر، گوئٹے سے خاص طور پر متاثر ہیں اس کے شہ کار "فاؤسٹ" کے خیالات کو اپنے طور پر، اُردو میں نہایت خوش اسلوبی سے ادا کر رہے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ کام جلد منظر عام پر آجائے گا۔

اصل ڈراموں کے علاوہ ڈرامے کے فن، اس کی تاریخ اور اس کے لوازم پر بھی کافی لٹریچر ہمارے ہاں پیدا ہوچکا ہے۔ چنانچہ ایک مبسوط کتاب "اُردو اور ڈرامانگاری" شائع ہوچکی ہے، اور "جدید اُردو ڈراما" اشاعت طلب ہے۔

افسانہ، اور خاص طور پر، مختصر قصہ، موجودہ ادبی اصناف میں سب سے زیادہ مقبول صنف ہے۔ اس میں بھی حیدرآباد کے ادیب مسلسل کام انجام دئے جارہے ہیں۔ ان کے قصے ہندوستان اور حیدرآباد کے رسائل میں ہر روز شائع ہوتے رہتے ہیں۔ کتابی شکل میں بھی چند مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ مثلاً "نظر کے دھوکے"۔ "محشرستان"۔ "کامیاب افسانے"، وغیرہ۔ افسانے کے فن، اس کی تاریخ اور متعلقہ تنقیدی موضوعات پر پہلے پہل حیدرآباد ہی سے کتابیں شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ مشرقی اور مغربی شہ کار قصوں کے کئی مجموعے، راقم سطور ہی کی عمومی ادارت میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ "قدیم افسانے"۔ "چینی اور جاپانی افسانے"۔ "انگریزی افسانے"۔ "فرانسیسی افسانے" وغیرہ کے نام سے موسوم ہیں۔ ان کے ذریعہ مشرق اور مغرب کے بہترین قصوں کو اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

بچوں کی دلچسپی اور مذاق کی بھی کئی کتابیں نظم اور نثر میں شائع ہوچکی ہیں نظم میں "گلزار اطفال"۔ "چمن زار حکایات"، اور نثر میں "راہ سعادت"۔ "اسباق الاشیاء"۔ "گلشن اخلاق" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ادب لطیف اور مزاحیہ مضامین کے بھی کئی مجموعے اس دوران میں شائع ہوئے جن میں "مضامین فرحت" ہندوستان بھر میں مقبول ہیں۔ ان کی چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ کچھ اور شائع ہو رہی ہیں۔ اور ایک ایک جلد کے کئی کئی اڈیشن نکل چکے ہیں۔ دوسرے مجموعے "صمدانی" ، "غنچۂ تبسم" ہیں۔ عظمت اللہ خاں مرحوم کے انتقال سے، اس شعبہ میں اُردو کے بہترین اہل قلم کی کمی واقع ہوگئی۔ وہ جتنے اچھے شاعر تھے، ویسے ہی بلند پایہ مزاح نگار بھی تھے۔ رسالہ "نمائش" اور "مجلہ عثمانیہ" میں اُن کے بعض مضامین شائع ہوئے ہیں۔

اس عہد کے چند سفرنامے بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں، مثلاً "حج اکبر" اسلوب بیان اور متصوفانہ نکات کی بدولت مقبول خاص و عام ہے۔ "حج المعظم" (مولفہ قاضی سید عبدالغفار صاحب) بھی بے حد دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے۔ اس کے علاوہ "پردیس کی باتیں" "یورپ کی ڈاک" اور یورپ اور امریکہ کا سفرنامہ (مولفہ نواب ظہیر الدین خاں بی۔ اے (عثمانیہ) خلف نواب معین الدولہ بہادر) بھی انداز بیان اور معلومات کے اعتبار سے خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں۔

اس عہد مسعود کے ادبی آثار کا ذکر ختم کرنے سے پہلے، ان ادبی رسائل کا اجمالی ذکر بھی ضروری ہے، جو اس دوران میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کی تعداد کافی ہے، لیکن ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو کچھ عرصہ تک جاری رہنے کے بعد، بند ہو گئے ان میں "تاج" ، "تزک عثمانیہ" ۔ "ذخیرہ" ۔ "افادہ" ۔ "ثمرۃ الادب" ۔ "اتالیق" ۔ "شعلہ" "الغنا" ۔ "نونہال" ، "تحفہ" ۔ "نمائش" ۔ "لسان الملک" ۔ "ارتقا" ۔ "ادیب" ۔ "مجلہ مکتبہ" اور "حسن کار" شامل ہیں۔ جو رسالے اب تک جاری ہیں وہ حسب ذیل ہیں "صحیفہ" "اُردو" "مجلہ عثمانیہ" ، "المعلم" ، "حیدرآباد ٹیچر" ، "الموسی" ، "مجلہ طیلسانین عثمانیہ" ، "آئینہ ادب" اور "شہاب" ۔

"صحیفہ" پہلے ماہوار رسالے کی صورت میں جاری ہوا تھا، لیکن جلد ہی روزنامہ اخبار کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ اور اب تک برابر جاری ہے۔ رسالہ "تاج" اس عرصہ میں دو دفعہ جاری ہوا اور پھر بند ہو گیا۔ بعض اہم محققانہ مقالے جیسے "اُردوئے قدیم"

"معراج العاشقین" وغیرہ شائع کرنے کا اس کو فخر حاصل رہا ہے۔ "النسا" بیگم صغرا ہمایوں مرزا کی ادارت میں عورتوں کی دلچسپی کے مضامین کے لئے مخصوص تھا۔ اور "نونہال" لڑکوں کی استعداد کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ "حسن کار" مہینے میں دو مرتبہ شائع ہوتا تھا۔ اور ادبی اور حسن کاری کے مضامین اور افسانوں کے علاوہ ملک کے مشہور صناع، عبدالقیوم صاحب آرٹسٹ کی تصویروں کی وجہ سے بہت مقبول تھا۔ کیپٹن اعجاز علی شہرت مرحوم، جو اچھے شاعر اور نثر نگار تھے، اس کے خاص اہل قلم تھے۔ ہتیاروں اور سازوں وغیرہ پر ان کے پر از معلومات مضامین، جو ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ "حسن کار" ہی میں شائع ہوئے۔

موجودہ ادبی اردو رسائل میں "اردو" کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ ہندوستان بھر کی مرکزی "انجمن ترقی اردو" اورنگ آباد دکن کا بلند پایہ سہ ماہی رسالہ ہے "اور اپنے محققانہ اور علمی مضامین اور پابندی اشاعت کی بدولت نہ صرف اردو کے تمام رسائل میں ممتاز ہے بلکہ انگریزی کے اچھے رسالوں کا ہم پایہ ہے۔

"مجلہ عثمانیہ" جامعہ عثمانیہ کے طلباء کا سہ ماہی رسالہ ہے جو انگریزی اور اردو، دو حصوں پر مشتمل ہوتا ہے اس کی خاص شہرت ان علمی اور تحقیقی مضامین کی وجہ سے ہے، جن میں جامعہ میں وضع کردہ علمی اصلاحات کا نہایت صحت کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ یہ مضامین علم کے ہر نظری اور عملی شعبے پر حاوی ہوتے ہیں۔

"الموسی" سٹی کالج کے طلبا کا سہ ماہی رسالہ ہے۔ اس کا خاص نمبر جو یوم ولی کے سلسلے میں شائع ہو رہا ہے۔ اردو ادب میں ایک اہم چیز ہو گی۔

مجلہ طیلسانئین عثمانیہ ابھی ابھی گویا جوبلی کی یادگار کے طور پر شائع ہونے لگا ہے۔ اس میں زیادہ تر جامعہ کے فارغ التحصیل انشاپردازوں اور علما کے مضامین ہوتے ہیں۔ جامعہ کے مقالے بھی اس میں بہ اقساط شائع کئے جا رہے ہیں، جس کی بدولت، وہ تحقیقات جو الماریوں میں مدفون تھی منظر عام پر آجائے گی اور عدم واقفیت کی بدولت ایک موضوع پر کئی کئی مقامات پر کام ہونے کا جو خدشہ تھا وہ جاتا رہے گا۔ درخشاں عہد عثمانی کے محض ادبی کارناموں کا یہ ایک سرسری سا خاکہ ہے، جس کی تفصیل کے لئے ایک ضخیم جلد درکار ہے۔

انجمن اساتذہ مستقر بلدہ کی تاریخ پر طائرانہ نظر

از جناب مولوی ضیاالدین بیگ صاحب بی۔ اے۔ بی ٹی ناظر تعلیمات

و معتمد عمومی انجمن

اعلیحضرت قدر قدرت حضرت سلطان العلوم نواب میر عثمان علی خاں بہادر خلد اللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ کے عہد زرین میں خصوصاً سررشتہ تعلیمات میں جو نمایاں ترقی ہوئی وہ جشن سیمین ہمایونی کے موقع پر متعدد تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ بخوبی منکشف ہو چکی ہے۔ اساتذہ کی انجمنوں کا قیام اس ترقی کا ایک اہم جزہے۔ چنانچہ صوبجات گلبرگہ شریف، اورنگ آباد، ورنگل اور مستقر بلدہ میں انجمنیں قائم ہوئیں۔ یہاں انجمن اساتذہ مستقر بلدہ کا تذکرہ اور اس کی ترقی تاریخی نقطۂ نظر سے بے جا نہ ہوگی۔

انجمن اساتذہ مستقر بلدہ کا قیام | یہ انجمن ۱۳۳۴ف میں بہ منظوری و اجازت محکمہ سرکار جناب مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے (کنٹب) صدر مہتمم تعلیمات مستقر بلدہ و ضلع اطراف بلدہ کے قیادت میں قائم ہوئی۔ ۱۳۳۴ف کے اختتام پر انجمن کی پندرہ شاخیں تھیں جن میں سکندرآباد و بلارم کے مدارس بھی شریک تھے اور اراکین کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ تھی چونکہ مذکورۂ بالا مدارس کا تعلق دفتر صدر مہتمی تعلیمات بلدہ سے نہ رہا اسلئے ۱۳۴۵ف کے اختتام پر انجمن کی تیرہ شاخیں رہ گئیں اور (۸۱۰) اراکین تھے۔

انجمن کے مقاصد | (۱) جملہ مدارس سرکاری و امدادی کے مدرسین کو علمی و عملی ترقی اور فن تعلیم کے جدید اصول اور طریقوں سے واقف کرانا۔

(۲) مختلف مدارس کے مدرسین کو یک جا جمع ہونیکا موقع دیکر ان میں باہمی اتحاد پیدا کرنا اور ان کو تبادلہ خیالات اور ایک دوسرے کے تجربوں سے فائدہ اُٹھانے کا موقع بہم پہنچانا۔

(۳) تعلیمی نقائص دور کرنے کے لئے مفید تحریکات انجمن کے مقرر کردہ اصول وقواعد کے لحاظ سے پیش کرنا۔

(۴) طلبار کے عمدہ اخلاق اور دماغی وجسمانی نشوونما کے لئے سعی کرنا۔

مصروفیات ان مقاصد کے حصول کے لئے حسب ذیل طریقے اختیار کئے گئے:۔

(۱) انجمن کی مختلف شاخوں میں ماہانہ جلسے منعقد کرکے تقاریر اور مباحثے کرنے کے لئے مرکزی انتظامی کمیٹی نے مفید مضامین منتخب کئے جن پر مدارس میں مباحثے ہوئے۔

(۲) سالانہ کانفرنس منعقد کرکے تعلیمی نمائش اور باغبانی کا مقابلہ مقرر کیا گیا۔

(۳) عام جلسے منعقد کئے گئے جن میں تعلیمی مضامین پر منتخب اور ممتاز ہستیوں نے تقاریر کیں۔

(۴) سہ ماہی رسالہ حیدرآباد ٹیچر جاری کیا گیا۔

(۵) کتب خانہ قائم کیا گیا جس سے اساتذہ مستفید ہوتے رہے۔

(۶) لایق اور تجربہ کار اساتذہ کی ذیلی کمیٹیاں مقرر کرکے تعلیم سے متعلق اہم وضروری مضامین پر مبسوط رپورٹیں تیار کرائی گئیں۔

(۷) زاید نصاب مصروفیات کا ایک شعبہ قائم کیا گیا جو اساتذہ کو مفید مشورے دیکر مدد اور رہبری کرتا ہے۔

(۸) اساتذہ کے لئے کلب قائم اور آراستہ کیا گیا۔

(۹) کانفرنس کے ضمن میں مشاعرہ منعقد کیا گیا اور نمونے کے اسباق اور لاسلکی تقاریر کا انتظام کیا گیا۔

(۱۰) انجمن امداد باہمی قائم کی گئی۔

(۱۱) آل انڈیا فیڈریشن آف ٹیچرز اسوسی ایشن کی کانفرنسوں میں شریک ہونے کے لئے نمائندے بھیجے گئے۔

(۱۲) کانفرنس کے مفید تحریکات کو بعد منظوری محکمۂ صدر پر بغرض کارروائی بھیجا گیا۔

سالانہ کانفرنس انجمن کی پہلی سالانہ کانفرنس ۱۳۴۵ف میں زیر صدارت عالی جناب

حیدر نواز جنگ بہادر ہز اکسلنسی رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری صدر اعظم بہادر باب حکومت منعقد ہوئی۔ دوسری کانفرنس کو ۱۳۳۷ف میں اور نویں کو ۱۳۴۵ف میں نواب مہدی یار جنگ بہادر ام۔ اے (آکسن) معتمد سیاسیات حال صدر المہام بہادر سیاسیات و تعلیمات کی صدارت کا شرف حاصل ہوا۔ ۱۳۳۸ف میں تیسری سالانہ کانفرنس کی صدارت عالیجناب خان فضل خان صاحب ایم۔ اے آنیگر ناظم تعلیمات نے اور چوتھی کانفرنس کی ۱۳۳۹ف میں نواب اکبر یار جنگ بہادر معتمد تعلیمات، عدالت، کوتوالی و امور عامہ نے فرمائی۔ ۱۳۴۰ف میں پانچویں کانفرنس کو مرزا یار جنگ بہادر میر مجلس عدالت العالیہ اور ۱۳۴۱ف میں چھٹی کانفرنس کو عالیجناب نواب سر نظامت جنگ بہادر نے صدارت کی عزت بخشی۔ ۱۳۴۲ف میں ساتویں اور ۱۳۴۳ف میں آٹھویں کانفرنس منعقد ہوئی جبکہ عالیجناب نواب ذو القدر جنگ بہادر ایم۔ اے بار ایٹ لا معتمد تعلیمات، عدالت، کوتوالی و امور عامہ اور مسٹر اے ایچ میکنزی ایم۔ اے سی۔ ایس، آئی۔ سی۔ آئی۔ ای پرو وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ صدر نشین تھے۔ ۱۳۴۶ف میں دسویں کانفرنس بصدارت عالیجناب قاضی محمد حسین صاحب ایم۔ اے ایل ایل۔ بی (اکنٹب) نائب معین امیر جامعہ منعقد ہوئی۔ اس طرح اب تک انجمن کی دس کانفرنسیں منعقد ہوئیں جن میں پہلے چار سال تک تقاریر کے علاوہ تعلیمی نمائش اور مفید تحریکات پر انجمن کی توجہ مرکوز رہی اس کے بعد سے تقاریر اور نمائش تعلیمی کے ساتھ ساتھ نمونے کے اسباق مشاعرہ، باغبانی کے مقابلے کو شریک کیا گیا اور گذشتہ کانفرنس کے موقع پر جبکہ تعلیمی ہفتہ منایا گیا اس میں لاسلکی تقاریر اساتذہ کے کلب کے ٹورنمنٹ اور ڈنر کا اضافہ کیا گیا۔ انجمن کی دسویں سالانہ کانفرنس یادگار رہے گی جس کی تعلیمی نمائش کا افتتاح علیاحضرت شہزادی دُرِّ شہوار دُردانہ بیگم صاحبہ پرنسس آف برار نے از راہ عنایت فرمایا تھا۔

تعلیمی کانفرنس کانفرنس کے ضمن میں ہر سال تعلیمی نمائش منعقد کی جاتی ہے جس میں مدارس تحتانیہ و ثانویہ مستقر بلدہ کے اساتذہ و طلبہ کا منتخب سامان بھیجا جاتا ہے جن سے اُن کو تحریص ہوتی ہے اور اُن کی قابلیت اور صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔ ہر سال متعدد انعامات دئے جاتے ہیں پیوستہ سال آل انڈیا فیڈریشن آف ٹیچرز اسوسی ایشن منعقدہ ناگپور۔

(جس سے انجمن ہٰذا ملحق ہے) کی نمائش تعلیمی میں سٹی کالج اور مدارس بلدہ کو (۱۴) انعامات ملے۔

باغبانی کا مقابلہ ۱۳۴۲ف سے اس کا آغاز ہوا۔ اس سے مدارس بلدہ میں باغبانی کی ترغیب و تحریص ہو رہی ہے۔ پہلے سال ۷، دوسرے سال ۹ اور تیسرے سال ۸ مدارس نے مقابلہ میں حصہ لیا۔ مسلسل دو سال سے مدرسہ فوقانیہ نامپلی رولنگ کپ کا مستحق قرار دیا جا رہا ہے مدارس وسطانیہ میں شاہ گنج اردو شریف کو کپ ملا تھا۔ دیویک وردھنی ہائی اسکول مدرسہ تحتانیہ خیریت آباد، ماڈل پرائمری سکول کے باغیچوں کی حالت اچھی ہے۔

عام جلسے انجمن نے اراکین کے مفاد کے لئے تقریباً ہر سال عام جلسے منعقد کئے جن میں ماہرین فن اور معززین نے جو حیدرآباد تشریف لائے تھے تقاریر کیں اس وقت تک جملہ (۱۰) جلسے منعقد ہوئے ہیں معززین میں منجملہ دیگر اصحاب کے پروفیسر شیشاوری، پروفیسر واڈیا، ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور، مسز سروجنی نائیڈو اور ڈاکٹر ہیرلڈمن کے نام قابل ذکر ہیں۔

رسالہ حیدرآباد ٹیچر یہ دوزبانی رسالہ تقریباً ۱۱ سال سے ملک کی تعلیمی خدمت کامیابی کے ساتھ انجام دیر رہا ہے۔ جس کا معیار شروع سے بلند ہے اور یہ غیر تجارتی اصول پر محض اساتذہ کے مفاد کی خاطر جاری رکھا گیا ہے۔ اس کے بانی اور مدیر مسؤل جناب مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے (کنٹب) ہیں جن کی ان تھک کوششوں اور محنت و دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ رسالہ باوجود مالی مشکلات کے جاری رہا۔ اس کے ذریعہ انجمن کی مختلف مفید تحریکوں کو باہم مربوط رکھا جاتا ہے نیز اساتذہ کے احساس معلمی کو بیدار کیا جاتا اور طبقۂ اساتذہ کے انفرادی اور اجتماعی تجربات کو شائع کر کے فن معلمی پر نفسیاتی حیثیت سے تنقید و تبصرہ کیا جاتا ہے اس کے علاوہ مفید مضامین کی اشاعت سے انجمن کے مقاصد و اغراض کو ملک کے طول و عرض میں مکمل طور پر پھیلایا جاتا ہے۔ سررشتہ کی جانب سے ازراہ قدردانی مدارس ثانویہ اور تحتانیہ کے لئے اس کی متعدد جلدیں خریدی جاتی ہیں۔

ذیلی کمیٹیوں کی رپورٹیں انجمن نے اب تک بعد غور و خوض کے بعد مفید مضامین پر ۱۶ رپورٹیں تیار کیں جن میں اساتذہ کے خیالات تجاویز اور تجربے وضاحت سے بیان کئے گئے ہیں۔ حقیقی معنوں میں یہ رپورٹیں اساتذہ کے خیالات و جذبات کی ترجمان کہی جا سکتی ہیں۔

ان کی تیاری میں جناب مولوی سید علی اکبر صاحب نے کافی مدد فرمائی - یہ رپورٹیں انگریزی، اردو، ریاضی، عملی ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، سائنس، السنہ قدیم، ڈرائنگ "سُست ذہن طلبہ کی تعلیم" جسمانی تعلیم، کنڈرگارٹن، امتحانات، زائد از نصاب معروفیات اور ضبط مدرسہ پر تیار کی گئی ہیں ان میں سے اکثر رپورٹوں کو بروقت صدر دفتر پر بھیجا گیا جہاں سے بعض رپورٹوں پر ضروری کارروائی کی گئی۔

کتب خانہ | تقریباً دس سال سے دفتر صدر مہتمم تعلیمات مستقر بلدہ میں انجمن ہذا کا کتب خانہ زیر نگرانی جناب مولوی سید علی اکبر صاحب قائم ہے جس میں فن تعلیم سے متعلق نہایت مفید کتب تقریباً (۷۰۰) انگریزی اور (۱۰۰) اردو مہیا کی گئی ہیں۔ کتب خانہ سے انجمن کا ہر رکن مستفید ہو سکتا ہے۔ محکمۂ نظامت تعلیمات سے سالانہ (مالـہ) امداد ملتی ہے۔ موزون کتب کا انتخاب اور کتب خانہ کا حسن انتظام جناب مولوی سید علی اکبر صاحب کی ذاتی نگرانی اور گہری دلچسپی کا نتیجہ ہے۔

۴۵ف میں عالیجناب مولوی محمد حسین صاحب جعفری بی۔اے (آکسن) نائب ناظم تعلیمات نے از راہ کرم تقریباً (۱۰۰) قیمتی کتب عنایت فرمائیں جس کی بناء پر جناب ممدوح کو دوامی رکن مقرر کیا گیا۔ نیز جناب مولوی سید علی اکبر صاحب ریورنڈ ایف سی فلپ اور مسٹر دیبر نے پانچ پانچ اور ۳ کتب مرحمت فرمائیں۔

مالی حالت | آمدنی کا دار و مدار ماہانہ چندہ پر ہے جو اراکین سے مقررہ شرح کے مطابق وصول کیا جاتا ہے۔

اختتام | مذکورہ بالا واقعات و روئیداد کے ملاحظہ سے ظاہر ہوگا کہ انجمن اساتذہ بلدہ کے قیام کی شدید ضرورت تھی اور اس کے کارپردازوں نے اساتذہ کی خدمت کرنے میں امکانی کوشش کی جس میں وہ کامیاب رہے، یہ کامیابی اِس کے سرپرست عالیجناب نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات و عالیجناب خان فضل محمد خاں صاحب ایم۔اے ناظم تعلیمات کی توجہ اور ہمدردی اور انجمن کے روح رواں جناب مولوی سید علی اکبر صاحب میر مجلس انجمن کی بے لوث خدمات و ان تھک کوششوں اور مرکزی انتظامی کمیٹی کے اراکین کے

اتحادِ عمل اور اُن معزز ہستیوں کی تعلیمی دلچسپی اور ایثار کا نتیجہ ہے جنہوں نے انجمن کی کانفرنسوں میں بحیثیت صدر نشین یا کسی دوسری حیثیت سے اُس کی کامیابی میں حصہ لیا عموماً ہر سررشتہ کو اور خصوصاً سررشتہ تعلیمات[1] اور انجمن ہذا کو اعلیٰحضرت بندگان عالی خلد اللہ ملکہ کے مبارک زمانے میں جو نمایاں ترقی ہوئی وہ ذات شاہانہ کے علمی تبحر اور معارف نوازی کا نتیجہ ہے۔

الٰہی آفتاب علم اعلیٰ حضرت بندگان عالی مدظلہ العالی و شہزادگان والاشان اور شہزادیاں ہمایوں فال کو سلامت رکھ اور عرصہ دراز تک اپنی رعایا پر حکمراں اور سایہ فگن رکھ۔

آمین ثم آمین

الٰہی تا جہاں باشد شہنشاہ جہاں باشی خدا یت مہرباں و تو بعالم مہرباں باشی

قطعۂ تاریخ حیدرآباد ٹیچر جوبلی نمبر از جناب مولوی سید دلدار حسین صاحب اظہر

مددگار مدرسہ فوقانیہ دار الشفاء

[1] یعنے سید علی اکبر صاحب صدر مہتمم تعلیمات بلدہ

meant for supplementary reading. English is a foreign language, very difficult for an Indian child to master. Therefore the work done in the class room should be supplemented by extensive reading outside to ensure a fair command of the language. A class-library with such up-to-date books carefully selected by the teacher of English will be a great step towards improving the standard of English in our schools.

The get-up of the book under review is attractive. It has 48 pages with an interesting illustration for each short story. The printing also is in sufficiently bold type. Children in the lower forms delight in fiction and fairy tales. A successful writer is one who is able to present the subject matter in simple, living and idiomatic English and who knows also how to grade his or her style. I have carefully gone through this small book. It is rich in idioms of every-day use and the sentences which occur are varied in construction. I consider that it will make a suitable book for extra reading for boys in Form IV.

T. A. LINGAM.

Reviews.

The Osmania Magazine: Silver Jubilee Number.

The March number under review is the Silver Jubilee number which the Osmanians have brought out on the felicitous occasion of the Silver Jubilee of His Exalted Highness the Nizam, Asaf Jah VII. The magazine is handsomely illustrated and well got up. It contains admirable articles both in English and Urdu, contributed mostly by the students. In the English section the article "Challenge to Students" is a bold and frank study of the problems which confront the youth of to-day. Other articles in this section which make interesting reading are "Hyderabad under its Present Nizam", "Centuries in Dream" and "Our Sovereign".

The Urdu section occupies double the space of the English section, and the contributions here are varied and interesting. In the article on "Education in Hyderabad and Urdu" an attempt is made at a brief chronological study of the use of Urdu as the medium of instruction from early times down to the founding of the Osmania University. "The Labourers at the Osmania University" deals with the life and habits of such wandering tribes as Lambadas, Wadders, etc. Other articles of note in this section are: "New literary and scientific movements in Hyderabad", "Village Uplift in the Dominions during the Reign of His Exalted Highness", "The New period of Urdu Drama and Hyderabad", "Chand Bibi" etc.

SALIM BIN SAYEED.

The Bird with the Golden Voice and Three other Stories.
By Stella Mead. Publishers: Oxford University Press,
Price 3½ As.

The Oxford University Press has been bringing out small story books which provide interesting reading matter for school children. They are graduated in style and are

then the education of girls has advanced rapidly, and the number of Girls' Schools and pupils has increased more than seven times. The founding of the Osmania University has given a fillip to higher education for women, especially since the Osmania University College for Women was founded. At a time when girls are coming to the fore in the matter of education, it is the signal good fortune for us to have in our midst Her Royal Highness the Princess of Berar. She has made the women of Hyderabad feel proud of her by declaring, "As Hyderabad is now my home, I identify myself with all your hopes and interests, your ambitions and aspirations, and the welfare of your children. Ever since I came here, I have waited for the time when you would consider me as one of yourselves and believe that I am always ready to co-operate with you in every way that will help to attain your happiness". These words bear eloquent testimony to the deep and abiding interest which Her Royal Highness has in all that concerns the social and educational welfare of the women of the State. The memorable address, published elsewhere, which Her Royal Highness graciously delivered at the Tenth Session of the Hyderabad State Women's Conference, shows that she has made a deep study of the problems affecting the women of Hyderabad in particular and of India in general. Every word of it rings with sincerity and points to the way in which the salvation of women lies. There could have been no better message for the women of Hyderabad than the one with which Her Highness concluded the address: "Let your deepest concern", said Her Highness, "be for the health of your minds and bodies. Let your persistent thought be for your goal in life which is the reason of your being. Have confidence in yourselves and in your capacity. Let there be a meaning to your existence so that it will be remembered with respect and reverence by your children and their children".

---

of the Hyderabad Teachers' Association, he described the policy which he followed as Finance Member. "A financier" he said "has not to hoard up money taken from the people but to give it back to them in the form of the nation-building Departments which serve to increase the efficiency and the comfort of the people".

Sir Akbar Hydari has always stood against communalism. In the presidential address referred to above, he appealed to the teachers to make the schools centres of love, unity and co-operation. "I trust", he declared "that the educational policy of this State at least will discourage communal institutions and foundations and have its schools open to all classes where the teacher will particularly guard against the approach of this malignant canker and see that whilst the pupils in his charge look upon him as their father they all regard their fellow-pupils as their brethren in a real sense. I am perfectly certain that if a deliberate attempt is made to give every opportunity to pupils of the different communities to mingle together and develop their common nationalism, instead of being allowed to drift apart into separate contending centres, this problem, the gradual and insidious growth of which throughout the land is giving cause for grave anxiety, will cease to trouble us".

We are confident that under Sir Akbar Hydari's able guidance our State will make rapid progress in all directions.

Women's Education in the Hyderabad State.

Prior to the accession of His Exalted Highness, facilities for Women's Education in the Dominions were extremely limited. The forces of liberalism had not then set in and the attitude of the public towards Girls' Education was very conservative. The accession of His Exalted Highness marked the beginning of an era of progress. Since

ruler. Elsewhere in this issue appears an article based on the above-mentioned publication.

On the occasion of the Silver Jubilee, the Education Department also organised an Educational Exhibition which was kept open for the public for more than a fortnight. A report of this exhibition is published elsewhere.

It is the devout and fervent prayer of all the loyal subjects of His Exalted Highness that the Silver Jubilee period which has just closed may mark but the beginning of a new era of greater progress and possibilities which, in the fulness of time, will usher in the Diamond Jubilee of their exalted and beloved ruler.

Our New Sadr-e-Azam.

We offer our hearty congratulations to His Excellency the Rt. Hon'ble Sir Akbar Hydari, Nawab Hyder Nawaz Jung Bahadur, P. C., LL. D., on his elevation to the high office of President of the State Executive Council. The appointment of a statesman of his standing as Sadr-e-Azam is to be specially welcomed at a time when the State is considering the question of entering the All-India Federation and when many problems relating to internal reform are awaiting solution. We who are engaged in educational work consider ourselves fortunate in having a Sadr-e-Azam who is a great educationist. A perusal of the article on "Educational Progress under Asaf Jah VII", published elsewhere, will reveal what a valuable contribution Sir Akbar has made to the educational development in the State during the last 27 years. As Home Secretary he gave a vigorous lead to Primary and Secondary Education and it was due to his insight and initiative that the Osmania University was brought into being. Even after he became Finance Member he did much to further the cause of education in Hyderabad. In his presidential address at the First Annual Conference

Editorial Notes.

The Silver Jubilee of His Exalted Highness.

During the enlightened rule of His Exalted Highness Nawab Sir Mir Osman Ali Khan Bahadur, G. C. S. I, G. B. E., Sultan-ul-Uloom, changes of far-reaching importance have taken place in all spheres of administrative activity. That these changes have contributed towards the prosperity of the State and the happiness of its people is an admitted fact. On ascending the *musnad* in 1911, His Exalted Highness had declared, "In every way I will do my best to do good to my people and my country." In his reply to the several addresses presented to him on the great and auspicious occasion of the Silver Jubilee, His Exalted Highness reiterated the high conception he has of his duty as a ruler. He said that *to be the servant of his beloved subjects was a source of pride and distinction to him.*

The nation-building departments have been especially dear to His Exalted Highness' heart, but no department has received his gracious patronage more than the Education Department. The importance which His Exalted Highness attaches to education is evident from the following passage in his speech:

"*Education is the soul of every country; without it a country is a body without life*".

The progress which has been achieved in the field of education during the last 25 years has not only been immense but unique in certain respects. The Education Department brought out a publication during the Jubilee celebrations which gives a connected and authoritative account of the development of the Department from the very beginning, with special reference to the progress which education has made under Asaf Jah VII, the present

agency for enlightening the public on Extra-curricular Activities such as scouting, Debating Societies and School Excursions.

The contribution which the Association has made to the recreative side is equally commendable. As a result of a suggestion made by Mr. Syed Ali Akbar in his lecture on "The Teacher and his Leisure" delivered at the Annual Conference in 1935, a Teachers' Club was opened in 1936. It has a Reading Room attached to it and a radio set has also been provided. There is provision for indoor games such as chess and ping-pong. During the last Education Week the Club organised tournaments in various games and also held its first annual dinner.

Conclusion.—From the brief account given above it will be seen that the Hyderabad Teachers' Association has undertaken many useful educational activities and has been endeavouring to serve the cause of education in the State. The Association owes much to Nawab Masood Jung Bahadur, its first patron, and to Mr. Fazl Muhammad Khan, the present Director of Public Instruction, for their patronage and valuable help, and also to Mr. Syed Ali Akbar, who is not only the founder and President of the Association but its very soul.

The great interest which His Exalted Highness the Nizam takes in all the educational activities of the State is well-known. During the Jubilee week he very graciously opened the Departmental Display, of which the Educational Exhibition formed a part. May the Almight shower His choicest blessings on our Royal Master under whose enlightened rule the Hyderabad Teachers' Association, along with others of the same kind, has been able to carry on its useful activities!

Hyderabad Teachers' Association may be mentioned Dr. Rabindranath Tagore, Dr. Tracy Strong, Professor Wadia, Professor J. L. Horundka and Dr. Harold Mann.

The Library.—When in October 1927, Messrs Syed Ali Akbar and Syed Mohamed Husain Jaffery retuned from England after attending the Imperial Educational Conference, the Central Executive Committee of the Hyderabad Teachers' Association raised a sum of Rs. 600 to give them an 'At Home', but these two gentlemen expressed the wish that the amount should be utilised for establishing a library. Accordingly, a library was opened in 1928. In 1931 the Education Department sanctioned a lump sum of Rs. 1,000 and a monthly grant of Rs. 15 for the library. In 1935 Nawab Rustum Yar Jung Bahadur kindly presented a complete set of Encyclopædia Brittanica to the Library. A year later Mr. Syed Mohomed Husain Jaffery, B.A (Oxon), made a munificent gift of nearly 100 volumes on various useful subjects, in grateful recognition of which he was made an Honorary Life Member of the Association. Messrs. Weber and Ali Akbar have also presented a few books to the library. There are at present 644 English and 260 Urdu books in the Library.

The Hyderabad Teacher.—The Association has been managing an Anglo-Urdu Quarterly called *The Hyderabad Teacher* since 1925

Other Activities of the Association.—This Association was affiliated to the All-India Federation of Teachers' Association in November, 1928, and since then delegates have been attending its annual conferences and taking active part in them.

A Co-operative Credit Society was opened in 1929 for the benefit of the members.

A Bureau of Extra-curricular activities was established in 1935-36. It is an advisory board for all schools and an

Mackenzie and Mr. Qazi Mohamed Husain. The presidential addresses delivered at these Conferences have all been of great value to those interested in education, especially teachers, as they have dealt at length with the special problems of education in the State. In this connection, particular mention may be made of the presidential address delivered by Dr. A. H. Mackenzie in 1934. It contained certain suggestions for the reorganisation of Secondary Education in the State which, in the main, have been incorporated in the scheme recently sanctioned by Government.

Another important and noteworthy feature of these conferences is that during the sessions specialists give a series of 'Demonstration Lessons', which serve the purpose of 'Refresher Courses' for teachers. Besides all this, lectures by eminent men on educational subjects, scout displays, musical concerts, *Mushairas* and other social and educational activities are also organised.

It will thus be seen that apart from their educational importance these annual gatherings have a great social value.

The Educational Exhibitions —At each Conference an educational exhibition is also held. There has been a steady improvement both in the quantity and the quality of the exhibits. At the Nagpur All-India Exhibition of 1935, organised by the All-India Federation of Teachers' Association, as many as 14 prizes were won by our schools.

The Garden Competition.—For the first time in 1933 a garden competition was held in connection with the Annual Conference of the year and since then it has been held regularly every year. There is a rolling cup which has been won by the Government Nampalli High School for two years in succession, in 1935 & 1936.

Special Lectures.—Among the distinguished educationists who have delivered lectures under the auspices of the

Executive Committee exercises a general control over all affairs, makes arrangements for the monthly meetings to be held at different centres and for the annual conference and the exhibition.

Membership of the Association is obligatory on all teachers employed in schools within the jurisdiction of the Divisional Inspector of Schools. The subscription which each member has to pay depends upon his scale of salary and ranges from one anna to one rupee a month.

Its Work and Achievements.—In addition to preparing a programme of work for the monthly meetings at the different centres and organising a Conference every year, the Central Executive Committee has been regularly appointing since 1927 sub-committees to draw up reports on special subjects. Till now 16 reports on important subjects have been prepared and published, viz., The Teaching of English, History, Geography, Mathematics, Science, Urdu, and Moral Instruction, Vocational Education, Physical Education, the Teaching of Drawing and Classical Languages, Kindergartens, the Problem of Backward Children, Examinations and Extra-curricular Activities. The latest report is on "School Discipline." Each report has been the result of patient and diligent work on the part of the members of the Sub-Committee appointed to draw it up.

The Annual Conferences.—Of the activities of the Hyderabad Teachers' Association, perhaps the most valuable is the Annual Conference, which is attended not only by the members of the Association but by the educational officers and teachers in the districts, the members of the Secunderabad Teachers' Association and by the general public. The Conferences held so far have been presided over by a succession of eminent men, viz., The Rt. Hon'ble Sir Akbar Hydari, Nawab Mahdi Yar Jung Bahadur, Mr. Fazl Muhammad Khan, Nawab Akbar Yar Jung Bahadur, Nawab Mirza Yar Jung Bahadur, Nawab Nizamat Jung Bahadur, Nawab Zulkadar Jung Bahadur, Dr. A. H.

(2) To create an *espirit de corps* amongst the teachers of various schools by providing them with opportunities of meeting together.

(3) To promote co-operation among different schools.

(4) To consider and discuss proposals for remedying the defects in the present educational system, subject to the rules of the Association and in accordance with the procedure laid down by it.

(5) To promote the physical, mental and moral welfare of the students.

The means for the attainment of these objects were to be as follows:—

(1) Arranging every month lectures, discussions and model lessons.

(2) Organising annually an Educational Conference and an Educational Exhibition.

(3) Arranging for special lectures by distinguished persons on educational subjects.

(4) Publishing a Quarterly Magazine.

From the following brief account it will be clear that sincere endeavours have been made during the past twelve years to realise the object with which the Association was started.

Its Constitution.—The Association had in the beginning 15 branches with over a thousand members. But in 1933 when the branches at Secunderabad and Bolarum formed themselves into a separate association, there remained only 12 branches. In 1936 there were 13 branches with 810 members.

The Director of Public Instruction is the patron of the Association, the Divisional Inspector of Schools, Balda, its President, the Senior Nazir its General Secretary and the Assistant Divisional Inspector its Treasurer. The Central

The Hyderabad Teachers' Association : A Retrospect.

BY

G. A. Chandawarkar, M. A.,
Head Master, Govt. Middle School, Sultan Bazars.

Of the many healthy educational activities that have been encouraged and developed during the beneficent rule of His Exalted Highness the Nizam, Nawab Sir Mir Osman Ali Khan Bahadur, the starting of Teachers' Associations in the different parts of the Dominions is one. The work done by the Education Department in spreading education and improving the quality of instruction has been supplemented by these Associations, inasmuch as they have provided an opportunity to teachers of keeping themselves in touch with new developments in the field of pedagogics. The Teachers' Association at Headquarters known as "The Hyderabad Teachers' Association" has, in particular, done much useful work in this direction during the last 12 years.

The Origin and Aims and Objects of the Association.— In the year 1923, soon after Mr. Syed Ali Akbar, M. A., (Cantab), took charge of the office of Divisional Inspector of Schools, Headquarters, he conceived the happy idea of starting an association for the benefit of the teachers employed in the schools under his jurisdiction. A Committee was appointed and the rules and regulations drawn up by it were approved by Government in 1924-25. The Association came into existence in June 1925 with the following aims and objects :—

(1) To increase the knowledge of the theory and practice of education, possessed by teachers in Government and Aided Schools.

bution. Mr. Khairat Ali has, in addition, helped the Secretary in every branch of work connected with the Exhibition.

"We are also thankful to Miss Urwick and the Girl Guides, and Mr. Hadi and the Boy Scouts for their help. We thank Miss Linnell for the use of this Hall and for her help in making arrangements for this function.

"Finally, the warmest and the sincerest thanks of the Department are due to Mr. Syed Ali Akbar, the energetic Secretary of the Educational Exhibition Committee, on whose shoulders fell the double responsibility of writing the history of Education, on the one hand, and of supervising the Exhibition arrangements in the Town Hall, on the other. The shortness of the time at our disposal made his work extremely difficult, I am sure I am voicing the feelings of the whole Department when I say that we are all most grateful to him for the admirable manner in which he completed his doubly difficult task.

I now request you, Sir, to give away the prizes and I ask the Secretary to announce the prize winners."

---

the Exhibition Committee. We are particularly grateful to Miss G. M. Linnell for the enormous pains which she took not only in preparing the decorations but in fixing them artistically. The ladies and gentlemen, who arranged the exhibits in the various sections, had to work very hard for many days. They deserve our best thanks for the tasteful manner in which they arranged the exhibits. I am sure you wish to hear their names. They are Miss Pope, Miss Webster, Miss K. Linnell, Mrs. Jamal-ud-din, Mr. Sajjad Mirza, Miss Cowan, Miss Thompson, Mr. Hughesdon, Miss Henry, Mrs. Timmins, Mr. Ahmed Husain Khan, Mr. Bellingham, Mr. Culver, Mrs. Chick and Mr. Samiullah. They were assisted by many teachers from Head-quarters and some from the Districts, whose names will be announced when the Prize Distribution begins. We are thankful to them all.

"The Education Department has also taken upon its shoulders the responsibility for arranging to show the Educational Exhibition to the Public every day. From 3 p. m. to 10 p. m. about 65 teachers from various Government schools are placed on duty every day in the Town Hall under a gazetted officer of the Department. It is estimated that, on an average, about 15,000 people have been visiting the Exhibition daily since its opening. Messrs. Khairat Ali, Nakavi, Ghulam Qadir, Mir Ahmed Ali Khan, Mahmood Ali Baig, Abdul Aziz and Salim-bin Sayeed, with the help of Boy Scouts, have done commendable work in controlling the crowds and ensuring the safe custody of the exhibits.

"Another officer whose work deserves appreciation, is Mr. Nazir Husain Sharif. He has been indefatigable in maintaining a record of all the exhibits and in keeping them in safe custody at all times.

"Messrs. Khairat Ali, Nakavi, Mahomed Raza, Abdullah and Imtiaz Ali Khan have given the Secretary valuable assistance in making arrangements for the Prize-Distri-

valuable time in spite of your multifarious and onerous duties. The keen interest you are taking in our work is a great incentive for the Department to make further progress. We are very grateful to you for your generous support to the Educational Exhibition, which the Department has arranged in honour of the Silver Jubilee of His Exalted Highness the Nizam's glorious reign.

"The Education Department is deeply indebted to the Silver Jubilee Departmental Progress Committee. They assigned to us the Town Hall for the Educational Exhibition and gave us generous help and support throughout. We are thankful to all the members of the Committee, particularly Nawab Zain Yar Jung Bahadur, Mr. Syed Ali Raza, Nawab Rahmat Yar Jung Bahadur, Mr. Meher Ali Fazil, Mr. Jamal-ud-Din, Mr. Armstead and to Mr. Syed Mohamed Mehdi, the indefatigable Secretary of the Committee, whose helpful co-operation was a source of strength to the Educational Exhibition Committee.

"The judging of the exhibits was a difficult and laborious task. Our warmest thanks are due to the Committee of Judges, which consisted of:

Mrs. Engler, Mrs. Norman Walker, Mr. Syed Mohamed Husain Jafari, Mr. Syed Aziz Ali, Mr. and Mrs. Harold Green, Miss Muirhead, Mr. Ghulam Yazdani, Mr. Qazi Mohamed Husain, Mr. W. Turner, Miss. Pym and Mr. Ahmed Husain Khan.

"The number of prizes awarded is as follows:—

First Class Prizes	...	92
Second Class Prizes	...	52
Third Class Prizes	...	26
Special Prizes ...	...	20

Of the 171 prize-winners, 55 are teachers and 116 pupils.

"The success of the Exhibition is mainly due to the unremitting labours of the members of the Educational Exhibition Committee and to the willing co-operation which they received from a large number of teachers. The credit for the decorations in the Town Hall is due to the ladies on

The judges were of the opinion that the exhibits under all the Sections except three, viz., Maps and Charts, Calligraphy and under the Domestic Science Section Plain Sewing, were of a high order. The articles made by the teachers and pupils of the Depressed Class Schools were greatly appreciated.

The Committee which had been appointed to organise the Exhibition consisted of Mr. Fazl Mohamad Khan (President), Miss. G. M. Linnell, Dr. A. Pope, Miss. D. Webster, Mr. Sajjad Mirza, Mr. Ahmed Husain Khan, Mrs. Jamaluddin, Miss. D. Nundy, Mr. R. S. Hughesdon, Mr. Bellingham, Miss. Cowan, Mr. Culver, Mrs. Chick, Mr. Nazir Husain Sharif, Mr. Sher Mohamed Khan, Mr. S. M. H. Nakavi, Miss. K. Linnell, Mr. Gulam Rabbani, Mr. Mir Ahmad Ali Khan and Mr. Syed Ali Akbar (Secretary).

The Exhibition lasted till the 14th March, 1937. The prize distribution took place at the Mahboobia Girls' High School on 6th March, 1937. After giving away the prizes, Nawab Mehdi Yar Jung Bahadur, the Hon'ble Member for Education, congratulated the organisers on the success of the Exhibition. The teachers who had helped the Exhibition Committee in receiving and arranging the exhibits and in other ways were awarded a certificate each, printed artistically with the picture of the Jubilee Hall at the top.

The following is the text of the speech which Mr. Fazl Mohamad Khan, Director of Public Instruction, made on the 14th March, 1937, before requesting the Hon'ble the Education Member to distribute the prizes and the certificates :—

"Nawab Mehdi Yar Jung Bahadur, Ladies and Gentlemen,

On behalf of the Education Department, I welcome you all with great pleasure and thank you for the trouble you have so kindly taken to attend this function. I particularly thank you, Sir, for giving us so much of your

The Silver Jubilee Education Exhibition.

On the occasion of the Silver Jubilee of His Exalted Highness the Nizam, an educational exhibition was held at the Public Gardens along with the displays organised by the other departments. About 3,250 exhibits were received from 209 different schools, but owing to lack of space, the Committee were compelled to make a selection, with the result that nearly 1,000 articles could not be exhibited. Friday, 26th February, 1937, was a proud day for the Education Department, for on that day our beloved Ruler was not only graciously pleased to open the Exhibition but to express his appreciation of the quality and variety of the exhibits as well as the manner in which they had been arranged.

The exhibition was divided into seven Sections, viz , Art Section, Arts & Crafts Section, Kindergarten Section, Maps, Charts & Models, Domestic Science Section, Calligraphy and Teachers' Section.

The number of schools in the different Divisions which took part in the Exhibition was as follows :—

Division.	No. of Exhibits.
Balda (Including the City College and the Jagirdars' College and the Girls' Schools).	45
Secunderabad	6
Depressed Class Schools	18
Medak Division	26
Gulburga Division....	17
Aurangabad ,, ...	44
Warangal ,, ...	53
Total	209

all the Campers for the excellent spirit and discipline shown during the Camp days. He also expressed his gratitude to all the Commissioners, Assistant Commissioners, and the Camp Doctor, Mr. Abid Hussain, for their help and co-operation. Suitable replies were made, congratulating the Camp Chief on the success of the Camp and thanking him for all he had done for the convenience of the Campers.

The Camp broke up at 11-30 A. M.

In conclusion, it must be remarked that the success achieved exceeded the expectations of the organisers. There was a brotherly atmosphere throughout the camp period and the boys besides enjoying their stay in the Camp, evinced a keen sense of duty and a spirit of service. Such rallies are a powerful and necessary agency not merely in increasing the efficiency and usefulness of the scouts but also in bringing about a proper understanding between the scouts of the districts and those of Balda and between scouts of different communities, an understanding which at the present day we are in dire need of.

the Camp just before 9 A. M. and His Exalted Highness came a little later. The Guard-of-Honour supplied by the Jagirdar College Troops gave the Royal Salute and the Hon'ble the Education Member received the Royal Guest. A short programme consisting of Flag Hoisting Ceremony, March-Past and special and simultaneous displays followed and His Exalted Highness evinced deep interest in the displays. After a stay of about twenty minutes the Royal guest went to the Exhibition Tent, where also he expressed his appreciation of the work done by the Scouts. He then left the Camp, leaving behind, however, the other members of the Royal House to watch the programme to its end. The Princes stayed for half an hour more, at the end of which the function came to a very successful close with the singing of the National Anthem. Two days later His Exalted Highness was graciously pleased to send the following message to the Scouts through Nawab Mehdi Yar Jung Bahadur:-

"The Scouts may be informed that I was very pleased with the displays etc. given by them".

The presence of the Ruler at the Rally was a very great honour to the Scouts which was greatly appreciated by them. It has given a stimulus to the movement in the Dominions.

At 10 A. M. on the following day, i. e. 25th February, the Hon'ble the Education Member visited the Camp again. He inspected every troop at its Camp-site and after the flag hoisting Ceremony, distributed the prizes to the winners of the various competitions, etc. It is difficult to find words to express our gratitude adequately to Nawab Mehdi Yar Jung Bahadur for the deep interest he showed in the Dominion Rally and the encouragement and support which he has always given to the movement.

After the departure of the Hon'ble the Education Member, the Camp Chief made a speech in which he thanked his co-workers for the valuable help they had given him in making the Rally so great a success. He thanked

On the third day of the Camp a procession of the Campers started at 9-30 A. M. and marched through the main streets of the Capital. It was a grand sight. The boys kept playing their bands and singing their marching songs all along the route. A halt was made at the River Gardens for rest and refreshments. After one hour the procession started on its return journey reaching the Camp at about 1 P. M.

There was a rehearsal of the March-Past and Displays the same evening in the presence of Mr. Fazl Mohammed Khan, the Director of Public Instruction. At the conclusion of the displays, he addressed the Campers and expressed his satisfaction at their performance and the arrangements made at the Camp. While he was making the speech, Nawab Sultan Yar Jung Bahadur brought the happy tidings that His Exalted Highness would honour us with his gracious presence at the Grand Rally the next morning. This piece of news was received with great joy by every one present and soon the organisers busied themselves in making preparations to give a royal reception to H. E. H., especially as he was visiting a Scout function for the first time.

Those gentlemen who were appointed judges of the Scout Exhibition busied themselves in selecting the best exhibits and it was not before 1 A. M. that they completed their work. The number of articles was large and most of the exhibits were so well prepared that the judges found it no easy task to award the prizes. These articles had been neatly arranged in a large *shamiana.*

By 8 A. M. on the 24th February all the campers were waiting to receive the Royal guest in a fitting manner. The large *shamianas* were beautifully decorated. The furniture and refreshments were supplied by the Amira Department. H. H. the Prince of Berar, Walashan General Prince Moazzum Jah Bahadur, His Excellency the Maharaja Bahadur and Nawab Mehdi Yar Jung Bahadur arrived at

officer. Three of the District Commissioners—Nawab Nazir Yar Jung Bahadur, Mr. S. Ali Akbar and Mr. Shaik Abul Hassan—showed their interest in the Scout Movement by acting as section officers and their very presence in the Camp was a source of great encouragement to the organisers.

From the 21st February troops began to pour into the Camp and the Registration Officers had a busy time. By the 22nd morning no less than 1681 Scouters, Rovers, Scouts and Cubs had gathered in the Camp, including representatives from Mysore, Baroda and Secunderabad. When the Hon'ble the Education Member arrived at 11 A. M. to open the Camp, it presented a wonderful sight. The flag was hoisted with due ceremony. The Camp Chief thanked Nawab Mehdi Yar Jung Bahadur for accepting his invitation to perform the opening ceremony of the Camp. In his welcome speech, the Hon'ble the Education Member congratulated the organisers on their effort and advised the Campers to make the best use of the opportunity given to them. He hoped that they would all enjoy their stay in the camp and make friends with the visitors from the sister Indian States.

The Camp programme, which had been carefully drawn up, included competitions, lectures, conferences, displays, Camp-fires and a procession through the City. We are very much indebted to Messrs. S. Ali Akbar and Akbar Ali Khan who addressed the Campers on 'Discipline' and 'Citizenship', respectively. Both the addresses were very instructive and interesting. The Conferences too were very successful, thanks to the tact and ability of the Presidents, Mr. S. M. Azam, Nawab Nazir Yar Jung Bahadur and Mr. S. Ali Akbar, who made very illuminating and useful speeches and conducted the proceedings of the Conferences most ably.

The Camp-fires were very interesting. They brought to light the latent talents of our scouts and were greatly appreciated by the boys as well as by the large number of guests who were present.

Dominion Scout Rally

BY

Syed Mohammed Hadi, M. A. (Cantab),

Organising Commissioner of Boy Scouts and Director of Physical Education for Schools.

The Boy Scout Movement is connected with the various measures of reform adopted from time to time to promote the welfare of the youth of the Hyderabad State. It was in the fitness of things that a Scout function should have been arranged on the great and auspicious occasion of the Silver Jubilee of His Exalted Highness Nawab Sir Mir Osman Ali Khan Bahadur, G. C. S. I., G. B. E., Nizam of Hyderabad and Berar. The grandeur of this Rally and the arrangements made in connection with it were such that it might have been more aptly called a 'Jamboree'.

Preparations were afoot weeks before the actual date of the Rally and not less than two hundred and twenty five tents were pitched on the Beresford Polo Ground for the troops. Special arrangements for the supply of pipe-water and electricity in the Camp were made and kitchen sheds were erected for those troops which desired to do their own cooking. There were four hotels, vegetarian and non-vegetarian, which were given a contract to supply food at a reasonable rate to those troops which did not wish to do their own cooking. An arch was constructed with staves and decorated with the scarves of the troops present in the Camp.

The work of the camp was distributed among various scout officers who had volunteered their services. The Rovers were of great service to the Head-Quarters. Each section of the Camp was under the charge of a section

May His Exalted Highness live long in health and happiness so that this great State may continue to reap the benefits of his benign rule!

---

pronouncement, we may safely anticipate that in the near future steps will be taken to draw up a regular programme for further expansion and improvement of Primary Education, so that it may be financed as funds are available.

Equally, if not more, pressing, is the problem of Women's Education. The constitution of the Board of Education provides not only for the representation of women but also for the establishment of a statutory Committee for Girls' Education. When this Committee, which will be composed mainly of women, is formed, it will no doubt give an impetus to Women's Education. The deep interest which Her Royal Highness the Princess of Berar takes in all movements connected with the uplift of women is also a happy augury for the future of Girls' Education in the State.

This article will be incomplete without a mention of the Teachers' Associations which have been established in the various Divisions during the last decade. The Hyderabad Teachers' Association, in particular, has done yeomen service in stimulating the interest of teachers in the technique of education. The different Committees appointed by the Association in the past few years have produced more than a dozen useful reports on the teaching of various school subjects and other educational matters, while *The Hyderabad Teacher*, the quarterly organ of the Association, has helped to keep the teachers in touch with the latest developments in educational theory and practice and to focus their attention on the current educational problems.

With His Excellency the Rt. Hon'ble Sir Akbar Hydari as President of the Council and Nawab Mahdi Yar Jung Bahadur as Education Member, both in the front-rank of educationists in India, and with an enlightened Ruler ever ready to give his gracious support and patronage to all schemes for the educational advancement of his subjects, a bright future for education in these Dominions may confidently be predicted.

to the rest of India in reorganising education to meet the present-day needs just as it has already given the lead in the matter of imparting higher education through the medium of the Vernacular.

We are fortunate in having as our Educational member Nawab Mahdi Yar Jung Bahdur who has had actual experience of educational organisation and administration both in British India and the State and who has made a careful study of the educational needs of the State. Apart from Educational Reorganisation, the questions which are now engaging his earnest attention are those of Primary Education and Women's Education. In a speech which he recently made at the Tenth Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association, he declared that it was the intention of Government to adopt effective measures for the expansion of Primary Education. He sympathised with the proposal for the introduction of compulsory education, but pointed out that owing to practical and administrative difficulties, it was not possible to make Primary Education compulsory all at once. "There are facilities yet to be provided," he said, "for those who now willingly go to school." The Report of the Sub-Committee for the Reorganisation of Education also states that the "object of the Education Department is to expand Primary Education to such an extent as to bring it within the reach of every boy and girl of school-going age." Still more significant is the reference to Primary Education made by our farsighted and benevolent Ruler in his reply to the address which was presented by his loyal subjects on the occasion of the Silver Jubilee. "It is my special desire," said His Exallted Highness, "that elementary education should become universal; that there should be more primary schools and that they should all have suitable buildings provided for them; and that through Local Fund Committees, opportunities should be given to the public to interest themselves in, and to further the cause of elementary education." In view of this

of young men who will take the agricultural, commercial and industrial courses under the new scheme.

As regards of the Nizam College, one of the reservations made by Government while sanctioning the Report of the Sub-Committee for the Reorganisation of Education is "that the affiliation of the Nizam College with the Madras University be continued for the time being." The words "for the time being" suggest that Government intend to reconsider the recommendation of the Sub-Committee that "the Nizam College should be an Associated College of the Osmania University, working for the degrees granted by the Osmania University, but with English as the medium of instruction....................". On page 2 para 4-c of their report, the Sub-Commitee give their reasons for making this recommendation. "Our witnesses were practically unanimous", they write, "that the control which the Madras University now exercises over education in H. E. H. the Nizam's Dominions should cease. We personally are strongly of the same opinion. The educational system and courses of study of every State should be devised with special reference to the needs and conditions of its own people. It is from an educational point of view highly unsatisfactory that a body situated 500 miles away from the capital of the Dominions should exercise any control whatever over the educational system of the State. It is obvious that the Government of the Dominions cannot express through their own educational system their own views regarding the lines of development in the State so long as any part of this system is outside their control."

Much preliminary spade-work will be necessary before the Reorganisation Scheme is actually put into force, and even after the completion of this work, it is proposed to introduce vocational and technical courses gradually as funds become available and as the economic conditions of the state demand. When the scheme materialises, Hyderbad will have the proud satisfaction of having given the lead

foundation for higher studies. In the High Stage there should be, besides courses in Arts and Science, Technical courses in Agriculture, Commerce and Industries.

(3) There should be no departure from the existing policy of the State regarding the medium of instruction.

(4) A Board of Education should be established for the supervision and control of Secondary and High School Education with the Director of Public Instruction as *ex-officio* Chairman. It should include representatives of the Education Department, the Osmania University, of the public and Girls' Education as well as representatives of the Agriculture, Commerce and Industries, Co-operative and Public Works Departments.

(5) There should be two examinations, one at the end of the Secondary Stage and the other at the end of the High School Stage.

The main defect of the existing system of education is the uniformity of the High school course, which is dominated by the requirements of University education. Under the scheme recently sanctioned by His Exalted Highness' Government, the curriculum will be rendered more elastic with different courses of study for pupils with an academic bent and for those who wish to pursue higher professional studies or to enter on a practical career after the completion of the High School course. At the same time, the courses of study in the Primary and Secondary Schools in the rural areas will be brought more into harmony with rural conditions. The scheme will also definitely raise the standard of admission to the University for which there is great need.

One of the objects of the Reorganisation Scheme is to correlate education to employment. In order that this object may be attained, it will be necessary for the Departments of Agriculture and Commerce and Industries actively to co-operate by creating new openings for the employment

principles are: (1) that Primary education should aim not merely at making the masses literate but at providing a better equipment for their lives; (2) that each stage of education should be self-contained with a definite objective of its own; and (3) that there should be a large diversion in the pre-university stage from a purely literary course either to occupations or vocational institutions.

As a result of the recommendations of the Committee appointed in 1925, vocational instruction was introduced in a number of schools between 1928 and 1933, side by side with the already existing courses of general education. In November, 1934, in his presidential address at the 8th Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association, the late Dr. A. H. Mackenzie, the then Pro-Vice-Chancellor of the Osmania University, drew attention to the need for a radical change in the educational system of the State. The scheme which he outlined in his address was similar to that proposed by the Government of the United Provinces and embodied, in the main, the principles laid down by the Rt. Hon'ble Sir Akbar Hydari in his Punjab University Convocation Address. The Government of His Exalted Highness the Nizam at once appointed a Committee to consider the question of educational re-organisation. Two members of the Committee, viz., Mr. Fazl Muhammad Khan and the late Dr. Mackenzie, were constituted into a Sub-Committee, and the recommendations made by them were sanctioned by Government with certain modifications in October, 1936.

The leading features of the new scheme are as follows:—

(1) There should be four stages of instruction each with a definite objective: Primary (5 years), Secondary (4 years), High (3 years) and University (3 years).

(2) The Secondary Stage should not only provide vocational instruction, but should constitute a suitable

State, the educational budget steadily rose from Rs. 14 lakhs in 1910-11 to well over a crore in 1934-35. The increase in the number of institutions and scholars during the period was as follows :—

Year	Institutions	Scholars
1910-11	1036	66,482
1934-35	4746	3,53,582

It will be seen from the above table that the number of institutions and scholars has increased about five times since 1911. The proportion of pupils under instruction to the total population of school-going age was less than 5 per cent in that year; now it is nearly 18 per cent. The proportion of boys to the male population of school-going age is now nearly 30 per cent, as against 5.9 per cent in 1911, while that of girls to the female population of school-going age is now nearly 5 per cent, as against 0.7 in 1911.

It is interesting to observe that just as a report on the reorganisation of education in the State marked the beginning of the Silver Jubilee period, so also another report dealing with educational reconstruction in the light of more recent developments marks the conclusion of that period and the opening of a new chapter in the history of education in the State. The idea of remodelling the system of education with a view to the introduction of vocational training, which is now engaging the serious attention of educationists in British India, has been under the consideration of His Exalted Highness' Government for many years past. As far back as in 1925 a Committee was appointed to consider this question, and in the same year, in his able and inspiring Convocation Address of the Punjab University, the Rt. Hon'ble Sir Akbar Hydari not only urged the need for reorganising the system of education, but suggested the lines on which reform should be carried out. The main principles enunciated by Sir Akbar Hydari were endorsed by the Punjab Inquiry Committee and later by the All-India Universities Conference, held in March, 1934. These

based on Mr. Mayhew's recommendations,was sanctioned in 1913-14; but it was not till 1917-18 that the scheme was completely put into force. The scheme also provided for the appointment of an additional Nazir or Sub-Assistant Inspector in each district for every increase of 66 Primary Schools.

A complete reorganisation of the Inspectorate was effected in 1917-18. With a view to decentralisation of administration, each Suba was given a Divisional Inspector and the grade of the Inspector at Head-Quarters was also raised to that of a Divisional Inspector. Besides co-ordinating the work of the District Inspectors under him, each Divisional Inspector was required to devote his full attention to the organisation and development of Secondary Education in his Division.

Owing to the creation of Divisional Inspectorships, the office of Chief Inspector of High Schools had become unnecessary. Therefore, this post was abolished in 1920 and that of Deputy-Director of Public Instruction was created.

Conclusion.

The first twenty-five years of the reign of His Exalted Highness Nawab Sir Mir Osman Ali Khan Bahadur may well be called an Era of Enlightenment and Progress. His Exalted Highness resolved at the very outset to make Hyderabad a modern state. With this end in view, he devoted special attention to the development and spread of education in the State, and his deep interest in education resulted, within six years of his accession, in the creation of the Osmania University, which is a landmark in the history of education in the State. This re-orientation of educational policy has accelerated the rate of progress and brought about a wider diffusion of knowledge and culture than would have been possible under a system of education through the medium of a foreign language. Thanks to His Exalted Highness' munificence and to the financial prosperity of the

were intended to train teachers for work in the different Divisions in the Vernacular of the Division, while the Training School at Hyderabad was started for teachers of Urdu Girls' Primary Schools.

The training of teachers of Secondary Schools was first undertaken in 1924 when arrangements were made in the Training School for Men at Hyderabad for training every year 25 Matriculates along with 100 Middle passed teachers. Two years later a class for the training of Intermediates, with one year's course, was opened, and at the same time, by cutting down the subjects of general education, the period of training for Middle passed men and Matriculates was reduced from two years and 1½ years, respectively, to one year. With the creation of the Faculty of Education in the Osmania University, a class for the training of Graduates was added in 1929 and to mark the change in its status, the institution was called the Osmania Training College.

The class for the training of Middle passed Urdu teachers in the Training College was abolished in 1931 and arrangements were made for training such teachers along with Marathi teachers in the Aurangabad Training School, Telugu teachers in the Warangal Training School and Canarese teachers in the Gulburga Training School. The Training Schools at Aurangabad and Warangal were further developed in 1934, when a class for the training of Matriculates was added in each of these institutions.

Including two Recognised Normal Schools maintained by the Wesleyan Mission, one for men at Medak and the other for women at Secunderabad, there were in 1934-35, 9 Training Institutions of all grades with an aggregate strength of 281.

The Inspectorate.

A Chief Inspector of High Schools was appointed in 1912-13 and a Chief Inspectress of Girls' Schools in 1913-14. A scheme for giving each district an Inspector of Schools,

giving graduate and undergraduate teachers training in Physical Education has greatly helped to raise the standard of Physical Education in the Secondary Schools to which they have returned after training. At the same time efforts have been made to improve the efficiency of the Drill-Masters by organising short courses of training for them.

The Boy Scout and Girl Guide Movements.

The Boy Scout movement was formally inaugurated in H. E. H. the Nizam's Dominions in 1923-24. The Director of Physical Education for Schools is also the Organising Commissioner of Boy Scouts. To enlist the co-operation of the public in the Boy Scout movement, 7 Local Associations—2 at Headquarters and 5 in the Districts—have recently been started. In 1934-35 there were altogether 110 troops with a strength of 3247. The troops in the Administered Areas are under a separate organisation.

The Girl Guide Movement in the State is of more recent origin, the date of its inception being 1928-29. For the furtherance and improvement of the movement, Government appointed a Guide Trainer in 1929-30. Since then it has made rapid strides. In 1934-35 the Guides, Blue-birds and Rangers numbered 1942.

Training of Teachers.

There was only one training institution in 1911, viz., the Government Normal School at Hyderabad, where teachers drawn from the Primary Schools were trained for a period of two years. Owing to the expansion of Primary and Secondary Education, the need for providing more adequate facilities for the training of teachers became imperative. Therefore in 1918-19, 4 new Training Schools were opened–three for women, at Hyderabad, Warangal and Aurangabad and one for men at Warangal. A year later a Training School was established at Gulburga for women teachers and another for male teachers at Aurangabad. The Training Schools at Warangal, Aurangabad and Gulburga

Physical Education.

In 1911 there were Gymnastic Instructors in all the High Schools and some of the more important Middle Schools. These instructors were usually retired soldiers of the army with hardly any idea of the kind of physical exercises needed for school boys. The first step which was taken to place Physical Education on a sound basis was to secure in 1914-15 from the Y. M. C. A., Hyderabad, on payment of an annual grant of Rs. 2,500, the services of their Physical Director to train drill-masters, supervise Physical Education in schools and generally to advise the Education Department on all questions affecting Physical Education. The next step taken was the founding of the Hyderabad Athletic Association in 1919-20 with the object of encouraging sportsmanship through out-door games amongst the school boys at Headquarters. By 1920-21 all Government Middle Schools had been provided with Drill-Masters. In the same year the scale of salaries, which was originally Rs. 10 and later Rs. 15-20, was raised to Rs. 30-40 in the case of Senior Drill-Masters and Rs. 25-35 in the case of Junior Drill-Masters. Thereafter it became possible to attract a better type of men for service as Drill-Masters. The next important stage of development was that in 1925-26 the offices of Director of Boy Scouts and Chief Inspector of Physical Education were combined, Mr. S. M. Hadi, B A., (Cantab), being appointed to the new post. The arrangement made with the Y. M. C. A. in 1914-15 thus came to an end after this. In order to emphasise the importance of Physical Education, orders were issued in 1928-29 making it compulsory for all school pupils to take some physical exercise every day. The Department then took up the question of improving further the quality of physical education. With this end in view, a College of Physical Education was opened in 1930-31, and Mr. F. Weber, B. P. E., who had already been appointed in the previous year as the Director of Physical Education for Colleges, was given charge of this College as well. The provision thus made for

of opening special schools for such children. At first these schools were chiefly of the Aided type, but in 1933-34, 18 schools under the Private Agency were taken over by the Education Department and converted into Shahi Schools. A year later Government were pleased to sanction a comprehensive scheme providing increased facilities for the education of the depressed class children, but, owing to lack of funds, it has not been found possible to put it into force yet. There were at the end of 1934-35, 101 Schools for the depressed class children with 3,514 pupils. The expenditure under this head amounted to Rs. 28,797.

Religious Schools.

The Ecclesiastical Department maintains 3 Islamic Schools, while 12 Islamic Schools and 6 Sanskrit and Vedic Schools are Aided institutions. In 1934-35 the total strength of the Religious Schools was 1,308, while the aggregate expenditure amounted to Rs. 46,860, including the grant-in-aid of Rs. 34,450 awarded to Madrasa-e-Nizamia, Hyderabad Deccan, founded in 1913-14.

Adult Education.

Three Adult Schools were started under the Private Agency for the first time in 1925-26 in the City of Hyderabad with the object of spreading literacy amongst adults. The movement extended to the Districts in 1930-31, and by 1934-35, 49 Adult Schools (19 in Balda and 30 in the Districts) had been established. Of these, 25 were Aided and 24 Unaided Recognised institutions. The total number of pupils under instruction in the Adult Schools in 1934-35 was 1,761.

In 1933-34 special rules and regulations laying down the lines on which Adult Schools should be organised and conducted were enforced. It is to be regretted that so far the public has not shown that interest in this movement which it deserves and which is so necessary for its rapid growth.

as in the case of Boy's schools and to devote its attention chiefly to strengthening and improving institutions already existing. The result was that whereas between 1915-16 and 1921-22 there was an increase of 669 Girls' Schools, the total number of schools added between 1922-23 and 1934-35 was only 35. It is, however, gratifying to note that during the six years between 1928-29 and 1934-35, Secondary Education for Girls made great headway, especially at Headquarters. Six Middle Schools and 3 High Schools were added during this period, while the Nampalli Zenana School, where Intermediate Classes had been opened in 1923-24, was raised to the status of a First Grade College in 1931-32 under the name of the Osmania University College for Women. During this period the Mahboobia Girls' High School has also an excellent record of progress to its credit. This institution has an imposing building and a highly qualified staff, which includes seven European ladies. It has continued to prepare its pupils for the Cambridge Local Examinations.

The following table shows the number of Girls' Schools in 1910-11 and 1934-35:—

Year.	Schools.	Scholars
1910-11	91	6,346
1934-35	704	49,763

Of the 704 schools, there were in 1934-35, 674 Primary Schools with 41, 213 pupils, 17 Middle Schools with 3,552 pupils, 8 High Schools with 2,867 pupils and one First Grade College with 555 in the School Section and 33 in the College Section. The remaining four schools were Special Schools.

Education of the Depressed Classes.

As experience had shown that, owing to their social disabilities, the depressed class children were often unable, as in other parts of India, to take full advantage of the Public Schools, in 1916-17 Government adopted the policy

Nevertheless, the fact that the number of Primary Schools increased from 921 in 1910-11 to 4,368 in 1934-55 and the number of pupils from 48,113 in the former year to 2,73,097 in the latter, shows that the progress of Primary Education during the period was satisfactory. There was a corresponding increase in the expenditure on Primary Education, which in 1934-35 amounted to Rs. 25,88,941, as against Rs. 2,81,693 in 1910-11. This increase in expenditure would have resulted in greater expansion but for the reason that provision had to be made in one and the same school for imparting instruction through the various vernaculars in accordance with the orders of Government that Primary Education should be given through the mother-tongue of the pupils.

Industrial and Technical Education.

There were only half-a-dozen Industrial and Technical Schools in 1911. Three such schools were added in 1922-33, one of them being the Osmania Central Technical Institute, Hyderabad. There were in 1934-35, 11 Industrial and Technical (3 Government, 3 Local Fund and 5 Aided) Schools with a total strength of 1,286.

Girls' Education.

Girls' Education was at a low ebb in 1911. The first measure that was adopted to develop and organise it on a sound basis was that in 1913-14 an Inspectress of Girls' Schools was appointed in accordance with Mr. Mayhew's recommendations. This was followed by the opening of a large number of Girls' Schools between 1914-15 and 1921-22. For many years one great obstacle in the way of Girls' Education had been the dearth of qualified women teachers. In order to overcome this difficulty, four Training Schools for women were opened during the years 1918-19 and 1919-20 at Hyderabad, Warangal, Aurangabad and Gulburga. After 1922-23, owing to lack of funds, the Department had to put a check to its policy of expansion,

After 1922-23, owing to the financial stringency, schemes for further expansion of Primary Education had to be suspended and for the next eight years the energies of the Department were directed more towards consolidation of the progress already made than towards the opening of new schools. Schools which had shown little or no promise were closed down and the money thus saved was utilised for strengthening deserving institutions. The sanction of the Time Scale, under which the minimum salary of the Primary teacher in a Government School was raised from Rs. 15 to Rs. 30 per mensem, greatly helped to raise the standard of efficiency in the Shahi Primary Schools. Steps were also taken to increase the supply of trained teachers. Finally, the new curriculum which was introduced in 1930-31 made the Primary Schools more popular, because it brought the courses of study in them into closer relationship with the life and surroundings of the pupils.

In 1932 an Experimental School called the Model Primary School was opened at Hyderabad with the object of providing an opportunity for experiments in the field of Child Education. In the same year the Department renewed its efforts at expansion. No fewer than 219 Schools were added in that year. Of these 94 were Government Schools, and the additional expenditure on them was met from Departmental savings. These savings had been effected chiefly by converting Shahi Schools at unimportant places into what were known as the New Type of Local Fund Schools. These were to be maintained at a reduced expenditure out of a contribution from Shahi funds until such time as the Local Boards were in a position to take them over. Since 1932 the funds at the disposal of the Department have not been such as to enable it to push its schemes for the expansion of Primary Education further. Nor has its hope that the Local Boards would take over the New Type of Local Fund Schools been realised.

School, Hyderabad, the Government Collegiate Schools at Warangal, Gulbarga and Aurangabad, the Government Zenana Collegiate School at Hyderabad and the Nutan Vidyalaya, Gulburga, are combined High Schools preparing pupils both for the Osmania Matriculation and the High School Leaving Certificate Examinations. The number of High Schools which prepare pupils for the Cambridge Local Examinations is only 6; all the other English High Schools follow the courses prescribed by the High School Leaving-Certificate Board.

The total expenditure on Secondary Education in 1934-35 was Rs. 30,96,262 as against Rs. 4,70,509 in 1910-11.

Primary Education.

The progress of Primary Education was very slow till 1915. Recognising the vital need for a rapid expansion of Primary Education, Mr. (now Sir) Ross Masood, who was appointed Director of Public Instruction in 1916, set out with the aim of providing, within as short a time as possible, each village having a population of more than 1,000 with a school. The steps which were taken to carry out this aim were: (a) the opening of Local Fund Schools of the Experimental type, in accordance with the scheme formulated by Mr. Mayhew, and (b) the conversion of thriving Local Fund Schools into Shahi Schools. Thanks to the liberal annual grants made by the Government from 1915-16 to 1921-22, for the expansion of Primary Education, there was an increase of 3,080 Primary Schools and of nearly 1,42,000 pupils during these years.

The year 1921-22 is memorable in the history of Primary Education in these Dominions, because in that year with the object of bringing the benefits of education within the reach of the poorest of his subjects, His Exalted Highness the Nizam was graciously pleased to issue a *Firman* making instruction in all Primary Schools free.

The scheme proposed by him contemplated the creation of a Controlling Board, consisting of representatives of the Education Department, the Osmania University, the Nizam College and the public. Summing up the discussion, Nawab Mahdi Yar Jung Bahadur, M. A., (Oxon), President of the Conference, rightly remarked, "While our energies are now divided, under the system proposed by Mr. Azam, they will be concentrated and will consequently produce better results." A Committee consisting of representatives of the Osmania University and the Education Department had already been appointed by Government to consider the question of amalgamation, but the difference of opinion among the members was so great that the question had to be shelved, until it was reopened in 1934 by the late Dr. A. H. Mackenzie.

After the abolition of the Middle School Examination in 1928-29, a Departmental Examination was instituted for those intending to qualify themselves for service in the Education Department as teachers in Primary Schools.

The following table shows the number of various types of Secondary Schools and their strength in 1910-11 and 1934-35 :—

	1910-11.		1934-35.	
	Schools	Scholars	Schools	Scholars
Middle Schools	64	10,408	130	41,318
Faukania ,, ...	10	2,045	—	—
English High Schools	14	3,873	29	14,718
Osmania ,, ,, ...	—	—	25	13,807
Total ...	88	16,326	184	69,843

It will be seen from the above table that since 1911 the number of Secondary Schools has more than doubled while their strength has more than quadrupled.

Of the 29 High Schools classed as English High Schools at present, six, viz. the Government City Collegiate

Matriculates, Intermediates and finally Graduates, there was a rapid increase in the number of trained teachers in the Secondary Schools, while the enhanced scale of salaries sanctioned under the Time Scale in 1920-21 helped the Department in attracting a better type of men for service as teachers in such schools. At the same time, under the new Grant-in-aid Code, which was introduced in 1921-22, Aided Secondary Schools were enabled by increased grants to improve their teaching staffs and equipment.

Mr. Fazl Muhammad Khan, who was appointed Director of Public Instruction in December, 1928, was anxious to give a practical bias to education. Within a short time, he succeeded in introducing vocational instruction in a number of Secondary Schools. He also carried out two other important reforms. The first was the abolition of the Middle School Examination, which had outlived its usefulness, and the second the revision of the curriculum. The new curriculum, which was introduced in 1931, affected all grades of schools, more especially the Osmania High Schools. With a view mainly to raising the standard of English, the course for the Osmania Matriculation Examination was extended from two to three years and was thus brought into line with the H. S. L. C. course. Elementary Science, Indian History and Geography were introduced as compulsory subjects for the Osmania Matric as well as the H. S. L. C. courses. Moreover, the syllabuses in these and other non-language subjects for both the examinations were made more or less uniform. The next logical step would have been to adopt a common system of examination, giving the candidates the option to answer the question papers in these subjects either in English or Urdu. A resolution recommending the adoption of such a common system was moved by Mr. Syed Mohamed Azam, M. A., (Cantab), B. SC., Principal, City College, at the Second Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association held in 1928, and it was carried by a large majority.

distinction between the Vernacular Middle Schools and the Anglo-Vernacular Middle Schools vanished. Most of the Anglo-Vernacular Middle Schools preferred, however, to change the medium of instruction from English to Urdu.

The establishment of the Osmania University, coupled with the rapid expansion of Primary education which had preceded it, led to a large increase in the demand for Secondary Education. Government therefore definitely adopted the policy of providing the headquarters of each district with a High School and as many Taluk headquarters as possible with Middle Schools. In pursuance of this policy 27 Middle Schools and 22 High Schools were established between 1915-16 and 1926-27, while 22 more Middle Schools and 11 more High Schools were added between 1927-28 and 1934-35. Among the High Schools opened in the former period was the Jagirdars College, a residential school intended for the sons of the landed gentry and maintained out of a cess collected from the Jagirdars in proportion to their revenue. This institution was founded in the year 1923-24.

Steps were taken at the same time to raise the standard of efficiency in Secondary Schools. From 1914 onwards men of high qualifications on a salary of Rs. 500—1,000 were appointed heads of important High Schools like the City High School, the Chaderghat High School and the Aurangabad High School. The City High School was provided with a magnificent building in 1921-22 at a cost of Rs. 9 lakhs. New buildings, for over two dozen other Government Secondary Schools, were also constructed according to standard plans, between 1926-27 and 1934-35. The creation of Divisional Inspectorships in 1918-19 brought about a more effective supervision of Secondary Schools. The teaching staffs were considerably improved. At first a certain number of Graduates and Intermediates were sent to British India for training every year. Later, when arrangements were made at Hyderabad for training

to 151 in 1914-15, to 285 in 1926-27 and a few years later to over 300, until in 1934-35, as in the case of the Colleges under the Osmania University, it was felt necessary to impose a restriction on the numbers to be admitted each year, the limit fixed being 300. B. Sc. classes were opened in 1920-21 and a year later a spacious building was constructed for the Science Department at a cost of Rs. 3 lakhs. The year 1923-24 saw the opening of a B. A. Hons. class. Women students began to be admitted to the College in 1929-30. The results of the College in the B. A., B. Sc. and Intermediate Examinations of the Madras University have been uniformly good since 1917. The expenditure, which in 1910-11 was Rs. 96,000, had risen to nearly Rs. 2,36,000 by 1934-35.

Secondary Education.

Neither the Faukania Schools nor the Rooshdia Schools proved a success. Therefore, in 1915 Dr. Alma Latifi, the then Director of Public Instruction converted all the Rooshdia Schools and seven out of the ten Faukania Schools into Vernacular Middle Schools.

The inauguration of the Osmania University in 1917 necessitated a complete re-organisation of Secondary Education. The entire curriculum of Secondary Education was revised and adjusted to the new needs in 1921. High Schools were classed under two heads—English High Schools and Osmania High Schools. The former, with English as the medium of instruction in the Middle and High Sections, were to follow, as before, the course of studies prescribed under the Regulations laid down by the Madras University for the H. S. L. C. Examination, while the latter, with Urdu as the medium of instruction throughout and English as a compulsory second language from Standard III onwards, were to prepare students for the Osmania Matriculation Examination. With the introduction of English as a compulsory subject in all Secondary Schools, the old

the Zenana High School, Nampalli, in 1924, in the Warangal High School in 1927 and in the Gulburga High School in 1931. By 1927, besides the Faculties of Art, Science and Theology, those of Law and Medicine had been created. The Faculties of Engineering and Education were opened in 1929. In 1931-32 the Nampalli Zenana Intermediate College was raised to the status of a First Grade College and became known as the Osmania University College for Women.

His Exalted Highness the Nizam was graciously pleased to lay the foundation-stone of the new University buildings at Adikamet in June, 1934. The estimated cost of these buildings is about a crore and a half of rupees. In the same year, the Arts College, the Engineering College, the University Office and the Translation Bureau were shifted to temporary buildings at Adikamet constructed at a cost of nearly Rs. 11 lakhs. This was followed by a remarkable development in the corporate life of the University, especially after the construction of two permanent hostels with accommodation for over 300 boarders. Another important change which took place in 1934 was that on the retirement of Mr. Abdur Rahman Khan, B. SC. (London), the post of Principal was abolished and Mr. A. H. Mackenzie, M. A., D. Litt., C. S. I., C. I. E., was appointed to the newly-created post of Pro-Vice-Chancellor.

There were in 1934-35, 9 Colleges under the University with a total strength of nearly 1,379 of whom over 75 per cent. were in the Faculties of Arts and Science. The total expenditure that year was over Rs. 20.5 lakhs.

The Nizam College—The establishment of the Osmania University did not in any way affect the policy of the Government towards the Nizam College. This institution has been maintained with unimpaired efficiency for the benefit of students who prefer the English medium. The strength of the College in 1910-11 was only 84; it increased

popular, and the strength of the College classes of the Darul Uloom gradually declined until it reached the low figure of 22 in 1914-15. Since his appointment as Home Secretary, Mr. A. Hydari (now His Excellency the Rt. Hon'ble Sir Akbar Hydari) had felt the need for a radical reform of higher education. In 1917 he submitted a memorandum to His Exalted Highness pointing out the inherent defects of a system of education through the medium of a foreign language and recommending the establishment of a University, to be known as the Osmania University, with Urdu, the official and most widely-understood language in the State, as the medium of instruction and with English as a compulsory second language. With his foresight in educational as in other matters, His Exalted Highness at once saw the advantages of such a University and was graciously pleased to issue in the same year a *Firman* sanctioning the proposal. The first step towards bringing the University into existence was taken in 1918 by establishing a Translation Bureau with the object of getting text-books in the various subjects of instruction translated into Urdu. Within five years the Bureau completed the translation of nearly all the books required for the Matriculation, Intermediate and B. A. Examinations. The Osmania University College was formally opened in 1919. While the School Section of the Darul Uloom became an Osmania High School preparing pupils for the Osmania Matriculation Examination, the College Section was merged in the Faculty of Theology, which was opened in 1919-20. The first Matriculation Examination was held in 1918, the first Intermediate Examination in 1921, and the first B. A. Examination in 1923. The Oriental Titles Examinations finally disappeared in 1924.

As had been anticipated, the inauguration of the Osmania University led to a rapid development of higher education. In order to meet the growing demand for such education, Intermediate classes had to be opened in the City High School and the Aurangabad High School in 1923, in

his interest in education diminish after he became Finance Member. Indeed, as subsequent events proved, his appointment as Finance Member was as distinct a gain to education as to the finances of the State.

Those who have held the office of Director of Public Instruction during the period 1911 to 1935, have each made a special contribution to the cause of education in the State. Mr. Alma Latifi, M. A. L. L. D., I. C. S., who succeeded Dr. Syed Sirajul Hasan in 1913, improved the internal organisation of the Department and took steps for the expansion of Primary Education on the lines suggested by Mr. Mayhew. Sir Ross Masood, B. A. (Oxon), L. L. D. (Nawab Masood Jung Bahadur), who was in charge of the Department from 1916 to 1927, speeded up the progress of education in all directions and left a brilliant record of work, the number of schools and scholars having trebled during his tenure of office. To Mr. Fazl Muhammad Khan, M. A. (Wrangler), the present Director, is due the credit for consolidating the progress made in previous years, for developing Secondary Education on more efficient lines and for introducing vocational instruction in a number of schools.

Thanks to His Exalted Highness' gracious patronage of learning and his deep and abiding interest in education, there has been, during his illustrious reign, a phenomenal development in all branches of education—University, Secondary, Primary, Vocational and Industrial Education, Women's Education, Education of the Depressed Classes, Adult Education, Physical Education, the Boy Scout and Girl Guide Movements, and the Training of Teachers. The Inspectorate has also been strengthened and reorganised. I shall now proceed to give a brief account of the progress of education under the above-mentioned heads.

University Education.

The Osmania University—The Oriental Titles Examinations instituted by the State in 1907 never became

which had suffered for many years from the cramping influence of the Madras Matriculation Examination. A few schools, notably the Mahboobia Girls' School, founded in 1907-08, and St. George's Grammar School, however, continued to prepare their pupils for the Cambridge Local Examinations.

Dr. Syed Sirajul Hasan took a keen interest in industrial education. Three Local Fund Industrial Schools were opened between 1907 and 1909, one at Nizamabad, one at Bidar and one at Narayenpet. Another question to which he devoted special attention was the construction of school buildings. At his suggestion, in 1907-08 Government sanctioned a four years' programme for the construction of school buildings at a cost of 3 lakhs of rupees.

Educational Progress from 1911 to 1935.

With the accession of His Exalted Highness Nawab Sir Mir Osman Ali Khan Bahadur, Asaf Jah VII, we come to a period of intense educational activity. Two important events had paved the way for this activity. The first was the appointment of Mr. A. T. Mayhew, M. A. (Oxon), I. E. S., as Educational Advisor in 1910 for a period of two years, and the second the appointment of Mr. A. Hydari, B. A. (now His Excellency the Rt. Hon'ble Sir Akbar Hydari, Nawab Hyder Nawaz Jung Bahadur, P. C. L. L. D.), as Home Secretary in 1911. In the able and comprehensive report which Mr. Mayhew submitted at the end of 1911, he made valuable suggestions for the expansion and reorganisation of Primary and Secondary Education as well as for the reform of the administrative machinery of the Education Department, but it was left to His Excellency the Rt. Hon'ble Sir Akbar Hydari finally to shape the educational policy of the State. As Home Secretary, not only did he bring the Osmania University into existence, but he gave a vigorous lead to Primary and Secondary Education, as a perusal of his masterly reviews of the annual administration reports of the Education Department will show. Nor did

Darul Uloom improved in strength and efficiency, especially after its affiliation to the Punjab University for the Oriental Titles Examinations. Equally satisfactory was the progress achieved in the sphere of Professional and Technical Education. The Normal School at Hyderabad was reorganised and an Engineering School, a Medical School, a Law School and some Industrial Schools were also opened. There were in 1882-83 only 186 institutions with not more than 11,599 pupils and an educational budget of Rs. 1,53,160; by 1905-06, the number of schools had increased to 882, the number of scholars to 59,821 and the expenditure to Rs. 10,31,255.

In 1907 shortly after Mr. Syed Sirajul Hasan, M. A., B. C. L., L. L. D. (now Nawab Siraj Yar Jung Bahadur), was appointed Director of Public Instruction, the State was obliged, as a result of the passing of the Indian Universities Act, to disaffiliate the Darul Uloom from the Punjab University and to institute its own Oriental Titles Examinations. There were then the following types of the Secondary Schools in existence:—

1. *Faukania Schools*—These were Oriental High Schools preparing pupils for the Munshi and Moulvi Examinations. English was taught as a second language.

2. *Rooshdia Schools*—These acted as feeders to the Faukania Schools and prepared pupils for the Rooshdia Examination.

3. *English High Schools*—Preparing pupils either for the Matriculation Examination of the Madras University or for the Cambridge Local Examinations.

4. *Anglo-Vernacular Middle Schools*—These were feeders to the English High Schools and prepared pupils for the Middle School Examination, which was instituted by the State in 1890-91.

The introduction of the High School Leaving Certificate Scheme in 1911 gave an impetus to English education,

Educational Progress Under Asaf Jah VII*

BY

Syed Ali Akbar, M. A. (Cantab)

It is necessary to know something of the history of education in the Hyderabad State before 1911 to be able to appreciate the progress in education which has been achieved during the glorious reign of His Exalted Highness Nawab Sir Mir Osman Ali Khan, Asaf Jah VII, G. C. S. I., G. B. E., Sultan-ul-Uloom, Nizam of Hyderabad and Berar.

The first step towards public instruction was taken by the great statesman Sir Salar Jung in 1853, when he founded the Darul Uloom, which was to be a centre of Oriental learning. The Education Department was created in 1868, and by 1883, when Mr. Syed Husain Bilgrami, B. A. (afterwards Nawab Imadul Mulk Bahadur, C. S. I.) was appointed Director of Public Instruction and Educational Secretary, education had come to be recognised as an important function of the State. To him is due the credit for organising the Department on modern lines. One of his earliest measures was to appoint an Inspector for each Subah with a Nazir under him for each district. He extended the facilities for Secondary and Primary Education in the districts by establishing a High School at the headquarters of each district and a Primary School in every well-populated village. At Headquarters, the City High School, the Chaderghat High School and Aided High Schools like St. George's Grammar School (founded in 1834), the Mahboob College and the All Saints' Institute were greatly developed; the Hyderabad College was amalgamated with the Madrasa-e-Aliya and the institution came to be known as the Nizam College, a first grade college affiliated to the Madras University; and the

*This article is based on 'Education under Asaf Jah VII', a book recently published by H. E. H. the Nizam's Education Department on the occasion of the Silver Jubilee.

We must turn now to the purpose for which we are assembled here today. A heartfelt prayer shall be my last word as it was my first thought.

Let your deepest concern be for the health of your minds and bodies. Let your persistent thought be for your goal in life which is the reason of your being. Have confidence in yourselves and in your capacity. Let there be a meaning to your existence so that it will be remembered with respect and reverence by your children and their children.

May God give you all Peace, Happiness, and the Contentment of Achievement!

---

ments. Few professions in this generous land of ours are closed to us. The limit to the achievement of the Indian woman is set chiefly by her own ambition and ability. Let your ambition strive to remove the legal and social disabilities that stand in your way: let your ability prove the supreme justification of that removal.

I am happy to see that the ancient Hyderabadi tradition of intercommunal concord and friendship is a living reality among the women of our Dominions. I trust that this spirit will continue to grow, manifesting itself in greater and truer appreciation of one another's creeds, cultures, beliefs, and in close co-operation and comradeship that will help the onward march of their united efforts.

Now I have come to the last of my few suggestions, one which I consider most vital because it deals with the personality of a people. Personality is a thing that cannot be bought or acquired with gold, position or power. It is a thing that grows with the history of a nation. For this reason I am sorry to observe the introduction, in the name of progress, of many useless and sometimes harmful elements that are, in essence, contrary to Indian characteristics. A discriminate acceptance of Western or any other culture is good, but blind imitation that leads to futile and sterile mediocrity is greatly to be deplored. The rational revival of our own culture would be purposeful and productive; while we must welcome knowledge and new ideas from whatever source they come, our advancement in all directions must be rooted in the best traditions and ideals of the land. The application of foreign ideas should be in accordance with our needs, circumstances and methods of life. Hence must we, the women of this country, treasure our precious birth-rights of spiritual grace and graciousness, the Eastern qualities of consideration and courtesy, and destroy for ever the meaningless superstitions, prejudices and fears invented by our ignorance and augmented by our idle imaginations!

immortality in his message; at the same time we are touched by his affectionate sincerity and simplicity that will make us remember it for ever with reverence and gratitude: "*I have ever kept in view the measures that promised to secure the happiness and prosperity of my beloved subjects in whose contentment and advancement my interest is paternal and abiding.*" Surely it is in loyalty, devotion and also in utility that we find the appropriate answer to this inspiring sentiment.

Another problem which is seriously challenging the attention of India is that of the economic independence of its women. They must be taught the dignity of work. Every woman ought to be in a position to support herself by means of an honourable livelihood should the occasion arise. It is a matter of pride and not of humiliation to add to the meagre family income by one's own endeavour.

The proposed scheme for an Arts, Crafts and Home Industries Institute for women in Hyderabad is most admirable. It will not only train them in the science of Production, but by marketing their goods it will help to solve, partially at any rate, the vexatious question of Unemployment—particularly amongst the middle classes to whom the yoke of the purdah system denies the opportunities which their financial circumstances demand.

Is it not unfortunate that the majority of Indian women are not brought up with the idea of 'self-dependence' and therefore lack the essential element of life which is self-respect? There is too much 'protection' and dependence upon externals. There is not that inner anchor of poise, stability and assurance which comes from the capacity of self-realization. The individual seeks self-perfection in the perfection of his people, and his spirit finds its own reflection in the immortality of the National Being. Consequently, we may best hope to attain our self-realization as useful and integral members of that Social Whole. India has produced illustrious and distinguished women in all depart-

the Hyderabad State Educational Enquiry Committee. I greatly appreciate this move and hope that their effort will be fruitful.

It is a saying of Hazrat Mohammed, who is the Prophet of God for four hundred million Moslems and a sublime Truth-giver to humanity, that: "*Superiority in Knowledge is better than superiority in Worship.*" It is yet another Hadis that in its farseeing wisdom commands us to "*Seek even as far as China.*" The beautiful and peace-giving philosophy of Hinduism has inspired equally elevated doctrines on the value of wisdom and learning. However, mere book-learning is not sufficient : it is but a fragment of that vast, immeasurable education which ought to banish narrow-mindedness, create sympathy, understanding, and eradicate superstition, prejudice and fear.

It was a sage utterance of a great man that "Mothers make the Nation," because the standard of a nation is judged by their standards ; because the first teacher of a child is his mother ; and unless the mothers themselves are enlightened and have acquired high qualities, character and ideals, they are incapable of bringing up the rising generations. Can we question the sagacity of the Hadis that : "*No present or gift of a parent to a child out of all the presents and gifts is superior to a good, liberal education.*"

The extreme delicacy and importance of the duty of Teachers, also, is not always adequately comprehended. Their errors are not like the mistakes of clerks that can be corrected and remedied. Their satisfaction must be sought in moral recompense and results rather than in the gain of material reward.

The aim of all training is to prepare the young to be useful citizens. So may our youth be trained to serve, with excellence, their Country and their benevolent Ruler whose own lofty ideas and noble words convey to us his boundless concern for them ! There is a quality of greatness and

tributing to the Service of Humanity. To-day, women, in almost every civilized country of the world, are no longer parasites of dependence but citizens of the soil that has bred them—with the right to exist, to take and to give; with the right to add to the honour of their nation and the ethos of their people; with the courage and knowledge to exalt and develop the common cause of progress! These inalienable rights should equally belong to the Womanhood of India

The fetters of ignorance and of the past have bound us to the belief that religion is a retrogressive factor and that modesty can only be retained within the darkened limits of our inactivity. Yet, every religion was born to lead us upon the right path of evolution, to endow us with faith and fortitude and save us from the ignominy of ignorance.

I am proud that in this last respect we, the women of Hyderabad, need not merely boast but can justly lay claim to our share, however small, of cultural enlightenment. Very few states have women's colleges. It is with a sense of gratification that I can mention the Osmania University College for Women which has lately shown such brilliant results, and the Mahbubia which is a model institution. The Women's Association, also, deserves our congratulations for so earnestly seeking to meet the increasing demand for mass education through the medium of its four free schools in poor areas. But, you will all agree with me that these and a few others are not enough to supply all needs. There are thousands within the Districts who are beyond the reach of this life-giving light. It must spread: it must be like sunshine available to all; available alike to rich and poor. Here we see the necessity of making Free Primary Education in our Dominions as *universal* as practical considerations will possibly allow. The present system should be suitably revised and re-örganized, especially in view of the problem of our educated unemployed. A significant step in the direction of reforms has already been taken by

of his glorious reign and invoke the blessings of God on him and his family and pray that he may be spared to rule over them for many more years to come and that they may have the privilege of celebrating his Golden and Diamond Jubilees also?

Long live our Benign Ruler! Long live the Nizam!

Presidential Address

Delivered at the Tenth Session of the Hyderabad State Women's Conference

BY

Her Highness the Princess Durru Shevar of Berar.

LADIES,

It gives me great pleasure to be in your midst today. As Hyderabad is now my home, I identify myself with all your hopes and interests, your ambitions and aspirations, and the welfare of your children. Ever since I came here, I have waited for the time when you would consider me as one of yourselves and believe that I am always ready to co-operate with you in every way that will help to attain your happiness. Therefore, I consider this indeed a felicitous occasion on which I can express my true feelings and let you be the judge of the sincerity of my sentiments.

I have the greatest admiration and the deepest concern for the women of India: admiration for their unlimited patience and infinite courage, concern for the well-being of their present and future life. To-day, women all over the world are awakening to the sense of their responsibility and privilege in shaping the destinies of coming generations. Indian women, who have so much to give because they have inherited the Indian ideals of loyalty, devotion, proud modesty and graciousness, should be in the forefront in con-

servant is a source of pride and distinction to me". It is because of ideals like these that he is able to rule over the hearts of his people.

A true and sincere friend of the poor, His Exalted Highness has always shared their joys and sufferings. Whenever an epidemic breaks out in any part of the Dominions, every help is given to those who need it and the Medical Department leaves no stone unturned to bring it under control. Whenever the crops are bad, the agriculturists are sure to get a substantial remission of their rent. These remissions have become continuous for the last three or four years, culminating in the recent announcement of a further remission of forty lakhs of rupees on the happy occasion of the Silver Jubilee. His eagerness to expedite slum clearance work and the opening of schools for the depressed classes are other instances of his great concern for the poor. His profound sympathy with the people found striking expression when a disastrous fire broke out in the Moti Mahal Cinema last year. He at once visited the scene of the tragedy and appointed a Commission to inquire into the causes of the disaster and to suggest measures for preventing such disasters in the future.

True to the great ideals of Islam, he believes in the equality of all and loves his subjects irrespective of class or creed The latter characteristic, as a matter of fact, has been the distinguishing feature of the Great Asaf Jahi dynasty, for none of the Rulers ever made a distinction between their subjects on communal grounds but treated them all alike. Hence it is that Hyderabad has had glorious traditions of communal peace and harmony for centuries past and is still a model for the rest of India.

When so deep and genuine is the love of the Ruler for his people, and so exalted his conception of his trust, is it a wonder that his fourteen million subjects with one mind and soul are jubilant over the completion of the 25th year

ring this title on him the Osmania University has honoured itself.

His Exalted Highness dislikes ostentation both in private and public affairs. For this reason he disapproved of the programme that was originally drawn up to celebrate the Silver Jubilee and ordered that as little as possible should be spent on the various functions connected with it and that the money thus saved should be utilised for works of public welfare. In reply to the address presented by Prince Wala Shan Nawab Moazzam Jah Bahadur as President of the City Improvement Board, after praising the good work done by the Board, His Exalted Highness was pleased to give a piece of advice, which will ever be written in letters of gold. "The Board" he said, "should see that its time and labours are devoted to the clearance of slums and the better housing of the poor rather than to works that are meant for mere show and display".

Both by precept and example His Exalted Highness tries to guide his people in the right direction, and thus he is not only their benevolent ruler but their trusted leader. He is, in a real sense, the friend, philosopher and guide of all his subjects, including the aristocracy. His zeal for socio-religious reform is well known; he has succeeded in eradicating many evils which had crept into the social life of the people in the guise of religion.

His Exalted Highness has a deep solicitude for public welfare and entertains a lofty conception of his duties as a Ruler. In his reply to the address which was presented to him by His Excellency the Maharaja Sir Kishen Pershad Bahadur on behalf of His Exalted Highness' loyal subjects on the occasion of the Silver Jubilee, His Exalted Highness remarked in a tone of utter sincerity, "I look upon this kingdom as a solemn trust which has been handed down to me from my great ancestors, and I assure you that my life is dedicated to the welfare of my people. To be their

The materialisation of the works of public utility mentioned above has been made possible by the sound finances of the State. The State is fortunate in possessing a financial genius like the Rt. Hon'ble Sir Akbar Hydari, Nawab Sir Hyder Nawaz Jung Bahadur, KT., P.C., L L.D., who has produced a series of surplus budgets even in times of economic depression and has done so without either increasing the burden of taxation or checking the development of the various departments. It is mainly due to his outstanding financial ability that the credit of the State stands so high to-day.

It is incredible to believe that so much progress could be made and such far-reaching changes could be effected within the space of a quarter of a century. Great and unequalled as His Exalted Highness is as a Ruler, even greater is he as a man. The simplicity, purity and austerity of his private life have become proverbial. Though the ruler of a great historic kingdom, the premier Prince of India and perhaps the richest man of the world, he spends much less on his own person than many a man in his exalted position would have done; but where the welfare of his people, or of humanity in general is concerned, his generosity knows no bounds. Not a scheme that had for its object the ultimate good of his people was ever submitted to him that did not meet with his prompt approval. His generosity crosses the insular boundaries of race and nation and no deserving institution either in India or outside India ever applied to him for help in vain. Educational and other useful institution in British India receive a grant of nearly Rs. 2 lakhs every year.

Reference has already been made to His Exalted Highness' abiding interest in education. An eminent poet and profound scholar himself, he has given his gracious patronage to learning, and the intellectual activity which has characterised his reign, has been largely due to his inspiration. He is rightly called Sultan-ul-Uloom. By confer-

to the cultivators in the form of Taqavi and legislation has been passed to make their lands secure for them and to save them from the clutches of money-lenders.

His Exalted Highness has always attached great importance to the development of local industries. The founding of a Trust Fund amounting to a crore of rupees is a sure guarantee of the bright future that awaits them.

One of the most important and far-reaching reforms introduced by His Exalted Highness is the separation of the Judiciary from the Executive.

The activities of the Medical Department have been considerably enlarged: medical relief has been extended to the remotest parts of the State; special departments such as those of plague and malaria have been opened; and now steps are being taken to establish a tubercular sanatorium and a children's clinic.

Electricity is another blessing of His Exalted Highness' benevolent rule. There is electric supply not only in the city of Hyderabad but also in important places like Aurangabad, Raichur, and Warangal, while these as well as Parbhani, Gulburga, Jalna, Nanded, Latur and Nizamabad have been provided with a fresh water supply at a considerable cost.

The Hyderabad State owns 1300 miles of railroad. There is also a State-managed motor transport service, which is co-ordinated with the Railway Service, though it is primarily intended for places untouched by the Railways. In this way, the inhabitants of the remotest parts of the Dominions have been brought into closer touch with the capital and with the new life and ideas that characterise it. The linking of Hyderabad with the Karachi—Bombay—Madras Air Line and the inauguration of Wireless Broadcasting are other notable developments which have taken place in recent years.

The City Improvement Board has spent about two crores of rupees in improving the City of Hyderabad in every possible way in recent years. Consequently, there are few cities in India to-day that can stand comparison with Hyderabad. The roads have been widened and made dust proof; parks have been laid out and provided with greater amenities than hitherto; and a central market has been established. But of greater importance than all these perhaps has been the attention given to the needs of the poorer classes. Slum clearance work has been undertaken in no less than fourteen different localities at a cost of about fifty lakhs of rupees and about 2,500 houses have been constructed for housing ten thousand citizens. Children's parks and infant welfare centres have brought a measure of happiness to the poor which was formerly denied to them. The beautiful and imposing buildings that adorn the city of Hyderabad to-day, the High Court, the Osmania Hospital, the Unani Dawakhana, the State Library and the Jubilee Palace, are striking examples of His Exalted Highness' exquisite taste in architecture. The Osmania University buildings at Adikmet, when completed, will be another great monument of His Exalted Highness' glorious reign.

Another feature of the material progress made by the State during the last quarter of a century is the materialisation of irrigation projects on a gigantic scale. The Nizam Sagar alone has brought more than three lakhs of acres of land under cultivation and has made famine and scarcity of water in these areas a thing of the past. When the Tungabhadra project, which is under contemplation, is completed, the risks of famine in the Raichur district also will be obviated.

The opening of the various experimental farms and the employment of experts show the interest of His Exalted Highness in agriculture, which is the main occupation of the people of this State. Considerable help has also been given

Government or Local Fund Primary Schools. A number of schools have also been opened for the children of the so-called depressed classes and further facilities are also being provided for their education. A scheme of technical education will soon be enforced and the day is not far off when primary education, which is now free, will also become compulsory.

The education of women has likewise received a great impetus during His Exalted Highness' reign. At present there is one first grade College and four High Schools for girls (besides two Convent Schools) in the City of Hyderabad alone, while two more High Schools have been recently opened, one at Aurangabad and one at Warangal. Several Middle Schools and a large number of Primary Schools are scattered all over the Dominions and in addition to these, there are a number of aided schools which are also doing excellent work.

The creation of a University with an Indian language as the medium of instruction would have been impossible but for the generosity and foresight of His Exalted Highness in matters educational. This bold experiment has more than justified itself, and there are definite signs that the example set by Hyderabad will be followed in other parts of India also at no distant future.

The progress of other departments has been equally remarkable. The budget of the Public Works and Irrigation Departments in 1320 Fasli was only fifty lakhs of rupees; in 1344 Fasli it rose to one crore and forty-three lakhs. Formerly, the lack of good roads was a great obstacle in the way of the economic development of the State. But now thanks to the construction of three thousand and twenty-five miles of good *morum* roads and two hundred and forty-eight bridges and the rapid improvement in the means of communication, even the most remote places have brought within easy reach of the capital.

Our Benign Ruler

BY

K. M. Yusufuddin, M. A. (Leeds),

Lecturer, Osmania Training College.

The accession of His Exalted Highness Nawab Sir Mir Osman Ali Khan Bahadur to the throne marks the beginning of a Renaissance in the history of Hyderabad. Since then, His Exalted Highness and his officers have spared no pains to evolve a new order of things and develop Hyderabad into a modern State. As soon as His Exalted Highness ascended the *musnad*, he took every care to make himself thoroughly acquainted with the details of administration. He then created an Executive Council with Sir Ali Imam, a veteran statesman of British India and once the Law Member of His Excellency the Viceroy's Executive Council, as its President. As a result of His Exalted Highness' watchful and fostering care, Hyderabad has made steady progress in every branch of activity with which the State is concerned.

It is difficult to make particular mention of any one department when all departments are vying with one another in efficiency and good work. The Education Department, in which we teachers are especially interested, has made phenomenal progress and education has been brought within the reach of the masses. The educational budget 25 years ago was only 14 lakhs, but now it is more than a crore of rupees, while the number scholars has increased from 66,484 to 3,53,582. There were only two Colleges in Hyderabad in 1911, but now there are 10 Colleges (including the Professional Colleges). At present there is no district without a High School nor a Taluq without a Middle School, while the vast majority of villages are provided with either

Our Benign Ruler

BY

K. M. Yusufuddin, M. A. (Leeds),
Lecturer, Osmania Training College.

The accession of His Exalted Highness Nawab Sir Mir Osman Ali Khan Bahadur to the throne marks the beginning of a Renaissance in the history of Hyderabad. Since then, His Exalted Highness and his officers have spared no pains to evolve a new order of things and develop Hyderabad into a modern State. As soon as His Exalted Highness ascended the *musnad*, he took every care to make himself thoroughly acquainted with the details of administration. He then created an Executive Council with Sir Ali Imam, a veteran statesman of British India and once the Law Member of His Excellency the Viceroy's Executive Council, as its President. As a result of His Exalted Highness' watchful and fostering care, Hyderabad has made steady progress in every branch of activity with which the State is concerned.

It is difficult to make particular mention of any one department when all departments are vying with one another in efficiency and good work. The Education Department, in which we teachers are especially interested, has made phenomenal progress and education has been brought within the reach of the masses. The educational budget 25 years ago was only 14 lakhs, but now it is more than a crore of rupees, while the number scholars has increased from 66,484 to 3,53,582. There were only two Colleges in Hyderabad in 1911, but now there are 10 Colleges (including the Professional Colleges). At present there is no district without a High School nor a Taluq without a Middle School, while the vast majority of villages are provided with either

Maker of Modern Hyderabad

Lieut.-General His Exalted Highness, Rustum-i-Dowran, Arastu-i-Zaman, Sipah Salar, Asaf Jah, Muzaffar-ul-Mulk-wal-Mamalik, Nizam-ul-Mulk, Nizam-ud-Dowlah, Nawab Sir Mir Osman Ali Khan Bahadur, Fateh Jung, Sultan-ul-Uloom, G.C.S.I., G.B.E., Faithful Ally of the British Government, *Nizam of Hyderabad and Berar.*

The Hyderabad Teacher

CONTENTS.

Space.	Whole year		Six months		Per Issue	
	B. G.		B. G.		B. G.	
	Rs.	As.	Rs.	As.	Rs.	As.
Full page ...	12	0	6	0	4	0
Half page ...	6	0	3	8	2	0
Quarter page.	3	0	1	12	1	0
Per line ...	0	10	0	8	0	6

For the Nizam's Dominions O. S. Rs, 3 annually, (including postage).
For British India B, G. Rs. 3 a year (including postage).
Single copy O. S. As. 12 for H. E. H. the Nizam's Dominions.
Single copy B. G. As. 12 for British India.

The Urdu & English sections are published separately also, the annual subscription being Re. 1 As. 14 & Rs. 2, respectively.

The Hyderabad Teacher

CONTENTS.

ERRATA.

Page	line	from		for			
Page 1	line 6	from	bottom	for	"number scholars"	read	"number of scholars".
,, 2	,, 2	,,	,,	,,	"have brought"	read	"have been brought".
,, 14	,, 9	,,	,,	,,	"district"	read	"division".
,, 15	,, 19	,,	top	,,	"of the Secondary"	read	"of Secondary".
,, 36	,, 3	,,	,,	,,	"As regards of the"	read	"As regards the".
,, 38	,, 2	,,	,,	,,	"feature"	read	"future".
,, 53	,, 13	,,	,,	,,	"sessions"	read	"session".

The Hyderabad Teacher.

ADVERTISEMENT RATES.

Space.	Whole year B. G. Rs.	As.	Six months B. G. Rs.	As.	Per Issue B. G. Rs.	As.
Full page ...	12	0	6	0	4	0
Half page ...	6	0	3	8	2	0
Quarter page.	3	0	1	12	1	0
Per line ...	0	10	0	8	0	6

SUBSCRIPTION RATES.

For the Nizam's Dominions O. S. Rs, 3 annually, (including postage).
For British India B, G. Rs. 3 a year (including postage).
Single copy O. S. As. 12 for H. E. H. the Nizam's Dominions.
Single copy B. G. As. 12 for British India.

The Urdu & English sections are published separately also, the annual subscription being Re. 1 As. 14 & Rs. 2, respectively.

VOL. XI No.

THE

HYDERABAD TEACHER

JANUARY–MARCH, 1937.

Quarterly Magazine of the Teachers' Association
Hyderabad-Deccan.
Under the Patronage of
Fazl Muhammad Khan Esq., M. A.
Director of Public Instruction.

Silver Jubilee Number

Editorial Staff

SECUNDERABAD-DECCAN
PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD.
1937.

Annual Subscription Rs. 3.

حیدرآباد ٹیچر

بابتہ تیر ۱۳۴۶ف

جلد (۱۱) شمارہ (۴)

فہرست مضامین

قطعہ تاریخ

نتیجہ فکر جناب مولوی کریم الدین خاں صاحب علم

تو نے دیکھا ہے ایسا جشن کبھی — آنکھ مجھ سے ملا کے انجم کہہ

پوچھے تاریخ گر کوئی اے علم — جشن سیمین شاہ ہفتم کہہ

۵۴ ۱۳ ہجری

قطعہ مدحیہ

ہزار شکر کہ موسم بہار کا آیا — وہ بوندیں پڑنے لگیں وہ چمن پہ چھائی گھٹا

روش روش پہ شگوفے کھلا رہی ہی نسیم — چمن چمن میں بہاریں دکھا رہی ہی صبا

جگہ جگہ پہ مسرت قدم قدم پہ خوشی — بہار عالم گلشن کا رنگ کچھ ہے نیا

یہ کس کا بادۂ اقبال کیف پرور ہے — کہ جھوم جھوم کے چلتی ہے آج باد صبا

وہ کون ہے شہ عثمان نظام آصفجاہ — کہ جس کی جوبلی نقرئی کا ہے جلسا

جو بات اسکی ہے معمور ہے وہ حکمت سے — نہیں ہے فیض سے خالی جو کام ہی اس کا

قلم میں اس کے یہ تاثیر دی ہی خالق نے — لکھا جو اس نے نوشتہ ہوا وہ قسمت کا

نہ اسکا بذل میں ہمسر نہ عدل میں ثانی — ہر ایک بات میں خود ہی جواب ہے اپنا

رہیں زمانے میں جبتک یہ آسمان و زمین

الٰہی نیر دولت ضیا فگن ہو سدا

جناب مولوی عبد السلام صاحب ذکی

شاہ دکن عثمان علی خان اپنا ہے سرتاج
فیض سے جس کے ملک دکن نے پائی ہے معراج

ملک دکن میں سب کے دلوں پر کرتا ہے جو راج
جشن سیمین کی جس شہ کے دھوم مچی ہے آج

ربع صدی میں ایک صدی کا جس نے کیا ہے کام
مثل ابر رحمت جس کا فیض ہے سب پر عام

بادۂ حب شہ کا ہے دیتا غنچہ غنچہ جام
لیتا ہے بچہ بچہ جس کا صبح سویرے نام

اعلحضرت شاہ دکن کی اعلیٰ ہے ہر بات
روز روشن سے بھی زیادہ جس کی ہیں آیات

ربع صدی سے اہل دکن کی لاج ہے جسکے ہات
دل سے دعائیں دیتی ہے جس کو خلق خدا دن رات

ملک میں ہر سو جاری و ساری جس کا ہے فیضان
صرف دکن کیا بلکہ جہاں پر جس کا ہے احسان

وقف ہے ایسے شاہ کی خاطر وقف ہے اپنی جان
آؤ کریں اس شاہ پر اپنا تن من دھن قربان

تیری بدولت شاہ دکن ہے ملک دکن آباد
شیخ و برہمن ہر اک اپنے مسلک میں آزاد

سب کے سب ہیں خرم و شاداں کوئی نہیں ناشاد
یاد ہیں ہر اک پیر و جواں کو تیرے احساں یاد

تیرا ثانی کوئی نہیں ہے شاہ بلند اقبال
قیصر و کسریٰ سے بھی بڑھ کر تیرا ہے اجلال

لاکھ برس کی عمر تری ہو شاہ ہمایوں فال
لاکھ دنوں کا ماہ ہو تیرا سو ماہوں کا سال

جناب مولوی عبد الجبار صاحب جبار مدرسہ وسطانیہ شاہ علی بنڈہ

صاحب جاہ و حشم قدر فزا قدر شناس
پاک دل پاک نفس بادشہ ملک دکن

یعنی عثمان علی خاں کہ ہے جشن سیمین
جس کے سایہ میں ہوا ملک تمامی مامن

کلک قدرت نے بنائے کئی نقش آصف
ہفتمیں نقش ترا آکے بنا مستحسن

جود کا تیرے یہ عالم ہے کہ ساری خلقت
لیتی ہے لعل و گہر اپنا بچھا کر دامن

انتہا کو نہ کبھی تیرے فضائل پہنچیں
سو زباں سے جو کریں وصف ترا اہل زمن

نہ قلم میں ہے سکت اور نہ زباں میں طاقت
ختم کرتا ہے دعا پر ترا احباب سخن

عمر کے تیرے ہوں اعوام بہ رنگ صد برگ
اور ہر اک برگ سے پیدا ہوں ہزاروں گلشن

جناب مولوی سید تراب علی صاحب ضوی سہمدرس فوقانیہ دار الشفا

ہے جانب برج حمل ساماں کشاں مہر مبین
دنیا پہ ہوتے ہیں عیاں آثار ماہ فرودین

نرگس کی دیدہ بازیاں بلبل کی نغمہ سازیاں
سنبل کی وہ بیتابیاں پھیلا کے زلف عنبریں

گل کا ہوا سے جھومنا شاخوں کو ہر دم چومنا
غنچوں کا ہنس کر پھولنا مانند معشوق حسین

گانا وہ موسیقار کا کوئل کا ہر دم کوکنا
بلبل کا وہ چہکارنا صحن گلستاں کے قریں

عثمان علی شاہ دکن ہے امن میں جس سے زمن
ہے یہ دکن جس سے چمن سلطان تاج گوہریں

شاہ فریدوں حشمت و جمشید کیواں منزلت
جس کے قدوم میمنت ہیں باعث فخر زمیں

وہ گوہر بحر سخا وہ معدن در عطا
وہ صاحب مہر و وفا حاتم بھی جس کا خوشہ چیں

جس نے بنائے مدرسے جس نے بسائے مدرسے
جس نے سنوارے مدرسے بہر ہنود و مسلمیں

کر اے تراب اب یہ دعا از بہر سلطان ہدیٰ
از بہر شاہ لافتی اور اہل بیت طاہریں

جبتک اڑیں سوئے سما عنقا و شاہیں و ہما
ہوں باعث رونق فزا ریحاں سمن اور یاسمیں

دشمن ہوں سب زیر و زبر شاخ تمنا لائے بر
ہوں مشکلیں سب اس کی سر از خالق چرخ بریں

۵

دورِ عثمانی میں سائنس کی درس و تدریس

از

سید عبدالحکیم - ایم - ایس - سی - ایل - ٹی

یوں تو آصف جاہ اول سے لے کر اب تک تمام فرمانروایان دولت آصفیہ کا نصب العین یہی رہا ہے کہ وہ ملک کو زیادہ سے زیادہ خوش حال بنا دیں لیکن ہر لحاظ سے جو عروج دکن کو اعلیحضرت واقدس کے ۲۵ سالہ عہد میمنت میں حاصل ہوا۔ اس کی نظیر ماضی کے کسی دور میں نہیں ملتی۔ اس عہد کو عہد تنویر کہنا نہایت مناسب ہے لیکن اس عہد تنویر کا نور وہ نور نہیں ہے۔ جو کسی شہاب ثاقب سے نمودار ہو کر چند ساعت کے واسطے شب کی تاریکی پر غالب آجائے۔ یہ وہ نور ہے جو آج سے ۲۵ سال پیشتر مملکت ہذا پر چمکا اور جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ اس کی روشنی سرعت سے تیز ہوتی گئی۔ اس نور نے ہمارے دلوں اور دماغوں سے جہالت کی تاریکی نکال کر ان کو علم کی روشنی سے منور کر دیا ہے۔ اور خدا کرے یوں ہی منور کرتا رہے۔ اس عہد تنویر کی ہر جہتی ترقیوں اور اصلاحات کا ذکر تو کجا اگر صرف تعلیمی ترقیات کا ذکر کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے لہذا اس مختصر سے مضمون میں علوم و فنون کے صرف شعبہ سائنس کی علمی ترقیاں جو درس و تدریس سے متعلق ہیں بیان کی جائیں گی۔

موجودہ دنیا سائنس کی دنیا ہے۔ آج ہماری اکثر ضروریات زندگی اور آسائشوں کا دارومدار سائنس پر ہے، ہماری صنعت و حرفت و زراعت و تجارت، حفظ صحت، نقل و حمل، جنگ و جدل آرائش و زیبائش غرض کہ ہر شعبہ زندگی میں بالواسطہ یا بلاواسطہ سائنس کا دخل ہے۔ ان حالات کے تحت جبکہ دنیا کے معاشرتی نظام کی بنیادیں ایک بڑی حد تک سائنس پر قائم کی گئیں ہوں سائنس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اسی اہمیت کے پیش نظر دور عثمانی میں سائنس کی درس و تدریس کی طرف جو غیر معمولی توجہ عمل میں آئی ہے وہ نہایت قابلِ تعریف ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ موجودہ زمانہ کی سائنس کی تعلیمی ترقیوں کا ذکر

کیا جائے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عہد ماضی کی سائنس کی تعلیم کا سرسری طور پر مختصر حال بیان کر دیا جائے تاکہ موجودہ اور گذشتہ حالات کا تقابلی پہلو ناظرین کے پیش نظر رہے اور اس امر کا صحیح اندازہ کیا جا سکے کہ ہماری ترقی کی ابتدا کہاں سے ہوئی اور اب ہم کس منزل پر ہیں۔

عہد ماضی | ممالک محروسہ میں نظری حد تک سائنس کی درس و تدریس کا آغاز مدارس کی وسطانیہ اور فوقانیہ جماعتوں میں آج سے تقریباً ۳۰ برس پیشتر ہوا۔ ۱۹۰۸ء کی تعلیمی نصاب میں سائنس بحیثیت مضمون اختیاری کے داخل تھی۔ لیکن حقیقت میں اُس وقت اس مضمون کا شمار برائے نام نصاب ہی کی حد تک تھا۔ سائنس کی تعلیم کے واسطے نہ تو مدارس میں کوئی سامان تھا اور نہ اس مضمون کے اساتذہ تھے۔ چنانچہ ۱۹۰۸ء کے امتحان مڈل میں صرف ایک طالب علم سائنس لے کر شریک ہوا۔ اور وہ بھی اس مضمون میں فیل ہوا بعد ازاں ۲۲ف سنہ تک سائنس لے کر مڈل کے امتحانات میں کسی طالب علم کی شرکت کا پتہ نہیں چلتا۔ اس سنہ میں امتحان مولوی کے لئے سائنس میں صرف طبعیات لازمی قرار دی گئی۔ اسکی صورت یہ تھی کہ ریاضی کے ایک پرچہ میں نصف سوالات الجبرا کے اور نصف طبعیات کے مرتب کئے گئے۔ چنانچہ پہلے سال منجملہ تیرہ لڑکوں کے جو امتحان مولوی میں شریک ہوئے صرف چار کامیاب ہوئے۔ ۲۴ف سنہ کے امتحان عالم میں بھی ابتدائی سائنس داخل ہو گئی۔ دھات، ادھات، ترشہ، مرکبات، حرارت، نور، برق، غرضکہ موجودہ نصاب فوقانیہ میں تقریباً جس قدر سائنس ہے۔ وہ سب اس وقت ہی داخل نصاب تھی۔ لیکن یہ تمام تعلیم نظری حد سے زیادہ نہ تھی۔ ہم اس وقت کے اساتذہ کی ان مشکلات کا اندازہ نہیں کر سکتے جس کا سامنا ان کو اس مضمون کی تعلیم میں پڑا ہوگا۔ اول تو ان کی اس مضمون سے ناواقفیت دوم عملی تجربات کے واسطے ضروری سامان کی غیر موجودگی۔ نتیجہ اُستاد اور شاگرد دونوں کی تضیع اوقات کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس بے سرو سامانی اور تضیع اوقات کو دیکھکر ایک انگریز مسٹر میہوہ نے جو یہاں پر بحیثیت مشیر تعلیمی عارضی طور پر کام انجام دے رہا تھا۔ یہ مشورہ دیا کہ یہ بہتر ہوتا کہ بہت سے بے سرو سامان فوقانیہ مدارس کو وسطانیہ میں تبدیل

کر کے جو کفایت اخراجات میں ہوتی اس سے موزوں اساتذہ کے تقررات اور ضروری تعلیمی سامان سے ان مدارس کی حالت بہتر کر دیجائے۔ بہت سی ناقص اعلیٰ درسگاہوں سے چند اچھی ادنیٰ درسگاہیں زیادہ مفید ہیں۔ چونکہ زمانہ ماضی سے متعلق اس مضمون کا بہت کچھ مواد مسٹر میہو کی رپورٹ سے حاصل کیا گیا ہے لہذا اس موقع پر مسٹر میہو اور اس کی رپورٹ کے متعلق کچھ مزید ذکر بے محل نہ ہوگا۔

مسٹر میہو کی رپورٹ مسٹر میہو کی خدمات نواب میر محبوب علیخاں غفران مکان رح کے عہد حکومت میں ۲ سال کے واسطے اس غرض سے مستعار لی گئی تھیں۔ کہ آپ یہاں کی تعلیمی حالات کا مطالعہ کریں اور ضروری اصلاحات کے متعلق اپنی تجاویز پیش کریں۔ جنوری ۱۹۱۰ء سے نومبر ۱۹۱۲ء تک تقریباً ۳ سال مسٹر میہو نے بڑی مستعدی سے کام کیا اور اس عرصہ میں یہاں کے تعلیمی حالات اور اُن میں ضروری اصلاحات پر ایک جامع رپورٹ لکھی۔ رپورٹ کے ابتدائی حصہ میں اعلیٰحضرت مرحوم کا ایک فرمان شائع کیا ہے۔ یہ فرمان فقرات ذیل پر مشتمل ہے۔ (ترجمہ از رپورٹ مسٹر میہو)

میرے لئے کوئی خوشی اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی کہ میں دیکھوں کہ۔

(۱) میری عزیز رعایا امن وچین سے ایک خوشحال زندگی بسر کر رہی ہے۔

(۲) وہ اضافہ دولت کے کاموں میں منہمک ہے۔

(۳) وہ علوم وفنون اور مختلف سائنسوں کے حصول میں ہمہ تن مصروف ہے۔

(۴) اس کی کوششوں سے ملک ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے اور رعایا کے علوم وفنون سے کماحقہٗ مستفید ہو رہا ہے۔

فرمان مبارک کا ایک ایک لفظ بتا رہا ہے کہ مغفرت مآب کو اپنی رعایا سے کس قدر محبت تھی۔ اور آپ ریاست کی ترقی اور اس میں سائنس اور دیگر علوم وفنون کی ترویج کے کس قدر دلدادہ تھے۔

لیکن مغفرت مآب کی اس دلی خواہش کے باوجود ملک کی تعلیمی حالت خصوصاً سائنس کی درس وتدریس کچھ اچھی حالت میں نہ تھی۔ اس کی ایک بڑی وجہ جیسا کہ مسٹر میہو نے

اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ ملک میں طریقۂ تعلیم کے جدید اصولوں سے واقف کار ہستیاں
تقریباً مفقود تھیں چنانچہ وہ لکھتا ہے۔ "موجودہ نقائص کا ذمہ دار ایک بڑی حد تک محکمۂ
تعلیمات کا ناقص نظم و نسق ہے یہاں پر کوئی ایسا عملہ کارگزار نہیں ہے۔ جو مدارس
کی حقیقی ضروریات کو گورنمنٹ کے سامنے پیش کر سکے۔ یا سرکار سے منظور شدہ رقم کو مدارس
کی واقعی ضروریات پر صحیح صرف کر سکے۔ چنانچہ معائنہ کے دوراں میں ایک بھی ایسا صدر
مدرس یا مہتمم نظر نہ آیا جو واضح طور پر مختلف مدارج کے مدرسوں کی ضروریات سے کامل
واقفیت رکھتا ہو"۔ اسی سلسلہ میں وہ کچھ آگے چلکر لکھتا ہے کہ ایک ہائی اسکول کے معائنہ
کے دوراں میں اتفاق سے اس کی نظر ایک پارسل پر پڑی۔ پارسل کی بندش سے یہ معلوم
ہوتا تھا کہ وہ ابھی حال میں اسٹیشن سے آیا ہے لیکن دریافت سے معلوم ہوا کہ تقریباً ایک
سال ہوا۔ جب یہ پارسل ۱۳۱۹ف کی منظور شدہ رقم سے منگایا گیا تھا۔ اور اس میں سائنس کے
آلات تھے۔ اس پارسل کی اس عرصہ تک کھولے نہ جانے کی وجہ یہ بتائی گئی کہ کوئی ایسی فہرست
مدرسہ میں موجود نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ پارسل کے اندر جو آلات ہیں اُن کے نام
کیا ہیں۔ اس واقعہ سے سائنس کی درس و تدریس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ
جب ایک ہائی اسکول کے عملہ میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو پارسل میں آئے ہوئے چند
سائنس کے آلات کے نام اور اُن کی شکل سے واقف ہو تو ان سے ان آلات کے استعمال
کی کیا اُمید کی جا سکتی تھی۔ ایسی صورت میں تو پارسل کا نہ کھولنا ہی بہتر تھا۔ کیونکہ اس طرح
پر آلات کم از کم اپنی جگہ پر محفوظ تو تھے۔ رپورٹ میں تنقیدی پہلو کے ساتھ ساتھ اصلاحی پہلو
بھی تھے۔ چنانچہ ذیل کی فہرست سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت کے مدارس میں سائنس
کی تعلیم کے لئے جو سامان تھا اس کی کیا حالت تھی اور فوری اشد ضروریات کیا تھیں۔

نام مدارس	رقم	کیفیت
گلبرگہ اور ورنگل ہائی اسکول۔	۶۰۰ روپیے	بالکل نامکمل طور پر آراستہ
اورنگ آباد اور چادرگھاٹ	۶۰۰ روپیہ	موجودہ سائنس کے سامان کو ترتیب دینا
علوم مشرقیہ کے ۳ فوقانیہ مدارس	۱۲۰۰ روپیہ	بالکل بے سروسامان

۳۰ مڈل اسکول — ۳٬۷۰۰ روپیہ — بالکل بے سروسامان

ٹریننگ اسکول طلبہ ذکور — ۱۰۰۰ روپیہ

ٹریننگ اسکول برائے طلبہ ذکور — ۴۰۰ روپیہ

۴ لڑکیوں کے مرکزی اسکول اور ٹریننگ کی جماعتیں۔ — ۲۰۰۰ روپیہ

جملہ ۹٬۵۰۰ روپیہ

عہد حاضر اس ۲۵ سالہ دور میں سائنس کی تعلیم پر جو غیر معمولی توجہ دی گئی ہے۔ اس کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ اعلیحضرت واقدس کی تخت نشینی سے قبل اس مضمون کی تعلیم پر صرف چند ہزار روپیوں کا سالانہ صرف تھا لیکن آج ایک لاکھ ۸۵ ہزار روپیوں سے زاید سرکاری مدارس کی میٹرک جماعت تک ان اساتذہ کی تنخواہ پر صرف ہوتے ہیں جن کا تعلق صرف سائنس کی تعلیم سے ہے۔ اور اگر اس میں یونیورسٹی کے سائنس سے متعلقہ اسٹاف کی تنخواہ بھی شامل کر لی جائے تو یہ مصارف بڑھ کر ۵ لاکھ روپیہ سے زاید ہو جاتے ہیں سرکاری درس گاہوں کی حد تک ۱۳۲۰ف میں جو راست اخراجات عام تعلیم پر ہوئے تھے وہ ۵ لاکھ ۲۵ ہزار، سو چھتر روپیے تھے۔ اس طرح پر آج جو مصارف صرف راست سائنس کی

سائنس کے موجودہ اخراجات تعلیم پر عاید ہوتے ہیں وہ تقریباً سنہ ۱۳۲۰ف کے تمام مضامین کی درس و تدریس پر عاید ہونے والے اخراجات کے مساوی ہیں۔ ان اخراجات میں دارالتجارب کے اخراجات شامل کر لینے کے بعد یہ رقم کم و بیش اس جملہ رقم کے مساوی ہو جاتی ہے جو سنہ ۱۳۲۰ف کے سرکاری درس گاہوں پر راست و بلا راست خرچ کی گئی تھی ان وسیع اخراجات کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ہماری درس گاہیں کامل الفن اساتذہ اور پروفیسروں سے بھر گئیں۔ ۱۳۱۹ف میں سائنس کی اعلیٰ اسناد رکھنے والی صرف دو ہستیاں نظام کالج میں تھیں۔ ان میں ایک۔ ڈی۔ ایس۔ سی۔ بحیثیت لکچرار اور ایک بی۔ ایس۔ سی۔ بحیثیت ڈیمانسٹریٹر تھا۔ آج ڈی۔ ایس۔ سی۔ اور یورپ کے مختلف ممالک کی سائنس سے متعلقہ اعلیٰ ڈگریاں رکھنے والی ہستیاں ایک درجن سے زاید ہیں اور ہندوستان کے مختلف جامعات سے

کامیاب شدہ ایم۔ ایس۔ سی۔ اور بی۔ ایس۔ سی کی تعداد ایک صد سے تجاوز کر جاتی ہے
اس اعلیٰ پیمانہ پر سائنس کی درس و تدریس کا یہ نتیجہ ہوا کہ جس قدر ہماری ریاست اس مضمون
کی تعلیمی حیثیت سے ۲۵ برس قبل برطانوی ہند کے دوسرے صوبہ جات سے پیچھے تھی اُسی
قدر آج نمایاں نظر آتی ہے۔

سائنس اور اساتذہ کی تربیت۔ اس زمانہ کو سائنس کی وسعت تعلیم کے علاوہ یہ بھی امتیاز حاصل ہے
کہ اس میں صرف تعلیم ہی نے ترقی نہیں کی بلکہ اس تعلیم کا جو صحیح منشاء
و مفہوم ہے اس پر بھی کامل توجہ منعطف کی گئی۔ ابتداءً میں جیسا کہ مسٹر میہو کی رپورٹ سے
پتا چلتا ہے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ہر وہ شخص جو کچھ پڑھا لکھا تھا۔ عربی و فارسی کی طرح سائنس
کی تعلیم دے سکتا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بچوں کو سائنس کی تعلیم دینے کے لئے اُصول
تعلیم سے واقف ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ نفس مضمون سے کسی جامعہ کا ایک نو وارد۔
ایم۔ ایس۔ سی یا بی۔ ایس۔ سی۔ جب تک کہ وہ قدرت کی طرف سے۔ فطرتاً غیر معمولی
معلم بن کر نہ پیدا ہوا ہو۔ بچوں کو صحیح اُصول پر سائنس کے ایسے مضامین کی تعلیم نہیں دے سکتا۔
اس خصوصی دور میں ہم معمولی کاموں کے لئے بھی اسپشلسٹ یا ماہر فن کی تلاش کرتے ہیں ڈاکٹری
انجینیری و زراعت غرض ہر پیشہ میں ہر فنی شخص کی طرف رجوع ہوتے ہیں تو پھر بچوں کی تعلیم و
تربیت اُصول فن سے ناواقف شخص کے سپرد کر دینا کہاں تک مناسب ہے۔ جب کہ
ہم جانوروں اور انسانوں کی جسمانی صحت کی نگہداشت، اینٹ اور چونے کی عمارتوں کی تعمیر
اور تحفظ۔ پودوں اور پھولوں کی نشو و نما کا انتظام ناواقف غیر تربیت یافتہ اشخاص کے سپرد
کرنا پسند نہیں کرتے تو یہ کیسے جائز رکھا جا سکتا ہے کہ بچوں کے دماغی اور جسمانی نشو و نما، اُن کی
سیرت و کردار کی تشکیل اور تعمیر ہر کس و ناکس کے سپرد کر دیجائے۔ ان حالات کے پیش نظر
مبارک دور عثمانی میں سائنس کی وسعتِ تعلیم کے ساتھ ساتھ اس امر پر بھی کامل توجہ منعطف
کی گئی کہ اس مضمون کی تعلیم جلد سے جلد ٹرینڈ اساتذہ کے ہاتھوں میں آجائے۔ اس منشاء
کی تکمیل کے لئے ہر سال سرکار اپنے مصارف سے اساتذہ کی ایک مقرر تعداد اصول فن تعلیم
کی تربیت کے واسطے بھیجتی ہے سنہ ۳۸ف سے قبل ایل۔ ٹی یا بی ٹی کی تعلیم کے واسطے

علیگڈھ یا دوسری جامعات کو جانا پڑتا تھا۔ لیکن ۳۲ف سے۔ سی۔ ٹی کی تعلیم کے علاوہ بی۔ ٹی کی تعلیم کا انتظام بھی حیدرآباد میں ہوگیا۔ اور اس درس گاہ کو جامعہ عثمانیہ سے ملحق کر دیا گیا۔ ہر سال بی۔ ٹی کی تربیت کے واسطے دس طلبہ کا انتخاب عمل میں آتا ہے۔ ان میں ایک یا دو سائنس کے گریجویٹ بھی ہوتے ہیں۔ اس طرح پر خیال یہ تھا کہ کچھ عرصہ کے بعد تمام اساتذہ ٹرینڈ ہو جائیں گے۔ مگر سال حال اس ٹرینگ کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے حسب منشا عالیجناب مہدی یار جنگ بہادر موجودہ صدر المہام تعلیمات ایک گشتی کے ذریعہ اس امر کا اعلان کر دیا گیا کہ آئندہ سے کسی ان ٹرینڈ گریجویٹ کا راست تقرر تعلیمات میں نہ ہوگا اور جو موجودہ اُمیدوار کام کر رہے ہیں ان کو جلد سے جلد ٹرینڈ ہو جانا چاہیئے۔ ورنہ بصورت دیگر ٹرینڈ اساتذہ کو ان پر ترجیح دیکر ان کی جائداد پر تقرر عمل میں آئے گا۔ اس پالیسی کے تحت جو کام آہستہ آہستہ تکمیل پا رہا تھا وہ سرعت سے انجام پا جائیگا سائنس کی درس و تدریس کے واسطے یہ پالیسی صرف مفید ہی نہیں بلکہ نہایت ضروری تھی۔ کیونکہ سائنس اپنی نوعیت کا ایک ایسا مضمون ہے کہ اگر اس کی تعلیم صحیح اصولوں پر نہ ہوئی تو بجائے فائدہ کے نقصان ہوتا ہے۔ سائنس گریجویٹس جو اصول تعلیم سے ناواقف ہوتے ہیں۔ سائنس کی تعلیم میں عموماً لکچر کا طریقہ اختیار کرتے ہیں اور لکچر کے دوراں میں سائنس کے معلومات مثل تاریخی واقعات کے بیان کر دیتے ہیں۔ ایسے معلومات جو بچے تک اس کی بلاکسی کوشش کے استاد کے ذریعہ پہونچتے ہیں۔ اس کے دماغ کی نشو و نما کو بالکل روک دیتے ہیں اور اس طرح سائنس کی تعلیم کا حقیقی مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

دارالتجارب سائنس ایک ایسا علم ہے جو انسانوں کی متحدہ عملی جد و جہد اور دماغی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ قدرت کے سربستہ قوانین کی جستجو میں انسان نے صدیوں تجربات کئے۔ تجربات سے مشاہدات اور مشاہدات سے عمیق غور و خوض کے بعد نتائج اخذ کئے کبھی ان نتائج کے اخذ کرنے میں وہ ایسا بھٹکا کہ مدتوں صحیح راستہ پر نہ آیا۔ سائنس کی اس امتیازی خصوصیت کے پیش نظر اگر غور سے دیکھا جائے تو اس مضمون کی حقیقی تعلیم وہی ہے

جس میں طلباء کو استاد کی رہبری میں اُنہیں حالات اور شرائط کی تحت کام کرنا پڑے جس سے محققین سائنس کو سابقہ پڑا تھا۔ فرق صرف اتنا ہو کہ اس موقعہ پر اُستاد کی جائز اعانت ان کے شامل حال رہے تاکہ وہ قدیم محققین کی طرح جن کا کوئی پیشرو نہ تھا غلط راستوں پر پڑ کر تضیع اوقات نہ کریں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی تعلیم کے لئے مدارس میں ایسے دار التجارب کی شدید ضرورت ہے جو با قاعدہ سائنس کے ساز و سامان سے آراستہ ہوں۔ قبل ازیں اس امر پر روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ آج سے ۲۵ برس قبل ہماری درسگاہوں میں سائنس کے سامان کی بے سروسامانی کا کیا عالم تھا۔ لیکن آج وہی درس گاہیں سائنس کے سامان سے پوری طور پر آراستہ ہیں اور یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ آج ہمارے دار التجربات برطانوی ہند کی درس گاہوں کے دار التجارب سے زیادہ بہتر آلات اور سامان سے آراستہ ہیں۔ برق مقناطیس۔ نور۔ حرارت، میکینکس کے تمام ضروری آلات سے ہمارے دار التجارب مزّین ہیں۔ کیمیا سے متعلق سامان کی بھی ہمارے تجربہ خانوں میں کمی نہیں سررشتہ ہذا کی جو غیر معمولی توجہ اس زمانہ میں سائنس کی عملی تعلیم کی جانب رہی ہے اس کا اندازہ ذیل کے ۱۵ سالہ اخراجات سے کیا جاسکتا ہے جو آلات سائنس کی خریداری میں عاید ہوئے ۱۳۲۸ف سے ۱۳۴۳ف تک کے یہ اخراجات ناظرین کی دلچسپی کے لئے ترسیمی طریق پر ظاہر کئے جاتے ہیں ۔

تشریح ترسیم | ترسیم کا آغاز ۱۳۲۸ف سے ہوتا ہے سال ہذا میں آلات سائنس سے متعلقہ اخراجات چند ہزار سے زائد نہ تھے ۱۳۲۹ف میں ۵۹ ہزار ۲ سو ستاسی روپیے کی ایک معتد بہ رقم پہلی مرتبہ اس میں خرچ ہوئی ۱۳۳۰ف میں یہ خرچ تقریباً ایک لاکھ کو پہونچ گیا۔ اس سال نظام کالج کے کیمیا اور طبعیات کے دار التجارب کی تعمیر میں تقریباً ۲ لاکھ روپیہ صرف ہوئے اور ان کو پورے طور پر جدید سامان سے آراستہ کیا گیا۔ اس مد میں اپنے اخراجات کے لحاظ سے ۱۳۳۵ف، ۱۳۳۷ف، ۱۳۳۹ف ترسیم میں خصوصیت سے نمایاں دکھائی دیتے ہیں ۱۳۳۵ف میں دار التجارب کے آراستگی میں ۹۵ ہزار ۹ سو روپیہ خرچ ہوئے اس رقم کا ایک بڑا حصہ جملہ ہائی اسکول اور سٹی کالج کے دار التجارب پر صرف ہوا ۱۳۴۲ف میں

ترسیم اخراجات برائے دارالتجارب سائنس اسکول وکالج
سنہ ۱۳۲۸ف تا سنہ ۱۳۴۳ف
پیمانہ ۱ انچہ = ۲ سال
۱ انچہ = ۵۰ ہزار روپیہ
۲ لاکھ ۷۵ ہزار
۲ ½ لاکھ
۲ لاکھ
۱ ½ لاکھ
۱ لاکھ
۵۰ - ہزار
۱۳۲۸ف
۲۹ و
۳۰ و
۳۱ و
۳۲ و
۳۳ و
۳۴ و
۳۵ و
۳۶ و
۳۷ و
۳۸ و
۳۹ و
۴۰ و
۴۱ و
۴۲ و
۴۳ و
سنہ فصلی

ترسیم کی بلندی گذشتہ تمام سالوں سے اوپر نکل جاتی ہے۔ اس سال تقریباً ۶۰ ہزار روپیہ
جامعہ عثمانیہ کے ۔ایم ۔ایس ۔سی سے متعلقہ دارالتجارب پر صرف ہوئے ۔اور بقیہ
رقم ہائی اسکول اور دوسرے انٹر کالج کے آلات سائنس اور دیگر آلات تعلیمی پر صرف ہوئے۔
ان وسیع اخراجات کا لازمی نتیجہ ظاہر ہے ہماری درسگاہیں مکمل طور پر کیل کانٹے سے
صرف درست ہی نہیں ہوئیں بلکہ برطانوی ہند کی مماثل درس گاہوں سے سبقت لے گئیں
۔لیکن باوجود اُن عظیم الشان اخراجات کے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ابھی ہم سائنس کے عملی
کام میں آخرالذکر درس گاہوں سے پیچھے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری اکثر
درس گاہیں کرایہ کے مکانات میں ہیں اور ان میں سائنس کے عملی کام کی موزونیت کے
لحاظ سے گنجائش نہیں ہے ۔لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کچھ حد
تک متعلقہ اساتذہ بھی اس کے ذمہ دار ہیں۔ ایک سپاہی جس کو اپنے ملک اپنے مالک
اور اپنی قوم سے محبت ہے میدان جنگ میں باوجود جگہ کی ناموزونیت اور سازوسامان
کی کمی کے بہادری کے ایسے جوہر دکھاتا ہے کہ اپنے تو اپنے، غیروں کی زبان سے
تعریف نکلنے لگتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم کو اپنے ملک و مالک اور قوم سے
محبت نہیں ہے اور ہم جذبہ وطنیت میں کسی سے کم ہیں۔ لیکن جس چیز کی کمی ہے وہ یہ ہے
کہ ہمارے ارادوں میں جوش عمل اور افعال میں اثبات اور انہماک نہیں ہے ہم کو معلوم
رہنا چاہیئے کہ ملک ہمارا ہے مالک ہمارا ہے اور قوم ہماری ہے قوم کی بہبودی ہماری
بہبودی ہے۔ قوم کی زندگی ہماری زندگی ہے ۔ اور یہی آج کے زیر تعلیم بچے کل کی قوم
بنیں گے۔ ایک استاد جس کو اپنے کام سے دلچسپی ہے ۔ وہ دارالتجارب کے معمولی کم
قیمت سادہ آلات سے زیادہ بہتر نتائج پیدا کرتا ہے۔ بمقابلہ اس استاد کے جس کا تجربہ خانہ
تو اعلیٰ پیمانے پر تمام سائنٹفک آلات سے آراستہ ہے لیکن اس کو اپنے کام میں
دلچسپی نہیں۔ نویں سالانہ اساتذہ کی کانفرنس کے موقع پر نواب مہدی یار جنگ بہادر وزیر
تعلیمات نے اپنے پرمغز خطبہ صدارت میں سائنس کے متعلق جن خیالات کا اظہار فرمایا
ہے۔ وہ چونکہ اس مضمون کی تعلیم سے خاص طور پر متعلق ہیں لہذا ہم اُن کو ذیل میں نقل

کرتے ہیں۔

"آئندہ یہ ضروری ہوگا کہ ثانوی مدارس میں سائنس کی تعلیم اور مہیا کردہ آلات کے معائنے کی غرض سے ایک خاص مہتمم مقرر کیا جائے جو سائنس داں ہو۔ طلبہ کو سائنس کی ابتدائی تعلیم بہتر طریقہ وہ قاعدے سے دی جائے۔ صحیح وزن و پیمائش صحیح مشاہدہ اور مشاہدات و تجربات سے صحیح استخراج نتائج سکھانا مقصود ہوتا ہے۔ صحیح مشاہدہ اور بے کم و کاست اظہار کی عادت نہایت قابل قدر چیز ہے اور ان اوصاف کا مادہ ہے جنھیں ہمیں "لازمات تہذیب" کہنا ہوگا۔ اور جس سے تعلیم یافتہ شخص کو آراستہ ہونا چاہیئے۔ مہتمم سائنس کو دیکھنا اور کیفیت پیش کرنا ہوگا۔ کہ طلبہ کو کہاں تک آلات سے کام لینا اور تجربات کرنا سکھایا گیا ہے۔ اور آیا طرز تدریس بھی ایسا ہے جس سے طلباء میں درست مشاہدے اور قطعی صحت کے ساتھ نتائج قلمبند کرنے کی عادتیں راسخ ہوں۔"

قابل صدر نے سائنس کی تعلیم اور اُس کی اصلاح کے متعلق جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے اُس سے سائنس کی درس و تدریس کا مستقبل اور روشن ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ ذاتی تجربات اور مشاہدات کے بعد صحیح استخراج نتائج اور بے کم و کاست اظہار کی عادت نہایت قابل قدر چیز ہے۔ انہیں اوصاف کی بدولت مغربی اقوام نے سربستہ قوانین قدرت کو سمجھا، فطرت کی زبردست قوتوں کو مسخر کیا اور ان سے اپنے مقاصد کے حصول میں کام لے کر دنیا میں تہذیب اور تمدن کی علمبردار بن گئیں۔

نصاب قبل ازیں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ آج سے ۱۵ یا ۱۶ برس قبل مملکت ہذا کے نصاب تعلیمی میں سائنس کا شمار برائے نام تھا۔ مسٹر میہو نے اپنی رپورٹ میں سائنس کی باقاعدہ تعلیم پر زور دیا لیکن۔ اس کو امتحانی مضمون کی حیثیت نہ دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سائنس کی باقاعدہ تعلیم میں برابر تاخیر ہوتی رہی اور ۲۹ ف سے پیشتر اس کی تعلیم پہلے سے کچھ بہتر نہ ہوئی موجودہ نصاب تعلیمی میں سائنس کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ طبقہ تحتانیہ میں تو شروع سے مطالعہ قدرت کی شکل میں سائنس اس خیال کی تحت لازمی قرار دیا گیا تھا

کہ ہمارے بچے اوائل عمر سے اپنے گرد وپیش کے طبعی ماحول کو آنکھ کھول کر دیکھنے کی عادت پیدا کریں لیکن اس زمانہ میں وسطانیہ اور فوقانیہ جماعتوں میں سائنس اختیاری مضمون کی حیثیت سے تھی۔ بعدازاں وسطانیہ جماعتوں میں بھی یہ مضمون لازمی قرار دیا گیا۔ اور مطالعہ قدرت کے ساتھ ساتھ ابتدائی سائنس بھی نصاب میں داخل ہوگئی سنہ ۱۳۴۳ف سے فوقانیہ جماعتوں میں یہ مضمون لازمی ہوگیا۔ حتیٰ کہ اسی سال سنہ ۱۳۴۶ف میں شعبہ دینیات کے جو طلبا امتحان میٹرک میں داخل ہوں گے۔ ان کو بھی منطق کے بجائے سائنس میں امتحان دینا ہوگا۔ اس طرح دینیات کے طلبہ کے لئے یہ پہلا موقعہ ہوگا کہ وہ سائنس کی دنیا میں داخل ہوں۔ یہ جدید اور قدیم خیالات کی آمیزش ان کے لئے صرف مفید ہی نہیں ہے بلکہ نہایت ضروری ہے۔ جدید تجربات نے اس امر کو بالکل واضح کر دیا کہ ذہنی اور اخلاقی تربیت صرف منطقی استدلال اور زبانی جا و بیجا تلقین و تبلیغ سے نہیں ہوسکتی ہے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے تقدیر پرستی کی بجائے فلسفۂ عمل کی تلقین کی زیادہ ضرورت ہے تاکہ طلباً میں کارکردگی کی بیش قیمت صفات کی نشو ونما ہو۔ ذہنی، اخلاقی، معاشرتی مقاصد کے حصول کے لئے سائنس کی تعلیم سے بہتر۔ بشرطیکہ وہ بااصول طریقے پر دی جائے کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے صنعتی و مادی مفاد کے حصول کے علاوہ سائنس نے انسان کو سب سے زیادہ مفید اور نتیجہ خیز سبق یہ سکھایا ہے کہ وہ خود اپنی ترقی اور تنزّل کا ذمہ دار ہے۔ وہ اپنی تربیت یافتہ عقل کے ذریعہ اپنے ذاتی معاملات کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالے اور اُس کے موافق اور مخالف دلائل کو تولے اور حسب ضرورت صحیح راستہ اختیار کرے ایک ماہر فن تعلیم لکھتا ہے کہ "اس عقیدے کے طفیل میں انسان عاجزانہ تقدیر پرستی سے نجات پاکر نظام عالم میں اپنی اہمیت اور اپنے فرائض کو پہچانتا ہے۔ اور یہی خود شناسی خداشناسی کی سیڑھی ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ سائنس قدرت کی کارسازی کے وہ حیرت انگیز کرشمے دکھاتی ہے۔ اور قدرت کے لاتعداد اور بظاہر متضاد مظاہر میں قانون الٰہی کی حکومت کا ایسا بیّن ثبوت دیتی ہے کہ اگر ہم عقیدت اور احترام کے ساتھ چشم بصیرت سے اس کا مطالعہ کریں تو وہ ہمیں بلا واسطہ معرفت الٰہی کی منزل پر

پہنچا دیتی ہے“

سائنس کی تعلیم کی وسعت کے ساتھ ہی ساتھ اس امر کو بھی خاص طور پر پیش نظر رکھا گیا ہے کہ جو کچھ اس مضمون میں طلبہ کے سامنے پیش کیا جائے وہ ان کی عمر، فطرت، جبلت اور جذبات کے مطابق ہو۔ اس اہم مقصد کی تکمیل کے لئے ایک مجلس نصاب قائم ہوئی۔ یہ مجلس سررشتہ ہذا جامعہ عثمانیہ کے سینیر عہدہ داروں پر مشتمل تھی۔ اس مجلس نے ایک ذیلی مجلس کی مدد سے تمام جماعتوں کے واسطے ہمارے حالات کو مدنظر رکھ کر نہایت بہتر نصاب تیار کیا۔ نصاب کی ترتیب کے ماسوا اس زمانہ میں ایک دوسرا مفید کام انجام دیا گیا جس طرح ایک سپہ سالار کی کامیابی کا راز اس میں شک نہیں کہ بہت کچھ اس نقشۂ جنگ پر منحصر ہے جو قبل سے سوچ کر مرتب کر لیا جاتا ہے لیکن اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کامیابی کا ایک بہت بڑی حد تک انحصار زمانہ کے حسب حال اُن سائنٹفک اسلحہ پر بھی ہے جن سے فوج مسلح ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح ایک استاد کی کامیابی کا راز بہت کچھ ان کتب پر منحصر ہے۔ جو طلبہ کے زیر مطالعہ رہتی ہیں۔ ہر مضمون کی بہترین کتابوں کی تصنیف و تالیف کے واسطے ایک مجلس نصاب کتب قائم ہوئی اس طرح شعبہ سائنس سے متعلق ایک مجلس کا قیام عمل میں آیا ظاہر ہے کہ جو تصنیف و تالیف کا کام سررشتہ ہذا اور جامعہ کے بہترین تجربہ کار اور قابل اساتذہ کی مشترکہ دماغی کاوش کا نتیجہ ہوگا وہ کس قدر مفید ہوگا۔

سائنس اور جامعہ | اعلیحضرت واقدس کی تخت نشینی سے قبل ریاست ہذا میں دو کالج تھے۔ ایک مشرقیہ جو دارالعلوم کے نام سے مشہور تھا۔ یہ یہاں کی قدیم ترین درس گاہ تھی۔ اس میں طلبہ امتحانات السنہ مشرقیہ کے لئے تیار کئے جاتے تھے اور دوسرا نظام کالج جو مدارس یونیورسٹی سے ملحق ہے کالج اول الذکر میں جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں سائنس کی برائے نام نظری تعلیم مولوی اور عالم کے نصاب میں داخل تھی لیکن نظام کالج میں انگریزی کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ تھوڑی بہت باقاعدہ سائنس کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ اس کام کے لئے ایک ڈی۔ ایس سی (ڈاکٹر آف سائنس) بحیثیت لکچرار اور ایک

بی۔ایس۔سی ڈمانسٹریٹر مامور تھا۔لیکن ۲۹ف تک اس کالج کا شمار بحیثیت ایک آرٹس
کالج کے تھا۔اسی سال تقریباً ۳ لاکھ کی منظوری سے یہاں کے دارالتجربہ کی تعمیر شروع ہوئی
اور یہ ۳۰ف میں تکمیل کو پہونچا۔بی۔ایس۔سی کی جماعت کا آغاز ہوا۔اور مدارس یونیورسٹی کے
معاہدہ کے مطابق اس سلسلہ میں سائنس کی تعلیم کے لئے متعلقہ اسٹاف میں بھی اضافہ کیا گیا۔
فی الوقت نظام کالج سائنس کی تعلیم کے لحاظ سے کسی برطانوی ہند کی درس گاہ سے پیچھے
نہیں ہے۔اس کالج کے طلبہ کی مضمون سائنس سے گہری دلچسپی کا پتہ اس نمائش سے
چلتا ہے۔جو ۴۴ف میں مسٹر ٹرز کی سرکردگی میں یہاں کے طلبہ نے بصدارت جناب نواب
مہدی یار جنگ بہادر منعقد کی تھی۔

جامعہ عثمانیہ | جامعہ عثمانیہ کا قیام اعلیحضرت واقدس کے درخشاں دورِ حکومت کا نہایت
مہتم بالشان کارنامہ ہے۔جامعہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سائنس اور دیگر مضامین کی
تعلیم ملک کی عام زبان اُردو میں ہوتی ہے۔اگرچہ آج مادری زبان میں تعلیم دینے کی اہمیت
اور ضرورت کو تمام ملک نے تسلیم کرلیا ہے۔اور تقریباً تمام تعلیمی محکمہ جات نے بجز چند
جمود پسند جامعات کے فوقانیہ جماعات کی تعلیم اُردو میں کردی اور خیال یہ ہو رہا ہے جیسا کہ
ایک قابل مصنف نے بھی لکھا ہے کہ "چند سال کے اندر ہی اندر کوئی یونیورسٹی ایسی نہ رہے گی
جہاں ثانوی تعلیم انگریزی کے ذریعہ دی جائے لیکن اس کے بعد ایک اور تعلیمی جہاد کرنا پڑیگا
جس کا مقصد کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تسخیر ہوگا" یہ بات ہمارے لئے باعث فخر ہے کہ
جس تعلیمی جہاد کا احساس اب ملک میں ہو رہا ہے وہ ہماری ریاست اپنے روشن خیال
فرمانروا کی زیر قیادت آج سے ۱۸ برس قبل نہایت کامیابی سے کرچکی ہے اس لحاظ سے
جامعہ عثمانیہ اپنے طرز کا اولیں ادارہ ہے جس میں سائنس کی اعلیٰ تعلیم ملک کی عام زبان اُردو
میں دیجاتی ہے۔گو ابتدا میں خیال یہ تھا کہ زبان اُردو میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ یہ
سائنٹیفک مضامین کی اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بن سکے لیکن ہمارے بادشاہ ذیجاہ کی شاہانہ
فیاضی اور علم نوازی نے اس مسئلہ کو نہایت خوبی سے حل کردیا۔اس میں شک نہیں کہ
یہ مسئلہ نہایت پیچیدہ تھا۔اور اعلیٰ حضرت واقدس کی سرپرستی اور ہمدردانہ رہبری ملک کے

بغیر اس بیل کا پروان چڑھنا ناممکن تھا۔ قیام جامعہ کے متعلق جو فرمان مشرشدہ ۶ ار ذی الحجہ شرف صدور لایا۔ اس کے الفاظ بطور فخر و مباہات ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں۔

"وہ آرا منظور کئے جاتے ہیں جو اس مملکت میں ایک ایسی یونیورسٹی کے قیام کے متعلق عرضداشت اور اس کے ساتھ کی یادداشت میں عرض کئے گئے ہیں کہ جس میں زمانہ قدیم اور زمانہ حال کے علم و کمال کو باہم یکجہتی کے ساتھ ضم کیا جائے جس سے وہ نقائص دُور ہو جائیں جو موجودہ طریقۂ تعلیم سے پیدا ہوئے ہیں اور جسمانی ذہنی اور روحانی تہذیب و آراستگی کے جو بہترین فوائد زمانہ موجودہ اور زمانہ قدیم کے طریقۂ تعلیم میں موجود ہیں وہ پورے طور پر حاصل کئے جا سکیں اس سے جو مقصد اول ہے یہ ہے کہ مملکت میں تعلیم پھیلائی جائے۔ اس کے علاوہ اس کا مطمح نظر یہ بھی ہونا چاہیئے کہ طلبۂ کی اخلاقی تربیت بھی کی جائے۔ اور ان میں تمام سائنٹیفک مضامین کی تحقیق کا شوق پیدا کیا جائے یونیورسٹی کے انجام دہی کار کا ضروری اُصول یہ ہونا چاہیئے کہ اعلیٰ تعلیم زبان اُردو کے ذریعہ سے دی جائے اور اس کے ساتھ ہی بحیثیت زبان ہر طالب علم کے لئے زبان انگریزی سیکھنا لازم گردانا جائے۔ اس غرض و مقصد کو پیش نظر رکھکر حکم دیا جاتا ہے کہ جو اُصول عرضداشت میں عرض کئے گئے ہیں ان پر میری تخت نشینی کی یادگار کے طور پر مملکت ہذا کے لئے ایک یونیورسٹی قائم کرنے کی کارروائی شروع کی جائے۔ اور اُس کو عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد کے نام سے موسوم کیا جائے" فرمان مُبارک کے ذیل کے الفاظ پر غور کیجئے۔ "اس سے جو مقصد اول ہے وہ یہ ہے کہ مملکت میں تعلیم پھیلائی جائے اس کے علاوہ اس کا مطمح نظر یہ بھی ہونا چاہیئے کہ طلبۂ کی اخلاقی تربیت بھی کی جائے اور ان میں تمام سائنٹیفک مضامین کی تحقیق کا شوق پیدا کیا جائے"

ان الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت سلطان العلوم تاجدار دکن کو سائنس اور اس کے مماثل محققانہ مضامین کی تعلیم سے کتنی گہری دلچسپی ہے۔ گذشتہ ۱۵ یا ۱۶ سال میں حضرت اقدس و اعلیٰ نے سائنٹیفک مضامین کی تعلیم پر جو بے دریغ روپیہ صرف کیا اور اب بھی صرف کر رہے ہیں وہ ایک بہت بڑی ملکی اور قومی خدمت ہے۔ ملک کی عام

زبان اُردو میں سائنٹیفک علمی چرچہ پیدا کر کے اس کو قعر مذلت سے نکالنا ہمارے ہی بادشاہ عالی جاہ کا کام ہے۔ قوم اور ملک اس احسان اور نوازش کا جتنا کچھ شکریہ ادا کرے کم ہے۔

افتتاح کلیہ جامعہ عثمانیہ آبان ۲۶ف میں دارالترجمہ کی بنیاد پڑی اور دو برس کے بعد جب میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کی تعلیم کے واسطے ضروری کتابیں ترجمہ ہوگئیں تو مہر ۲۸ف میں کلیہ جامعہ عثمانیہ کا افتتاح عمل میں آیا۔ ابتدائی چند سالوں تک اس کی حیثیت ایک آرٹس کالج کے رہی۔ سائنس کا انتظام ۳۷ف سے قبل نہ ہوسکا۔ چنانچہ ۳۸ف میں آرٹس اور سائنس کے جملہ ۶۴ طلبۂ۔ بی، اے۔ کے امتحان میں شریک ہو کر ۳۸ طلبہ کامیاب ہوئے۔ اسی سال ۸ طلبہ ایم۔ ایس۔ سی کے امتحان سال اول میں شریک ہو کر کامیاب ہوئے۔ چونکہ۔ ایم۔ ایس۔ سی کے نصاب میں تحقیقی کام بھی شامل ہے۔ سال ہذا میں ۵۰ ہزار روپئے سے زاید کیمیا اور طبعیات کے دارالتجارب کو ضروری آلات سے آراستہ کرنے میں صرف ہوئے۔ سرکار نے طلبہ کی ہمت افزائی کے واسطے طبعیات۔ کیمیا اور متعدد دیگر مضامین میں تحقیقی کام کے واسطے پچھتر روپیہ کے وظائف بھی منظور کر دئے ہیں اور سنہ ۱۹۳۰ء سے لے کر اب تک مختلف مضامین میں عملی تحقیق کیلئے ۳۲ وظائف دئے جاچکے ہیں۔

جامعہ میں سائنس کی موجودہ تعلیم ہماری سائنس کا معیار کسی جامعہ سے پست نہیں ہے۔ کلکتہ۔ ڈھاکہ۔ علیگڈھ۔ میسور۔ پنجاب اور متعدد ہندوستانی اور برطانوی جامعات نے اس کو باقاعدہ تسلیم کرلیا ہے۔ جو طلبہ اس جامعہ سے مضامین سائنس میں کامیاب ہو کر جرمنی اور برطانیۂ عظمیٰ کے جامعات میں جاکر شریک ہوئے ہیں ان میں سے اکثر نہایت کامیاب رہے ہیں۔ اور کچھ تحقیقی کام بھی کر دکھایا ہے۔ سائنس کے عملی امتحانات میں جو ممتحنین دوسری برطانوی ہند کی جامعات سے ہمارے طلبہ کا امتحان لینے آئے ہیں اُنہوں نے اپنی رائے میں اس امر کا خصوصیت سے اظہار کیا ہے کہ ہمارے طلبہ میں تجسس کا مادہ بمقابلہ دوسری جامعات کے زیادہ ہے اور اپنے خیالات کا اظہار زیادہ عمدگی سے کرسکتے ہیں۔

ہماری سائنس کی تعلیم کا یہ معیار ہے اور یہ سب آقائے ولی نعمت سلطان العلوم کی ہمدردی اور علم نوازی کے نتائج ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جامعہ عثمانیہ اور اس کے جز ولاینفک دارالترجمہ کی تاسیس ہزاگزالٹیڈ ہائی نس رستم دوراں ارسطوئے زماں لفٹنٹ جنرل مظفرالملک نظام الدولہ نواب میر عثمان علی خاں بہادر فتح جنگ سپہ سالار وفادار سلطنت برطانیہ نظام الملک آصفجاہ۔جی۔سی۔ایس۔آئی۔جی۔بی۔ای۔ والئی حیدرآباد دکن و برار خلد اللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ کے نام نامی کو بغداد، قاہرہ، روم۔ قرطبہ کے علوم نواز سلاطین کی طرح بحیثیت سلطان العلوم کے آئندہ صدیوں تک روشن رکھے گی۔

ہم خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں بکمال ادب دست بدعا ہیں کہ وہ اپنے رحم و کرم سے ہمارے آقائے ولی نعمت سلطان العلوم کا سایہ عرصہ دراز تک ہمارے سروں پر قائم رکھے اور ہم عقیدت مندان دولت آصفیہ کو اپنے محبوب بادشاہ کے جشن سیمین کے بعد جشن زرین، جشنِ الماسی اور متعدد مماثل جشن کی خوشیاں منانے کا موقع دے۔

رُباعی

نتیجہ فکر جناب مولوی عبدالسلام صاحب ذکی

عہدِ عثماں میں خرم و شاد ہیں سب ۔۔۔ مسرور ہیں خوش وقت ہیں آباد ہیں سب
اس حکم نے ہر قوم کا دل موہ لیا ۔۔۔ مذہب کے معاملے میں آزاد ہیں سب

دیگر

اس ملک کا آفتاب شاہا تو ہے ۔۔۔ اس چرخ کا ماہتاب شاہا تو ہے
تو مہر ہے ذرے ہیں رعیت تیری ۔۔۔ ان ذروں کی آب و تاب شاہا تو ہے

دیگر

خورشید صفت جن کی چمکتی ہے کلاہ ۔۔۔ عثمان علی شاہ دکن ظل اللہ
تا دَورِ فلک رہیں سلامت یارب ۔۔۔ دنیائے دکن کے ہیں یہی پشت و پناہ

بچوں کے عام امراض کی تشخیص میں

استاد کا اہم حصہ

ڈاکٹر حیدر علی خاں صاحب ایف۔ آر۔ سی۔ ایس۔ پرنسپل میڈیکل کالج

گذشتہ سے پیوستہ

اگر بخار ہونے کا کوئی شبہہ ہو تو ہمیشہ یہی مناسب ہے کہ ایک تھرمامیٹر لگا کر دیکھ لیا جائے، کیونکہ اس سے بخار کی موجودگی اور حرارت کا صحیح درجہ معلوم ہو جاتا ہے۔ اسی واسطے تھرمامیٹر مدرسہ کے سامان کا ایک ضروری جزو ہے یہ ضروری نہیں کہ ہر معلم کے پاس ایک ایک تھرمامیٹر رہے، بلکہ صرف صدر مدرس کے پاس ایک تھرمامیٹر رکھا رہے تو کافی ہے۔

بخار — حرارت کی زیادتی (بخار) یا تو ملیریا کے سبب سے ہو سکتی ہے یا کسی متعدی تپ یا ساری بخار (مثلاً چیچک، گوبری، کنکر تپھر، ڈفتھریا یا خناق وبائی کن پھیڑ ( ) کی وجہ سے۔ متعدی تپوں میں (جن میں ٹائفائیڈ یا میعادی تپ وغیرہ ( ) شامل ہیں) حرارت کبھی درجہ طبعی پر نہیں پہنچتی۔ اگر چیچک کا شبہہ ہو تو بچہ کے بازو پر چیچک کے ٹیکہ کے نشانات کو دیکھنا چاہئے، کیونکہ ٹیکہ لگے ہوئے بچوں کو چیچک شاذ ہی ہوتی ہے (اور اگر کبھی ہوتی بھی ہے تو بہت خفیف درجہ کی)۔ گوبری ( ) میں گالوں کے اندر کی طرف کاپ لیک کے دھبے ( ) پائے جاتے ہیں۔ یہ سرخی مائل زمین (پس منظر) پر سفید دھبے ہوتے ہیں۔ کنکر تپھر ( ) یا موتیا سیتلا ایک خفیف درجہ کا مرض ہے اور اس میں دانے منتشر اور بکھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ مچھروں کے کاٹنے کے نشانات اور گوبری کے باریک دانوں کے درمیان تمیز کرنا چاہئے۔ مچھروں کے نشانات اکثر ہاتھوں اور چہرے پر ملتے

ہیں، مگر گوبری وغیرہ کے دانے زیادہ تر شکم پر اور زیر ناف حصے میں ہوتے ہیں۔ ڈفتھیریا (خناق وبائی) میں بچہ سست رہتا ہے، ممکن ہے کہ اس کے تنفس (سانس لینے) میں دقت ہو، اور کچھ عرصہ گذرنے پر نگلنے میں بھی تکلیف ہو۔ اُس کی سانس بدبودار ہوتی ہے، حلق متورم اور ممتلی (Congested) ہوتا ہے اور اس میں ایک سفید دھبہ یا جھلی سی ہوتی ہے جسے چھونے سے خون نکل آتا ہے۔ کن پھیڑ (Mumps) میں غدۂ نکفیہ (پر انڈ گلینڈ) متورم ہو جاتا ہے۔ یہ غدہ کان کے سامنے اور نیچے کے طرف واقع ہے۔

آنکھیں آنکھوں کا امتحان بھی نہایت غور اور احتیاط کے ساتھ کرنا چاہیئے۔ بخار مثلاً نمونیہ (ذات الریہ) میں آنکھیں تمتمائی ہوئی ہوتی ہیں۔ آشوب چشم میں سُرخ (لال انگارا) ہو جاتی ہیں۔ اور یرقان کی حالت میں پیلی زرد۔ آنکھوں کے کُکرے (Granular lids) بچوں کا بہت عام اور متعدی مرض ہے۔

اہم امراض بعض اہم اور قابل غور امراض حسب ذیل ہیں۔

(۱) قلتی امراض (Deficiency Diseases)

ا۔ بوجہ قلت غذا۔ (Malnutrition)

ب " " حیاتین۔ (Vitamin Dificiency)

ج " " افرازات باطنی (Internal Dificiency)

(۲) لوزتین کی کلانی (Enlarged Tonsils) اور غدودہ (Adenoids) یعنے ناک کے پچھلے حصے میں غدود کی کلانی۔

(۳) تدرن (سِل و دِق) اور خنازیر (Scrofuh)

(۴) پیدائشی امراض۔ آتشک۔

(۵) کالی کھانسی

(۶) درد سر

(۷) امراض جلد۔

(۸) ملیریا۔ ہندوستان کا ایک عام مرض ہے، جسمیں تلی بڑھ جاتی ہے اور بائیں جانب

پسلی کے حاشیہ کے نیچے محسوس ہو سکتی ہے۔

قِلّتی امراض۔ غذا کی کمی کی وجہ سے ہو سکتے ہیں۔ جس سے عام جسمانی کمزوری پیدا ہو جاتی ہے، یا ان کا سبب غذا کے اندر کے بعض خاص خاص اجزا (حیاتین) کی قلت ہو سکتی ہے۔ ان کی مثالیں کُساحت (Rickets)، حَفَر (Scurvy) وغیرہ ہیں۔

کُساحت

کُساحت (Rickets) بچوں کا ایک اہم مرض ہے، جس میں ہڈیاں نرم اور ٹیڑھی ہو جاتی ہیں۔ بچہ کا سر بکس نما، سینہ کبوتر نما اور پسلیاں منکے دار ہو جاتی ہیں یہ اس کے ممتاز خصائص ہیں۔ چونکہ یہ مرض بچہ کی غذا کی خرابی اور سورج کی روشنی کی قلت کی وجہ سے کمزور بچوں میں پیدا ہو جاتا ہے، لہٰذا اس میں کاڈ لیور آئل (مچھلی کا تیل) اور دھوپ میں کھلا رکھنے سے فائدہ پہنچتا ہے۔

حَفَر

حَفَر (Scurvy) میں مسوڑھے متورم ہو جاتے ہیں اور اُن میں خون بآسانی نکلتا ہے اِس کو لیموں کا عرق دینے سے نفع ہوتا ہے، جسمیں دافع حَفَر حیاتین موجود ہوتے ہیں۔

افرازات باطنی (Internal Secretion) تھائرائڈ (غُدہ دَرقیہ) نہایت اہم ہے، کیونکہ اگر اس کے افراز کی کمی ہو تو کریٹنزم (Cretinism) (حماقت) یعنے بونا پن پیدا ہو جاتا ہے، بدن کی بالیدگی ٹھٹری ہوی ہوتی ہے اور ذہن کند

بونا پن

ہوتا ہے۔ اس کے اثر سے ایک بارہ سال کی عمر کا لڑکا پنجسالہ بچہ نظر آسکتا ہے ایسی حالت میں خلاصہ درقیہ (Thyroid Extract) کھلانے سے فائدہ ہوتا ہے۔

لوزتین

لوزتین اور غدودہ (Tonsils and Adenoids) لوزتین وہ غدد ہیں جو حلق کے دونوں جانب واقع ہیں اور اگر مُنہہ کو خوب کھول کر دیکھا جائے تو نظر آسکتے ہیں جب یہ متورم ہو کر بڑے ہو جاتے ہیں تو بچہ عموماً منہہ کی راہ سے سانس لینے لگتا ہے اور اکثر خرانٹے دار سانس پیدا ہو جاتی ہے۔ حلق کے اندر دیکھنے سے لوزتین بڑھے ہوے پائے جاتے ہیں اور زیادہ بڑھے ہوے ہوں تو دونوں طرف کے لوزتین قریب آکر حلق کا راستہ روک دیتے ہیں۔

غدودہ

غدودہ (Adenoids) ان سے پیچھے کی طرف حلق کی پشت میں ناک کے پچھلے سوراخوں کے مقام پر ہوتا ہے اور لوزتین کے ساتھ ساتھ بعض اوقات اس میں بھی کلانی اور وَرم ہو کر تنفس

اور خرّانے دار سانس پیدا ہوجاتی ہے۔ ممکن ہے کہ اسی سے بہرا پن بھی پیدا ہوجائے اور کان بہنے لگیں۔ دقت تنفس اور سانس کی کمی کی وجہ سے سینہ تنگ اور پچکا ہوا (ناقص النمو) ہوتا ہے اور بچہ کو دیکھا جائے تو اس کا سر آگے کو جھکا ہوا، منھ کھلا ہوا، اور سینہ پچکا ہوا نظر آئے گا۔ ایسی حالت میں لوزتین اور غدوہ کو ایک سرجن سے نکلوا دینا چاہیے۔

مد تدرّن (Tuberculosis) جسے عام طور پر سِل یا دِق (Consumption) کہتے ہیں، ایک مزمن (Chronic) یا دیر پا مرض ہے۔ اکثر اوقات یہ

خنازیر گردن کے لمفی غدد میں خنازیر کی صورت میں نظر آتا ہے۔ لہٰذا بڑھے ہوئے غدد کا علاج غور اور احتیاط کے ساتھ کرانا چاہیے کبھی کبھی تدرن پھیپھڑوں میں بھی پھیل جاتا ہے۔

سِل و دِق (Consumption) سِل ریوی) بچوں میں پھیپھڑوں کا تدرن اس قدر عام نہیں ہے بلکہ ان میں ہڈیوں اور جوڑوں کا تدرّن زیادہ عام ہوتا ہے۔ ان میں یہ مرض بہت مزمن (کہنہ اور دیر پا) ہوتا ہے۔

آتشک پیدائشی امراض مثلاً آتشک بعض اوقات بچوں میں نظر آتے ہیں۔ اس کی تشخیص بآسانی ہوسکتی ہے کیونکہ اس میں ناک چپٹی ہوتی ہے اور دانت میخ نما ہوتے ہیں اور ان میں ہلالی گڑھے یا کنگرے پیدا ہوجاتے ہیں۔

کالی کھانسی کالی کھانسی ایک نہایت خوفناک اور شدید متعدی مرض ہے، کیونکہ اس میں نہ صرف کھانسی کے تکلیف دہ دَورے ہوتے ہیں، بلکہ اس کے مشارکات اور عوارض (پیچیدگیاں) بھی متعدد اور خراب ہوتے ہیں۔ کھانسی دورے کی صورت میں شروع ہوکر دیر تک جاری رہتی ہے اور بالآخر ایک "ہوپ" (شہقہ، یعنی مرغی کے کڑکڑانے کی آواز) پر ختم ہوتی ہے۔ چونکہ یہ کھانسی طویل المدت متعدی اور ساری مرض ہے، لہٰذا بچہ کو مدرسہ سے ۲-۳ ماہ کے لیے علحدٰہ کرکے علاج کرانا چاہیے۔

درد سر درد سر بیشمار اسباب کی وجہ سے پیدا ہوسکتا ہے، مثلاً مختلف تپوں (بخار)، قبض خرابیٔ نظر (نقص بصارت) وغیرہ وغیرہ کی وجہ سے۔ مسلسل درد سر عموماً خرابیٔ نظر کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جس کی اصلاح عینکوں وغیرہ سے کرنا چاہیے

خارش وغیرہ امراض جلد، مثلاً خارش، داد وغیرہ اکثر متعدی یعنے چھوت دار ہوتے ہیں، اس لیے بچہ کو مدرسہ سے کچھ عرصہ تک علٰحدہ رکھکر معقول علاج کرانا چاہیے۔

مندرجہ بالا فہرست مختصر سا خاکہ ہے۔ اس میں بہت کچھ اضافہ ہو سکتا ہے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہر استاد ایک طبیب یا ڈاکٹر بن جائے، بلکہ مطلب صرف اسی قدر ہے کہ اگر استاد صاحبان مشاہدے اور توجہ کی مشق فرمائیں تو وہ طلبار کے بہت سے بنیادی امراض اور موٹے عوارض کی جڑ تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس میں یہ فائدہ ہے کہ مرض کی طرف ابتدائی حالت میں توجہ ہو کر باقاعدہ طبی معائنہ اور معقول علاج کا انتظام جلد از جلد ہو سکتا ہے۔ متعدی امراض مثلاً وبائی بخار، چیچک، گوبری، نزلہ و زکام، کالی کھانسی، خارش وغیرہ کے اثر سے بچوں کو محفوظ اور مامون رکھا جا سکتا ہے۔ دانتوں اور آنکھوں کی بہت سی خرابیوں کو رفع کیا جا سکتا ہے۔ لوزتین اور غدود وہ کا مناسب علاج کر کے بچوں کو تندرست اور ذہین بنایا جا سکتا ہے۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسکول کی عام صحت کے معیار میں ترقی کی جا سکتی ہے اگر یہ حال ہو جائے تو بہت بڑی بات ہے کیونکہ بچوں کی صحت قوم کی صحت ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو آپ اساتذہ صاحبان نہ صرف نونہالان قوم کے لئے مثل باغبان اور محافظ کے ہیں بلکہ صحیح معنوں میں قوم کو صحت ور اور مہذب بنانے والے ہیں دیکھیے ملک کی قسمت آپ کے ہاتھ میں ہے اور سب کی امیدیں آپ ہی کے ساتھ وابستہ ہیں۔

مرکزی انجمن ترک مسکرات حیدرآباد دکن

استادوں اور پروفیسروں کی خدمت میں اپیل

عزیز اساتذہ و پروفیسر صاحبان!

آپ ہمارے لاکھوں لڑکوں اور لڑکیوں کو تعلیم دیتے اور ان کی سیرت بنانے کا مقدس فرض انجام دیتے ہیں۔ اور آپ نے اپنی زندگی ایک ایسے مقصد کے لئے وقف کر دی ہے جس سے بہتر مقصد تصور میں نہیں آسکتا۔ چونکہ ہم ترک مسکرات کے مسئلہ سے دلچسپی رکھتے ہیں اس لیے ایسے چند امور آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں جو ہمارے نوجوانوں اور آیندہ نسلوں کی ابتدائی تعلیم سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ ہماری ریاست کی محکمۂ آبکاری رپوٹ سے ظاہر ہے کہ ۱۳۴۴ف (۱۹۳۴ تا ۱۹۳۵ء) میں شہر حیدرآباد میں جس کی آبادی (۴,۶۶,۸۹۴) نفوس پر مشتمل ہے ایک سال کے عرصہ میں صرف سیندھی (۲,۵۴,۹۲,۹۶۰) سیر (یعنی ڈھائی کروڑ سیر سے زیادہ) پی گئی اس سے ہم اندازہ کرتے ہیں کہ کل ممالک محروسہ میں جس کی آبادی (۱,۴۴,۳۶,۱۴۸) ہے (۷۸,۸۶,۱۶,۱۰۴) سیر یا تقریباً ۷۹ کروڑ سیر سیندھی) ایک سال میں پی گئی۔ اس حساب سے اس ریاست کی کل آبادی میں فی کس ۵۴٫۶ سیر سیندھی حصہ میں پڑتی ہے جس میں نومولود بچے چھوٹے لڑکے اور تمام طبقات کے جوان اور بوڑھے شامل ہیں۔ ان اعداد میں دیسی شراب اور دیگر منشیات افیون۔ گانجہ، کوکین وغیرہ شامل نہیں ہیں۔ جن کا لوگوں نے استعمال کیا ہوگا۔ سنہ ۱۳۴۴ف میں جملہ اقسام کے اشیائے نشی پر (۱,۸۷,۴۳,۶۲۵) روپیہ یعنے دو کروڑ سے کچھ ہی کم سرکاری محصول آبکاری اور کروڑگیری لگایا گیا تھا۔ اس میں دیسی شراب سیندھی کی بابت (۱,۶۷,۳۳,۵۱۱) یعنی ڈیڑھ کروڑ روپیہ سے زیادہ رقم شامل ہے اب اس کا حساب

نوٹ: یہ اپیل انجمن اساتذہ بلدہ کی دسویں سالانہ کانفرنس میں نواب مرزا یار جنگ بہادر صدر المہام عدالت و امور مذہبی نے پڑھی تھی

لگایا جاوے کہ یہ اشیار کتنے میں فروخت ہوئی ہوں گی ۔ ان سب کی بازاری قیمت اس سے تو کم نہیں ہوسکتی جو جملہ رقم چنگی و محصول ابکاری میں وی گئی۔ اس پر اصل خرچہ جو تیاری منشیات میں صرف ہوا۔ لگایا جاوے اور پھر بیچنے والوں نے بھی اپنا منافع لیا ہوگا۔ اس طرح ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ ان اشیار منشی اور شراب کی فروخت سے دکانداروں کو سرکاری رقم کروڑگیری کے دوچند سے زیادہ رقم وصول ہوئی ہوگی۔ اس حساب کی رو سے گویا تقریباً چار کروڑ روپیہ رعایائے ملک کا ان غیر ضروری اور تباہ کن تعیش میں ایک سال کے عرصہ میں ضائع ہوا۔ جن لوگوں نے یہ روپیہ برباد کیا۔ ان کی معاشی حالت اور قابلیت کسب معاش پر کس درجہ اس کا مضر اثر ہوا ہوگا۔ اور کس قدر تکالیف مصیبتیں اور اخلاقی پستی ان میں پیدا ہوئی ہوگی اس کا صرف اندازہ ہم کر سکتے ہیں۔ جن مقامات و ماحول پر یہ چار کروڑ رقم صرف کی گئی وہاں اخلاقی پستی کا ایک ایسا زہر ضرور پیدا ہوا ہوگا جس سے ہمارے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں متاثر ہوئے بغیر نہیں بچ سکتے۔ وہاں تباہ کن عادات کے ایسے تخم ضرور بوگئے ہوں گے جو خدا کی مقدس ترین خلق کو زندگی کے پست ترین مقام کی طرف ڈبو دیتے ہیں ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اب خطرناک منزل پر پہونچ گئے ہیں ۔ ہم اس کے معترف ہیں کہ آبکاری کے معاملہ میں ایک دوراندیشانہ پالیسی اختیار کرکے حکومت سرکار عالی نے بھی اس مد میں آمدنی کو بڑھاتے ہوئے گذشتہ سات سال کے عرصہ میں اشیا منشی کے استعمال میں بحیثیت مجموعی کچھ کمی کرانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ لیکن باوجود اس کے خطرہ ہنوز باقی ہے اور وہ ہمکو دھمکی دے رہا ہے ۔ نہ تو حکومت اور نہ رعایائے ملک ایسی صورت حال کو نظرانداز کرسکتی ہے جس سے ان لوگوں کی صحت ۔ عافیت اور قابلیت پر جو کہ ریاست کے پشت پناہ ہیں اس قدر مضر اثر پڑ جاتا ہے ۔ استعمال منشیات کا مرض ایسا مرض بن گیا ہے جس کا سامنا اب تمام دنیا کو کرنا ہے۔ ہر ملک کے اعلیٰ خیال رکھنے والے اشخاص اور سیاست دان مدبرین اس ام الخبائث کے آیندہ خطرات سے باخبر ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ وہ مرض ہے جو کہ مخفی طور سے اپنا زہر انسانی زندگی کے رگ و پے میں پھیلا رہا ہے ۔

امریکہ تو اس مسئلہ سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے کم از کم چند سال کے لیے اس کو بالکلیہ ممنوع قرار دیدیا۔ ۱۹۱۴ء میں بزمانہ جنگ عظیم جب دیکھا گیا کہ انگریز نوجوانوں کی ایک تعداد استعمال منشیات کی وجہ سے لڑائی کے وقت پوری طور سے اپنے فرائض ادا نہ کرسکی تو ولایت میں

مسکرات کے متعلق ایک رائل کمیشن کا انعقاد عمل میں آیا تھا جس کے تجاویز کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ انگلستان نے اب تہیہ کرلیا ہے کہ وہ اپنی قوم میں پرہیزگاری کے عنصر کو روز بروز بڑھاتا جائیگا۔ ترک مسکرات کے لئے جد وجہد کی غرض سے دنیا کی تقریباً ساٹھ قومیں متحد ہوچکی ہیں۔ اور اب یہ مسئلہ "لیگ آف نیشنس" یعنی جمعیت اقوام کی عملی اسکیموں کی فہرست میں شامل کردیا گیا ہے۔ برٹش انڈیا میں بھی شائد ہی کوئی صوبہ ایسا ہوا جس نے ترک مسکرات کے مسئلہ میں دلچسپی نہ لی ہو۔ ریاست حیدرآباد بھی اس جد وجہد میں کسی حکومت سے پیچھے نہیں ہے چنانچہ حضرت اقدس واعلیٰ کے ایک فرمان مبارک کی بناء پر بلدہ میں "مرکزی انجمن ترک مسکرات" کی تشکیل عمل میں آئی ہے جس کو اختیار رہے کہ اپنی شاخیں تمام ممالک محروسہ میں قائم کرے۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ہمارے رحمدل فرمانروا کی ہمدردانہ توجہات ہمایوں رعایا کی فلاح وبہبود کے ہر معاملہ میں کس طرح مبذول رہتی ہیں۔ اب ہم اپنے اساتذہ اور پروفیسر صاحبان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس پاک مقصد کے لئے ہمارے ساتھ متحد ہوجائیں جس کا بیحد تعلق ہماری آیندہ نسلوں کی تعلیم وتربیت سے ہے ان لوگوں کے تجربات سے جو سابق میں اس مقصد کے لیے کام کرتے رہے ہیں معلوم ہوا ہے کہ ہمکو ایسے لوگوں پر زیادہ روپیہ وقت اور محنت صرف کرنے سے چنداں فائدہ نہیں ہے جو کہ شراب نوشی کے تمام عمر سے عادی ہوچکے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اس مسئلہ کے حل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ نئی پود کو سنبھالا جائے اور اس میں ترک مسکرات کی ذہنیت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ وہ آیندہ ان تمام شیطانی قوتوں اور ناپاک ترغیبوں کا مقابلہ کرنے کے لئے جو ان کو برائی کی طرف کھینچتی ہیں اچھی طرح تیار رہیں ہمنے خود حیدرآباد میں بہت سی سیندھی وشراب کی دکانوں کا معائنہ کیا ہے جہاں ہمنے بہت سے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو پایا۔ ہم اپنے نوجوانوں کو اس لڑائی کے لیے نہایت قوی ہتیاروں سے مسلح کرنا چاہتے ہیں جس کے لئے اس علم سے بڑھکر کوئی ہتیار قوی نہیں ہے جس علم سے ان تباہ کن اثرات سے آگاہی ہوجاتی ہے جو استعمال مسکرات کی وجہ سے صحت۔ خوشحالی اور فلاح وبہبود پر پڑتے ہیں۔ لاعلمی کی وجہ سے شراب خوری کی عادتوں کا وہ آسانی سے شکار بن جاتے ہیں۔ ایسی معلومات سے مسلح رہنے کے بعد وہ یقیناً بہتر طور پر مقابلہ کرسکیں گے کوشش کرکے اگر ہماری دوسری نسل بہ نسبت موجودہ کے منشیات سے زیادہ پرہیز کرنے لگے تو تیسری نسل اس سے زیادہ اچھی ہوسکتی ہے اور بالآخر ہمارے لوگ ایسے بن جاویں گے کہ سمجھداری کے ساتھ ان کو منشیات سے نفرت ہوجاوے گی۔ بہرین

ہندوستان میں ہمکو اس معاملہ میں مذہب سے بڑی مدد ملتی ہے۔ ہمیں اپنی سوسائٹی کو اس کے خیالات کے بموجب ابھارنا ہے۔ سوسائٹی کا کوڑا بہت سخت ہوا کرتا ہے استعمال منکرات کی عادت بطور واقعہ عام طور پر دس اور بیس سال کی عمر کے درمیان ہی پڑتی ہے۔ جب کہ تمام قسم کی امنگیں اور خواہشات دل میں موجزن ہوتی ہیں۔ اور اس زمانہ میں دل اطراف واکناف کی فضا کے تاثرات کو قبول کرنے کے لیے نہایت آسانی سے تیار رہتا ہے۔ قبل اس کے کہ مرض بڑھے ہم اس کا گلا گھوٹنا چاہتے ہیں جن لوگوں کی پرورش اور پرداخت پرہیزگاری کی فضا میں ابتدا سے ہوی ہے وہ شاذ و نادر ہی پینا سیکھتے ہیں لہذا مستقل اور زیادہ پائیدار نتائج حاصل کرنے نیز دقت۔ روپیہ اور قوتوں کا کفایت شعارانہ استعمال کرنے کی غرض سے ہم نے یہ تصفیہ کیا ہے کہ ہم زیادہ تر توجہ اپنے نوجوان آدمیوں کی طرف کریں۔ ایسا کرنے کے معنی اسی قدر ہیں کہ ہم مستقبل و نصب العین کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ ریاست حیدرآباد کی یہ نوجوان حیدرآبادی دو جماعتوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے ایک وہ جو مدرسہ جاتی ہے۔ دوسرے وہ جو مدرسہ نہیں جاتی۔ اول الذکر کی صورت یہ ہے کہ اس ریاست میں اس وقت ۴۷۳۶ سرکاری اور ۹۴۳ خانگی جملہ ۵۶۷۹ مدارس ہیں جن میں ابتدائی تحتانی و ثانوی سب شامل ہیں۔ ان میں طلباء کی تعداد ۳۷۸۶۵۸ ہے۔ اگر ان میں ہم اپنے کالج کے طلباء شامل کردیں تو طلباء کی مجموعی تعداد ۳۸۰۰۰۰ کے قریب ہوجائے گی۔ لہذا ہماری موجودہ اپیل وصدا کا تعلق کچھ کم چار لاکھ لڑکوں اور لڑکیوں کی تربیت سے ہے جو کہ تسلیم شدہ مدارس میں اس وقت تعلیم پا رہے ہیں ہم علم کا واسطہ دیکر جو آپ کے دل سے قریب اور آپ کو نہایت عزیز ہے آپ سے اپیل کرتے ہیں کہ موجودہ صورت حال پر جو کہ متذکرہ صدر اعداد سے ظاہر کی گئی ہے غور فرمائیں۔ اور اس کی کوشش فرمائیں کہ ہمارے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں پینے کے خراب اثرات سے نہ صرف الگ رہیں بلکہ اسکی نسبت سمجھ کر رائے قائم کرسکیں۔ اب رہ گیا یہ امر کہ اس کی نسبت آپ کیا کرسکتے ہم جانتے ہیں کہ بحیثیت اساتذہ طریقوں کے اختیار کرنے کے معاملہ میں ہم سے زیادہ آپ واقف ہیں۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ آپ اپنے عمل سے اپنی نصیحتوں سے اور اپنے قول و فعل سے (کلاس میں یا کھیل کے میدان میں) شراب نوشی کے متعلق انتہائی تنفر کا اظہار کرکے اور اپنی منظم تقاریر کے ذریعہ سے طالب علموں کے دلوں میں ایسے خیالات پیدا کرسکتے ہیں جن سے ترک مسکرات کے متعلق ان میں وہ ذہنیت پیدا ہوجائے جنکا

پیدا کرنا ہمارا مقصد ہے ہم تقاریر کا بھی انتظام کریں گے اور اس غرض سے ہمارے آدمی حفظان صحت، صفائی اور ترک مسکرات کے متعلق تمام ضروری معلومات کے ساتھ ان لوگوں کے پاس جانے کی کوشش کریں گے۔ ان کی کوششوں میں اور طلباء کو لکچر دینے میں آپ ان کو مدد دے سکتے ہیں۔ فن تعلیم کے تمام ماہرین کی یہ قطعی رائے ہے کہ جوان لڑکوں کے بیکار وقت اور قوت کو کام میں لگانے کے لئے کھیل کے میدان میں ان کو رجوع کرنا غیر صحت بخش فضا سے بچانے کا بہترین طریقہ ہے۔ ہم کو معلوم ہے کہ جو طلباء مدرسوں میں شریک ہیں ان کے متعلق تو آپ کا محکمہ اپنی انتہائی کوشش کر رہا ہے۔ ہماری رائے تو یہ ہے کہ جس طرح سے مدرسہ میں روزانہ حاضری کا رجسٹر رکھا جاتا ہے آپ کھیل کے میدان میں شرکت کا روزانہ حاضری کا رجسٹر رکھیے۔ کسی نہ کسی میں وہ ضرور شریک رہیں اور ان کی حاضری کے صلہ میں نمبر و نشان دئے جایا کریں جن کا لحاظ آخری امتحان کے نتیجہ پر کیا جائے۔ ہم نے اپنے دفتر میں ترک مسکرات کا ایک چھوٹا سا کتب خانہ کھولا ہے جو کہ ممکن ہے کہ بڑھ کر کسی زمانہ میں ترک مسکرات کا اول درجہ کا کتب خانہ بن جائے جس میں تمام دنیا کا لٹریچر متعلق ترک مسکرات پایا جائے۔ مضمون نویسی کے مشق کے لیے جو مضامین آپ اپنے لڑکوں کو دیں۔ ان میں ترک مسکرات اور اس کے متعلقہ مضامین بھی شامل کر لیجیے اور لڑکوں سے کہیے کہ اپنے مضامین کا مواد ہمارے کتب خانہ سے آ کر لیں۔ خود اپنے اسکول و کالج کے کتب خانہ کے لئے آپ مسکرات کے متعلق رسالے منگوا سکتے ہیں جس سے اس مسئلہ پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اب رہ گیا نوجوانوں کا وہ طبقہ جو مدرسوں میں شریک نہیں ہے ۱۹۳۱ء کی رپورٹ مردم شماری سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس ریاست کی کل آبادی میں ۵ فی صدی ایسے لڑکے ہیں جو اسکول میں جانے والی عمر کے کہے جا سکتے ہیں جس حساب سے ۲۱۶۳۰۷ لڑکے اور لڑکیاں اس ریاست میں اسکول جانے والی عمر کے ہیں۔ اس میں سے اگر ہم وہ تعداد منہا کر دیں جو اسکولوں میں اس وقت شریک ہے تو ۱۷۰۵۰۷ لڑکے لڑکیاں ایسے بچتے ہیں جو کسی اسکول میں تعلیم نہیں پا رہے ہیں یہ طبقہ زیادہ تر جاہل لڑکوں کا ہے۔ اور ان میں نصف سے زیادہ لڑکیاں ہیں۔ ان کے لئے ہم مخصوص طریقے اختیار کریں گے جن کا ذکر اس سلسلہ میں کرنا بے محل ہوگا۔ کیونکہ ہماری موجودہ اپیل اور التجا تو صرف اساتذہ و پروفیسر صاحبان سے ہے لیکن ایک بات کا ذکر کر دینا مفید ہوگا۔ ان نوجوانوں کے لیے جو مدرسہ نہیں جاتے۔ ہم کوشش کریں گے کہ جس قدر زیادہ ہو سکیں

کھیل کے مرکز قائم کئے جائیں۔ مدرسہ جانے والے لڑکے جن کے مکانات دور ہونے کی وجہ سے وہ کے کھیل کے میدان تک نہیں پہنچ سکتے ان سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہمارے انتظامات سے مستفید ہوں۔
جو کچھ ہم نے اوپر لکھا ہے۔ اسے یہ نہ سمجھا جائے کہ استعمال منشیات کے دیگر مسائل اور خرابیوں پر ہم کوئی توجہ نہیں کر رہے ہیں۔ ہم کو خوب معلوم ہے کہ ان ماحول و مقامات میں جہاں اس کی تجارت ہوتی ہے۔ اصلاح کی کس قدر گنجائش ہے۔ ان قواعد وضوابط و قوانین کو جو کہ ترقی یافتہ ممالک نے منشیات کی تجارت کے متعلق اپنے ممالک میں نافذ کئے ہیں ان کے نافذ کرنے کی ضروریات کو ہم سمجھتے ہیں۔ ہم کو معلوم ہے کہ استعمال منشیات کو قواعد استعمال سڑک سے کہاں تک تعلق ہے۔
ان تمام امور پر ہماری نگاہ ہے۔ لیکن اس وقت ہماری اپیل والتجا خاصکر اساتذہ و پروفیسر صاحبان سے ہے۔ ہم پھر اس تعلیم کا آپ کو واسطہ دیکر آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ اس مسئلہ پر بغور کامل توجہ فرمائیں اور ہماری کوششوں میں ہمارے ساتھ ہر ممکنہ طریقہ سے شریک رہیں۔ ہمارا ارادہ ہے کہ انجمن ترک مسکرات کی شاخیں تمام ممالک محروسہ سرکار عالی میں کھولی جائیں خدا کرے ہماری یہ کمزور ندا اس ریاست ابد مدت کے ہر درس گاہ کے گوشہ میں خواہ دور ہو یا نزدیک امدادی ہو یا غیر امدادی خانگی ہو یا سرکاری غرض ہر درسگاہ تک پہنچ جاوے اور ہر استاد و پروفیسر کو ہمارے اس ضروری ندا پر بیدار کردے۔ آمین۔

شرح دستخط

عالیجناب نواب مرزا یار جنگ بہادر (صدر نشین)
دیوان بہادر ارموآینگار صاحب (نائب " ")
نواب بہادر یار جنگ بہادر
راجہ بہادر وینکٹ راما ریڈی۔
سی۔ سی۔ پال

ہندوستانی مدارس میں تاریخ ہند کی تعلیم[1]

از

ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب پروفیسر کلیہ جامعہ عثمانیہ

اس زمانے کے ایک مشہور فلسفی مورخ کا خیال ہے کہ ماضی کی تاریخ بڑی حد تک حال کی تاریخ سے عبارت ہوتی ہے۔ اسی خیال کو ہمارے الہامی شاعر غالب نے کس خوبی اور لطف سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے :۔

بجام و آئینہ حرف جم و سکندر چیست
کہ ہر چہ رفت بہر عہد در زمانہ تست

یہ تاریخی حقایق کو سمجھنے کا خالص موضوعی نقطۂ نظر ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ تاریخ کی حیثیت محض آرٹ کی رہ جاتی ہے جسے معروضی حقائق سے زیادہ ذہن انسانی کی کارفرمائی سے تعلق ہے لیکن کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ معروضی حقایق کی طرف سے آنکھ بند کر کے تاریخ کو افسانوی حیثیت دے دی جائے۔ دراصل تاریخ کی تحقیق میں موضوعی اور معروضی دونوں طریقے استعمال ہونے چاہئیں۔ جس طرح ماضی حال سے بالکل علحدہ نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے اندر مضمر رہتا ہے اسی طرح مورخ مجرد حقایق کا تصور بغیر اپنی ذہنی کیفیات کے دخل کے نہیں کر سکتا لیکن باوجود آرٹ ہونے کے تاریخ بعض اٹل قوانین کی پابند ہوتی ہے۔ وہ قوانین ویسے ہی اٹل ہوتے ہیں جیسے طبیعات کے قوانین۔ چونکہ تاریخ کا موضوع بحث انسانی اجتماعی زندگی کا نشیب و فراز ہے اس واسطے اس کے قوانین بھی انسانی اور اخلاقی حیثیت رکھتے ہیں۔ قوموں کا عروج و زوال بعض گروہوں کا ابھرنا اور بڑھنا اور دوسروں کا گرنا اور گھٹنا ایسے اجتماعی مظاہر ہیں جن کی توجیہ اخلاقی قوانین کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ کیا یہ یوں ہی بغیر کسی سبب کے ہے کہ بعض اقوام کو تمدن کی سربراہی اور سرفرازی ملتی ہے اور دوسرے ان کا تتبع کرنے پر مجبور ہوتے ہیں؟ نہیں، ان اجتماعی مظاہر کے

[1] یہ تقریر انجمن کی دسویں سالانہ کانفرنس کے موقع پر کی گئی۔

قوانین ہونے چاہئیں اور ہیں۔ مورخ کا فرض ہے کہ ان کی تحقیق کرے اور انھیں اجاگر کرے۔ موضوعی اور استخراجی طریق تحقیق کے یہ معنی ہرگز نہ سمجھے جائیں کہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ جس طرح چاہے واقعات کی توجیہ کرے۔ اس کے لئے بھی بعض کلیات کی پابندی ضروری ہوگی ورنہ ذہنی مزاج کا خطرہ ہے۔

واقعات کی توجیہ اور ان کی چھان بین نہایت مشکل کام ہے جس کے لئے خاص سلیقہ کی ضرورت ہے۔ مورخ کو اس میں بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ وہ واقعات کے انبار میں سے کیا چنے اور کیا چھوڑے اور کس واقعہ کو زیادہ اہمیت دے اور کس کو کم۔ بالخصوص ہندوستان جیسے ملک کی تاریخ میں یہ کام اور زیادہ دشوار ہو جاتا ہے اس لئے کہ یہاں کی تاریخ مختلف نسلوں، قبیلوں، مذہبوں اور تہذیبوں کے باہمی تصادم و تعاون کا نتیجہ ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تاریخ ہند میں اہم اور غیر اہم کا فیصلہ کس اصول پر کریں؟ ظاہر ہے کہ اس اصول کے انتخاب میں مورخ کی ذاتی رائے اور اس کے ذہنی رجحان کا رنگ غالب آجائے گا۔ ہمارے نزدیک اشخاص کو زیادہ اہمیت حاصل ہونی چاہئے یا مجرد واقعات کو؟ یہ سوال بھی بہت مشکل ہے۔ تاریخ ہند کا ہر محقق جانتا ہے کہ اس ملک کے نشوونما میں بادشاہوں، سرداروں، مدبروں اور رہنماؤں سب ہی نے حصہ لیا ہے۔ اس لئے مجرد واقعات کو بغیر اشخاص کے حالات معلوم کئے سمجھنا ناممکن ہے۔ تاریخی واقعات اشخاص ہی کی تخلیقی کوششوں سے پیدا ہوتے ہیں، انھیں کی مساعی سے زمانہ کی رفتار بدلتی ہے اور اجتماعی جسم میں اشخاص ہی کا نفس گرم زندگی کی نئی روح پھونکتا ہے۔ میں روح عصر کا منکر نہیں جو اشخاص کو اپنے مقاصد کا آلۂ کار بناتی ہے لیکن اس کے تسلیم کرنے سے خود اشخاص کی اہمیت مورخ کے لئے کسی طرح بھی کم نہیں ہو جاتی۔ اشخاص تاریخ میں نشان منزل کا کام دیتے ہیں۔ بغیر ان کے تاریخی واقعات کا انبار طالب علم کے لئے بے معنی چیز ہے۔

بعض اوقات جماعتیں اور گروہ اپنے مخصوص مفاد کے تحفظ کے لئے غلط واقعات کو حقائق تسلیم کر کے ان کی توجیہ سے اپنی اغراض وابستہ کر لیتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل ہمارے مدارس میں انگریزوں کی لکھی ہوئی تاریخیں پڑھائی جاتی تھیں جو حکمران طبقہ کے مخصوص نقطۂ نظر سے لکھی گئی تھیں مثلاً ہماری تاریخوں میں "کلکتہ کی کالی کوٹھری" کا واقعہ عام طور پر ملتا ہے۔ جدید معروضی تحقیق نے پورے طور پر ثابت کر دیا ہے کہ یہ واقعہ غلط ہے۔ لیکن ابتدائی انگریزی استعماریت کو اس ملک

میں اپنی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے اس قسم کے افسانوں کو باور کرانا اور ان کی نشر و اشاعت کرنا ضروری تھا تاکہ ہندوستان آنے والے انگریزوں کی قومی عصبیت کمزور نہ ہونے پائے۔ اسی طرح انگریزوں کی لکھی ہوئی تاریخوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کی کشیدگی کو بہ نسبت ہم آہنگی کے زیادہ اجاگر کرکے دکھایا گیا ہے۔ یہ بات بھی محض اتفاقیہ نہیں ہے بلکہ اس کی تہ میں شہنشاہی مقاصد کام کر رہے ہیں۔ غرض کہ تاریخ ہند میں ان سب باتوں نے اس لئے راہ پائی کہ معروضی حقائق سے دیدہ و دانستہ چشم پوشی کی گئی اور رائے یا خواہش کو حقیقت سمجھ لیا گیا۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ تاریخ ہند لکھنے والے کو، دنیا کے کسی دوسرے ملک کی تاریخ لکھنے والے کی طرح، یہ دشواری پیش آتی ہے کہ ایک واقعہ کی اس کو مختلف شہادتیں ملتی ہیں جو آپس میں متضاد ہوتی ہیں۔ اس وقت اس کا یہ فرض ہے کہ نہایت دیانت داری کے ساتھ چھان بین سے کام لے اور عام حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے حتی المقدور معروضی حقایق کی بنا پر اپنے نتائج اخذ کرے تاریخ کا بہترین طریقۂ تحقیق وہ ہے جس میں معروضی اور موضوعی دونوں طریقوں سے کام لیا گیا ہو۔ جس طرح موضوعی تاریخ میں خیالی واقعات کے راہ پانے کا اندیشہ ہے وہاں معروضی تاریخ میں یہ خطرہ مضمر رہتا ہے کہ خشک اور ایک دوسرے سے بے تعلق واقعات ساری بحث کو بے معنی نہ بنا دیں جس میں زندگی کا ربط و اتحاد نام کو نہ ہو۔ بلاشبہ تاریخ کی بنیاد معروضی حقایق ہیں جو عالم وجود میں آچکے ہیں لیکن ان کی تاویل و توجیہ میں موضوعی طریقۂ تحقیق سے کام لئے بغیر چارہ نہیں انسانی حقایق کو اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے جب کہ انھیں کسی نقطۂ نظر سے خاص تصورات کے تحت سمجھنے کی کوشش کی جائے یا یوں کہئے کہ تاریخ میں کوئی نہ کوئی انسانی مقصد پوشیدہ رہنا چاہیئے۔

بدقسمتی سے ہمارے مدارس میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں وہ زیادہ تر واقعات و سنین کا ایک بے ربط انبار ہوتی ہیں۔ ان میں کوئی مقصد نہیں ہوتا طالب علم ہر واقعہ کو اس کے پس منظر سے علحدہ کرکے اپنے تصور میں جگہ دیتا ہے۔ استاد کا فرض ہے کہ وہ بتائے کہ اجتماعی زندگی کے مختلف واقعات میں ایک طرح کا ربط پنہانی پایا جاتا ہے۔ ان کے اسباب و علل پر اگر غور کیا جائے تو وہ سب ایک زنجیر کی کڑیاں نظر آئیں گی۔ انھیں واقعات کے تار پود سے جسد قومی

کی تشکیل عمل میں آتی ہے۔ انھیں ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم اپنی زندگی میں زخنوں کو راہ دے رہے ہیں۔

تاریخ ہند کی ہندو، مسلم اور برطانوی عہدوں میں جو تقسیم کی گئی ہے وہ جدید تاریخی نقطۂ نظر سے صحیح نہیں۔ اس کے بجائے قدیم، متوسط اور عہد جدید کی تقسیم بہتر ہے تاکہ طالب علم کے ذہن میں زمانے کا تصور فرقہ وارانہ یا نسلی تعصب کے ساتھ نہ پیدا ہو۔ زمانے کی ادوار میں تقسیم مورخ کی خود اختیاری ہوتی ہے اس واسطے کہ قطعی تقسیم تو محال ہے۔ مثلاً آپ کوئی لمحہ یا تاریخ ایسی نہیں بتا سکتے جس وقت سے کہ ہندوستان میں انگریزی راج شروع ہوا۔ بالعموم ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی یا ۱۷۶۴ء کی جنگ بکسر کے بعد سے برطانوی عہد کو شروع کرتے ہیں۔ حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ یہ دونوں متذکرہ بالا تاریخی واقعات اس تاریخی رجحان کے مظاہر ہیں جو بہت پہلے سے ہندوستان میں موجود تھا اور جو ان واقعات کے بعد سے زیادہ شدید اور قوی ہوگیا۔ اس طرح اسلامی عہد کی تاریخ کا آغاز محمود غزنوی کے حملوں سے ہونا چاہئیے یا ۱۲۰۶ء سے جب کہ قطب الدین ایبک نے دہلی میں ایک مرکزی حکومت کی بنا ڈالی اور اسلامی ہند کی سیاست کو عملی حیثیت سے بیرونی اثرات سے آزاد کرالیا۔ بہرحال زمانے کی تقسیم سے مطالعہ میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے اس واسطے کہ ماضی کی گرفت کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ یہ کہ اس کے ٹکڑے کر دیے جائیں۔ ازمنۂ وسطیٰ کا نام سنتے ہی ہمارے ذہن میں معاً ایک ایسا جامع تصور آجاتا ہے جو اس زمانہ کی پوری حیات اجتماعی پر حاوی ہوتا ہے۔ جاگیرداری، کلیسا اور تمدن و معاشرت کی ایک جیتی جاگتی تصویر زندگی کے سارے خط و خال کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ادوار کی تقسیم دراصل تاریخ میں نشان منزل کی حیثیت رکھتی ہے۔ زندگی میں یکایک تغیرات پیدا نہیں ہوتے ہاں، اہم رجحانات پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کی نشان دہی طالب علم کو کرانا ضروری ہے تاکہ وہ واقعات کے تانے بانے کا کھوج لگا سکے۔ جس طرح انفرادی تجربات کے نقوش انسان کے حافظہ میں محفوظ رہتے ہیں اسی طرح اجتماعی اعمال کے نقوش زمانے کے موقلم سے قرطاس تاریخ پر بنائے جاتے ہیں۔ ایک طرف اجتماعی زندگی کے رجحان اور دوسری طرف اشخاص کی قوت ارادی کی کارفرمائی ان نقوش کے لئے رنگ و روغن کا کام دیتے ہیں۔

ہر زمانے کی تاریخ نویس کا ایک مخصوص انداز ہوتا ہے۔ آجکل تاریخ کا مطمح نظر محلات کی سازشوں جانشینی کے جھگڑوں اور لشکروں کی نقل و حرکت کی تفصیلات کے ماسوا اور بھی کچھ ہے، اب لشکرگاہوں کی شان و شوکت سے زیادہ عوام الناس کی زندگی کی طرف مورخ توجہ کرتا ہے اس لئے کہ اسے سمجھے بغیر کسی گروہ کی سیاست، معاشرت یا اقتصادی نظام کا آپ پتہ نہیں لگا سکتے۔ تاریخ ہند میں بھی اس کی سخت ضرورت ہے کہ قومی نظم و تربیت اور تہذیب و تمدن کو بہ نسبت حملوں اور لشکر کشیوں کے زیادہ اہمیت دی جائے۔ در اصل اس وقت ہم تاریخ کو جس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ چند صدی قبل کا مورخ اس نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ ہمارے اخلاقی اور ذہنی معیار بہت کچھ بدل گئے ہیں۔ ہم اگلے زمانے کے تاریخ نویسوں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ بہت ہی معمولی اور جزوی باتوں پر تو صفحے کے صفحے سیاہ کر ڈالتے ہیں لیکن اپنے زمانے کے طور طریقوں، صنائع اور فنون اور تمدن و معاشرت کے متعلق کچھ نہیں لکھتے۔ لیکن اگر ہم غور کریں تو معلوم ہو کہ ہم جن واقعات کی تفصیل کی پرانے مورخوں سے توقع کرتے ہیں وہ بیجا ہے۔ در اصل ہماری یہ توقع عکس ہے ہماری اپنی زندگی کا ہمارے زمانے میں اجتماعی زندگی نے انفرادی زندگی پر بہت زیادہ اہمیت حاصل کر لی ہے۔ آج معاشرہ کو خود اپنے وجود کا احساس ہو گیا ہے۔ آج کسی ایک فرد کی زندگی، چاہے وہ فرد کتنا ہی ذی مرتبہ کیوں نہ ہو قومی تاریخ سے عبارت نہیں ہو سکتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ قومی تاریخ کے کسی ایک گوشہ کو وہ اجاگر کر سکتی ہے۔

ہمارے مدارس کی مروجہ تاریخوں میں تصادم اور جنگوں کا اس کثرت سے ذکر ہوتا ہے کہ طالب علم کے ذہن و حافظہ میں سوائے ان کے اور کوئی نقوش مشکل ہی سے باقی رہ سکتے ہیں۔ ہماری تاریخوں سے بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتے رہے۔ امن کے مشاغل گویا اس ملک میں کبھی پنپے ہی نہیں۔ لیکن یہ سراسر غلط ہے۔ جنگ اگرچہ ایک تلخ اور ناگزیر حقیقت ہے لیکن تاریخ صرف اسی سے عبارت نہیں ہو سکتی۔ بالخصوص ہندوستان کی عہد وسطیٰ کی تاریخ میں سوائے جنگوں کے اور کچھ طالب علم کو بتایا ہی نہیں جاتا۔ بلاشبہ مسلمانوں نے ہندوستان میں فتوحات حاصل کیں۔ لیکن اس کے ساتھ انھوں نے اس ملک کو اپنا وطن بنایا۔ اس کی خاطر اپنا خون بہایا۔ اس ملک کے عام نراج میں ایک مستحکم مرکزی حکومت قایم کی۔ یہ سب حال ہیں

مروجہ تاریخوں میں نہیں ملتا۔ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اشوک اعظم کے بعد مسلمانوں
ہی کی بدولت ہندوستان کو سیاسی وحدت نصیب ہوئی۔ انھوں نے یہاں ایک بین ہندی تمدن
کی بنا ڈالی اور ایک بین ہندی زبان نے انھیں کے آغوش میں نشو ونما پائی جو آج ہماری قومی زبان
کہلاتی ہے۔ نظم ونسق اور فنون وصنائع کے ہر شعبہ میں ان کی وجہ سے ترقی ہوئی۔ ان کی بدولت
اس ملک کی اجتماعی زندگی کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا اور ہندوستان دنیا کے اہل علم وکمال کا مرکز
بن گیا۔ انھیں کے توسط سے ہندوستان نے دنیا کے اور دوسرے ملکوں کے ساتھ روابط استوار
کئے۔ یہ سب باتیں ہمارے طالب علم کو معلوم ہونی چاہئیں لیکن ہماری تاریخوں میں ان کا ذکر
بالکل نہیں ملتا اور اگر ملتا ہے تو نہایت اجمال سے۔

میں نے ابھی اس امر کی طرف اشارہ کیا تھا کہ ہماری تاریخ ایک بے مقصد تاریخ ہے
اس بے مقصدی کی وجہ سے ہماری تاریخ کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی اکھڑی اکھڑی باتیں کرے
جن میں کوئی ربط نہ ہو اور یہ بھی پتہ نہ چلے کہ آخر گفتگو کرنے والا کہنا کیا چاہتا ہے۔ یورپ کے
مدارس میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں ان میں کوئی نہ کوئی اجتماعی مقصد ضرور پیش نظر رکھا جاتا
ہے۔ تاریخ کی ذریعہ سے ہوشمند مملکتیں اپنی آئندہ نسلوں کو قومی ذمہ داریوں کے لئے تیار کرتی ہیں
اگر حقایق کو پس پشت نہ ڈالا جائے تو میرے خیال میں اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ آپ اپنے
نوجوانوں کے سامنے قومی ضروریات اور مصالح کے تحت ایک خاص مطمح نظر پیش کریں۔ دراصل
ہمارے ملک کی تاریخ میں متحدہ قومیت کا تخیل پیش کرنا مورخ کے لئے بہت ضروری ہے۔ اتحاد و
یکجہتی کے جو رجحان ہماری ازمنہ وسطیٰ اور زمانہ حال کی تاریخ میں ملتے ہیں ان کو اجاگر کرکے دکھانا
چاہیئے۔ لیکن یہ کام نہایت دشوار ہے اور اس کے لئے بڑے سلیقہ کی ضرورت ہے۔ تاریخ کا کام
یہ نہیں کہ وہ کسی خاص مسلک یا نقطۂ نظر کا پروپگنڈا کرے۔ اپنے خیال کو پیش کرنے میں اس لئے
مورخ کو بڑی احتیاط لازم ہے۔ جتنی زیادہ اس کی نظر وسیع ہوگی اتنا ہی اس کو اس کا سلیقہ حاصل
ہوگا کہ وہ تعمیری تصورات کو جو قومی زندگی کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور اس کو فروغ
دینے میں ممد ومعاون ہوتے ہیں، نوجوانوں کے سامنے پیش کرسکے۔

ہندوستان کی تاریخ میں مرکز پسند اور مرکز گریز قوتوں کا تفاعل ایک خاص اہمیت رکھتا

ہے۔ یہ دونوں قوتیں ہماری اجتماعی زندگی میں شروع سے آج تک برابر کار فرما رہی ہیں اور دونوں کے پیش نظر بعض نہایت اہم مقاصد رہے ہیں۔ ان قوتوں کی توجیہ کے ذریعہ ہم بعض نہایت پیچیدہ تاریخی مسائل کو علمی حیثیت سے سلجھا سکتے ہیں۔ مثلاً اشوک اعظم کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے سیاسی حیثیت سے مرکز گریز قوتوں کو کمزور کر کے سارے ہندوستان کو سیاسی وحدت میں منسلک کیا اور اس کے ساتھ بدھ مت کے ذریعہ مذہب و معاشرت کی مرکز گریز قوتوں کا خاتمہ کیا۔ معاشری اعتبار سے برہمنیت ایک مرکز گریز قوت ہے اس لئے کہ وہ معاشرہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی ہے۔ اور ذاتوں میں اس کو تقسیم کر دیتی ہے۔ بدھ مت کے انسانی مساوات کے اصول کو ہم مرکز پسند قوت سے تعبیر کریں گے۔ مسلمانوں کے زمانے میں سیاسی حیثیت سے مرکز پسند قوتوں کو فروغ حاصل ہوا لیکن چونکہ انھوں نے اس ملک کے لوگوں کے مذہبی و معاشری معاملات میں دخل اندازی نہیں کی اس لئے معاشری اعتبار سے مرکز گریز قوتوں کو نشو و نما پانے کا پورا موقع ملا۔ کم و بیش ہمارے عہد جدید کی تاریخ میں بھی آپ یہی حالت پائیں گے۔ اگرچہ مسلمانوں کے زمانہ میں ہندو سماج میں بعض ایسی معاشری تحریکیں وجود میں آئیں جو سماج میں ہم آہنگی قایم کرنا چاہتی تھیں لیکن پورے طور پر انھیں کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

تاریخ ہند میں آپ نے اکثر پڑھا ہوگا کہ اورنگ زیب اچھا حکمراں نہیں تھا یا یہ کہ سیواجی اچھا شخص تھا یا برا حکمراں تھا۔ لیکن اس قسم کی رائے کا اظہار میرے خیال میں ذہنی تنگ نظری پر دلالت کرتا ہے۔ ہم اپنی رائے کے اظہار میں اکثر اپنے تعصب کو راہ دے دیتے ہیں۔ اس خصوص میں اگر ہم واقعات کا علمی تجزیہ کریں تو دیکھیں گے کہ ہماری قومی زندگی کی وسعت اورنگ زیب اور سیواجی، دونوں کو امتیازی اور موزوں جگہ دینے کو تیار ہے۔ اورنگ زیب نے سوائے اس کے کیا کیا کہ اس نے سارے ہندوستان کو ایک سیاسی وحدت کے تحت لانے کے لئے اپنی پوری عمر صرف کر دی۔ وہ ہندوستان کی اجتماعی زندگی کے اس پرانے مرض کا علاج کرنا چاہتا تھا جس کی وجہ سے ہمارے ملک کو صدیوں دوسروں کی غلامی برداشت کرنی پڑی۔ ہندوستان کو وہ اسی قدر اپنا وطن سمجھتا تھا جتنا کہ کوئی دوسرا سمجھ سکتا ہے۔ اس کی سرحدی حکمت عملی کا اگر مطالعہ کیا جائے تو بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اس نے ہندوستان کی حفاظت کے لئے جو تدابیر اختیار کیں

وہ کس قدر دور اندیشی پر مبنی تھیں۔ اس نے یوسف زئیوں کی بغاوت کو اس سختی سے فرو کیا جس طرح وہ دکن کی مرکز گریز مرہٹہ قوت کے ساتھ پیش آیا۔ اس باب میں اس نے ہندو اور مسلمان کا کوئی فرق نہیں کیا۔

جغرافی حیثیت سے ہمارے ملک کے لئے یہ مقدر ہو چکا ہے کہ ہم ایک سیاسی وحدت کے سایہ میں زندگی بسر کریں۔ ہماری تاریخ میں عروج کا زمانہ وہی ہوا ہے جبکہ ایک سیاسی مرکزی نظام ملک کے مختلف گوشوں میں یکسانیت کے ساتھ موثر ہوا۔ اس اعتبار سے اورنگ زیب کو ہماری تاریخ میں وہی رتبہ ملنا چاہیئے جس کا وہ مستحق ہے۔ اگر ہم تاریخی شواہد کی روشنی میں اس کی سیرت کے خط و خال کو دیکھیں تو صاف طور پر معلوم ہو جائے گا کہ اس پر تعصب کا الزام ایک غلط اور بے بنیاد اتہام ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو مملکت کے ساتھ اپنی زندگی کو وابستہ کر لیتے ہیں اور اس کے مفاد کی راہ میں جو روڑا آئے اسے بلا تامل ہٹا دیتے ہیں۔ اس میں وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ان کی راہ میں آنے والا کس مذہب سے تعلق رکھتا ہے اور نہ یہ دیکھتے ہیں کہ وہ اجنبی ہے یا قرابتدار اس نے راجپوتانہ کے راجاؤں کا مقابلہ اس طرح کیا جبکہ وہ مرکزی حکومت سے اپنا رشتہ توڑ لینا چاہتے تھے جس طرح دکن کے سلاطین کا۔ اس کے سامنے بس ایک نقطۂ نظر تھا اور وہ مملکت کے مفاد کا نقطۂ نظر تھا۔ اس کی خاطر اس نے اپنے بھائیوں اور بیٹوں کے ساتھ وہ سب کچھ کرنے میں مطلق پس و پیش نہ کیا جسے عام طور پر مروجہ اخلاق کے معیار کے خلاف تصور کیا جائے گا لیکن وہ جن کے ہاتھوں میں قوموں کی زندگی کی باگ ہوتی ہے ان کا اخلاق ایک شخصی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور ان کے نصب العین کو مروجہ معیار سے جانچنا درست نہیں۔ اس کے خطوط کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے اپنے مقاصد میں کس بلا کا انہماک تھا۔ اس کی زندگی بے لوثی اور سادگی کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کرتی ہے جس کے متعلق ہمارے نوجوانوں کو علم ہونا چاہیئے۔

اسی طرح سے سیواجی کی زندگی بھی ایک خاص مقصد کی ترجمان تھی۔ جس طرح ہماری قومی زندگی میں یہ ضروری ہے کہ سیاسی مرکزیت کا نصب العین ہمارے سامنے رہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ ہماری مقامی آزادیاں برقرار رہیں۔ سیاسی مرکزیت مشترک مفاد کے لئے ہونی چاہیئے اور اس کے ساتھ مقامی گروہوں کو اپنی زندگی کی تشکیل کی پوری آزادی ہونی چاہیئے۔ سیواجی

نے مقامی آزادی کے نصب العین کی ترجمانی کی اور مقامی خصوصیات کو برقرار رکھنے کی کوشش کی
دراصل اس ملک کا مفاد یہی ہے کہ مرکز گریز اور مرکز پسند قوتوں کے باہمی تعامل و امتزاج سے ایک
ایسی معتدل صورت حال پیدا ہو جو اس ملک کی اجتماعی زندگی کے لئے قابل قبول ہو۔ ہمارا ملک
یورپ کے ممالک کی طرح اتنا چھوٹا نہیں کہ یہاں کی مقامی خصوصیات کو پس پشت ڈالا جائے
یہ دراصل ایک براعظم ہے۔ اور باوجود اس امر کے کہ جغرافی اور تہذیبی عناصر اس ملک کے ہر گوشہ
کو ایک مرکز کے ساتھ وابستہ کرنا چاہتے ہیں لیکن مقامی خصائص قومی زندگی کے تانے بانے میں
ایسے پیوست ہیں کہ انھیں دبانا ناممکن ہے۔

تاریخ ہند کے مختلف ادوار میں جن گروہوں نے فوقیت حاصل کی اس کی توجیہ اس طرح
پر کرنا چاہیئے کہ ہماری آبادی کے مختلف عناصر میں سے کسی کو وہ ناگوار نہ گذرے۔ ہماری قومی زندگی
میں مختلف گروہوں کے توسط سے نیا خون مختلف زمانوں میں آتا رہا۔ ان گروہوں کی فوقیت
کے اسباب تاریخی قوانین کے تحت بیان ہونے چاہئیں۔ گروہوں کی فوقیت کے اسباب میں
سے ایک سبب ان کے طریق جنگ کی برتری ہوتا ہے۔ آپ قدیم زمانے سے آج تک کی تاریخ
پر ایک نظر ڈال جائیے۔ اس حقیقت کے بہت سے ثبوت آپ کو ملیں گے۔ سکندر اور پورس
کی جنگ میں اور اس طرح عہد اسلامی اور عہد جدید کی جنگوں میں آپ دیکھیں گے کہ کامیاب
گروہ کا طریق جنگ مفتوح کے طریق جنگ کے مقابلے میں اعلیٰ اور زیادہ سائنٹفک تھا۔ عہد عالیہ
اور عہد متوسط کی بعض جنگوں کی تفصیلات ہمارے پاس موجود ہیں۔ ۱۵۷۰ء میں عادل شاہیوں
اور نظام شاہیوں کی متحدہ دو لاکھ کی جمعیت نے گوآ کا محاصرہ کیا۔ یہ محاصرہ دس مہینے تک برابر جاری
رہا۔ لیکن صرف چار ہزار پرتگالیوں نے اس بڑے لشکر کی ایک نہ چلنے دی اور بالآخر اس پر
مجبور کیا کہ محاصرہ اٹھا لیا جائے۔ اس محاصرہ میں جدید فوجی نظم و انضباط کا مقابلہ قدیم طرز کی
افواج سے ہوا اور دس ماہ کی کوشش اور تعداد سپاہ کی زیادتی کے باوجود قدیم کو جدید پر کامیابی
نہیں ہوئی۔ یہ واقعہ ہمارے اس زمانے کے فرمان رواؤں کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی تھا
پرتگالی لوگ بھی انسان تھے۔ اس ملک میں اجنبی تھے اور محصور ہونے کے باوجود اپنے طریق جنگ
کی برتری کے سبب سے کامیاب رہے۔ میں اپنے مطلب کو ایک اور دوسری مثال سے

واضح کرتا ہوں۔ کرناٹک کے نواب انورالدین خاں اور فرانسیسیوں میں ۱۷۴۵ء میں جب ناچاقی پیدا ہوئی تو نواب موصوف نے اپنے بڑے لڑکے محفوظ علی خاں کی ماتحتی میں ۱۰ ہزار کا لشکر ساز وسامان سے آراستہ کرکے فرانسیسیوں کے خلاف روانہ کیا۔ فرانسیسی فوج کی تعداد بہت کم تھی لیکن باوجود اس کے اس نے نواب کی فوج کے مقابلے میں کامیابی حاصل کی اور اسے پسپا ہونے پر مجبور کیا۔ اس کامیابی سے ڈیوپلے کو چند باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ اگر یورپین فوج تھوڑی سی بھی ہو اور جدید نظم وانضباط کے اصولوں سے واقف ہو تو ہندوستانیوں کے ٹڈی دل لشکر پر بھاری رہے گی۔ اس سے بھی بڑھ کر اس نے یہ بات معلوم کی کہ اہل ہند کو اگر یورپین طریق جنگ کی مشق کرائی جائے تو کچھ عرصے میں اپنی ذہانت سے یہ لوگ خود اہل یورپ کے مثل جنگ کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ ان دونوں باتوں سے بڑھ کر اس کو یہ معلوم ہوا کہ اہل ہند کا کوئی اصول وفاداری نہیں۔ انھیں بدیسی قوت سے تعاون عمل کرکے خود اپنے اہل وطن کے خلاف تلوار اٹھانے میں کوئی باک نہیں اس پر ہمیں تعجب نہ کرنا چاہیئے کہ ایک اجنبی شخص نے ہماری نفسیاتی حالت کو ہم سے بہتر سمجھا ہماری تاریخ کا یہ وہ زمانہ ہے جبکہ زندگی کی تمام اعلیٰ قدریں نامرادی کے ہاتھوں مسمار ہو چکی تھیں۔ کسی قسم کی وفاداری کا جذبہ لوگوں کے دلوں میں باقی نہیں رہا تھا۔ ملک کے ہر گوشہ میں بدامنی اور بزاج کا دور دورہ تھا۔ زبردست کمزوروں پر ظلم کرنے اور استحصال وزیادہ ستانی میں مطلق تامل نہیں کرتے تھے۔ وفاداری کا نرم ونازک پودا وہیں نشوونما پاتا ہے جہاں عدل وانصاف کی ساز گار فضا اسے میسر آئے۔ جس مملکت میں انصاف نہیں وہاں وفاداری کی توقع کبھی پوری نہیں ہوسکتی آپ ایک ایسے شخص سے وفاداری کی کیا توقع کرسکتے ہیں جو شہری زندگی کے معمولی حقوق تک سے محروم ہو جسے آپ اپنے قریب سے گزرنے بھی نہ دیں، جسے یہ اجازت بھی نہ ہو کہ وہ اپنے لئے اس کنوے سے پانی بھرے جہاں سے آپ کے لئے پانی آتا ہے اور اگر اس کا سایہ کبھی اتفاق سے آپ پر پڑجائے تو آپ اپنے تئیں ناپاک تصور کریں۔ اسی طرح آپ کسی ایسے گروہ سے وفادار کی توقع نہیں رکھ سکتے جو بدامنی کا شکار ہو، جس کی فلاح وبہبود کا مملکت کو خیال نہ ہو اور جس کے ساتھ مملکت صرف اتنا تعلق قایم رکھنا گوارا کرے کہ اس کی گاڑھی کمائی میں سے ایک بڑا حصہ اپنے لئے حاصل کرلے۔ آپ ان لوگوں سے کیسے وفاداری کی توقع کرسکتے ہیں جن کے پسینہ کی گاڑھی

کمائی کی حفاظت کے آپ ضامن نہیں ہو سکتے۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے وقت ہمارے بدنصیب ملک کی یہی حالت تھی۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی فوجوں میں خود ہمارے اہل وطن جوق درجوق بھرتی ہوئے اور اپنے نئے آقاؤں کے لئے اپنے ملک کو فتح کیا۔

ہندوستان کی تاریخ کے یہ واقعات ہماری آئندہ نسلوں کے لئے سبق آموز ہیں۔ عہد قدیم سے آپ دیکھیں گے کہ عوام الناس نے بیرونی فاتحوں کا ساتھ اس وقت دیا جبکہ وہ اپنے ملک میں عدل و انصاف سے محروم ہو گئے۔ اسلامی سلطنت کے آغاز اور انگریزی حکومت کے ابتدائی زمانے میں یہ حقیقت نہایت واضح طور پر نظر آتی ہے۔ تاریخ کے ذریعہ ہمیں اپنے نوجوان شہریوں کو بتانا چاہیئے کہ اجتماعی نظام بغیر اخلاقی محرکات کے قایم نہیں رہ سکتا جب تک کہ مملکت اور سماج کے ساتھ عوام الناس کو جذباتی تعلق نہ پیدا ہو اس وقت تک دونوں کی بنیادیں کمزور رہتی ہیں۔ یہ اس وقت ممکن ہے جبکہ عام مفاد مملکت کا نصب العین ہو۔ اگر ہم اپنی نصابی تاریخوں کے ذریعہ اپنے نوجوان شہریوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دیں تو سمجھئے کہ ہم نے بڑی کامیابی حاصل کی۔

قطعہ تاریخ

نتیجہ فکر

جناب مولوی محمد علی صاحب قتیلؔ

ہوا جس طرح سے یہ جشن سیمین شاہ عثمان کا
الٰہی وہ بھی دن آئے کہ یوں ہی عید زرّین ہو
قتیلؔ اس طرح تابان و درخشاں "آب" رُ"سے سال
کہا میں نے "مبارک شاہ کو یہ جشن سیمین ہو"
۱۳۵۴ھ

رپورٹ کمیٹی ضبط مدرسہ

تمہید قبل اس کے کہ نفس مضمون سے بحث کی جائے ہم ضبط کے حقیقی مفہوم کو واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ حقیقی اور غیر حقیقی ضبط کا فرق ظاہر ہو جائے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بعض مدارس میں خاموشی طاری رہتی ہے اور بعض میں ناقابل برداشت شور۔ تجربہ کی بنا پر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مدارس کی یہ کیفیت مدرسین کے رعب وداب یا اس کے فقدان کا نتیجہ ہے ہماری رائے میں اس قسم کے ضبط کو حقیقی اور اصلی ضبط سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ضبط مثل نقش برآب ہے۔ یہ دھوکے کی ٹٹی ہے۔ اس قسم کے ضبط سے طلبار کے حقیقی رجحانات طبعی کو ظاہر کرنے کا موقع نہیں ملتا جس سے یا تو وہ پژمردہ ہو جاتے ہیں یا غلط راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ امر مسلم ہے کہ زندگی کی کامیابی کا راز پسندیدہ رجحانات طبعی کے ارتقا میں مضمر ہے اور اگر رجحانات طبعی غلط راستے اختیار کر لیں تو اس سے طلبار کی سیرت پر جو اثر پڑے گا وہ ظاہر ہے علاوہ بریں ضبط کے مفہوم میں طلباء کی خاموشی ان کی مرعوبیت اور مجہولیت کو داخل کرنا نہ صرف ضبط کے مفہوم کو تنگ کرنا ہے۔ بلکہ ضبط کی غلط تاویل کرنی ہے۔ حقیقی اور دیرپا وہ ضبط ہے جو اندرونی ہو اور جس کو بیرونی اثر اور دباؤ سے کوئی تعلق نہ ہو جو کسی کہنے سننے اور احکامات کا نتیجہ نہ ہو۔ بلکہ خود اختیاری ہو۔ جو صرف مدرس کی موجودگی ہی میں ظاہر نہ ہو بلکہ اس کی عدم موجودگی میں بھی اس کا اظہار ہو جو صرف زندگی کے ایک پہلو ہی میں نہ پایا جائے بلکہ زندگی کے ہر پہلو میں اس کا دور دورہ ہو۔ جو طلباء کی خاموشی سے نہیں بلکہ ان کے کردار، اعمال، چہل پہل میں اور ہشاش اور بشاش چہروں سے جو نہ صرف جماعت میں۔ بلکہ جماعت سے باہر کھیل کے میدان میں مدرسہ کی تقاریب میں اور ٹورنمنٹ کے مواقع پر ظاہر ہو۔ اس قسم کا ضبط پند و نصائح سے نہیں بلکہ عملی مثال۔ نمونہ اور طلباء کے لئے ایسے مواقع فراہم کرنے سے پیدا ہوتا ہے جن میں طلباء کو بطور خود کام کرنے۔ ایک دوسرے کی مدد کرنے وقت اور قواعد کی پابندی کرنے کی ترغیب ہوتی ہے۔ مدرس کا خود اچھا نمونہ۔ منتظم کھیل۔ کشافہ اور دیگر معروفیات زائد از نصاب ایسے مواقع

فراہم کرا سکتے ہیں۔ ماہرین فن علم کے نقطۂ نظر سے ضبط مدرسہ کی تعریف میں تعلیم۔ ورزش جسمانی۔ تنظیم و باقاعدگی۔ اساتذہ کا اثر۔ ملک کا ماحول۔ مدرسہ اور حکومت کے قواعد اور احکام وغیرہ کی بجا آوری سب کے سب امور داخل ہیں۔ ضبط کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ سیرت سازی میں ممد و معاون ہوتا ہے اور ایک قوت کا کام دیتا ہے۔ ضبط چال چلن اور کردار کا فطری مصلح ہے اس لئے اقتدار قواعد اور ان تمام قوتوں کی رہنمائی و ہدایت جو چال چلن اور کردار کی نشو و بالیدگی میں معاون ہوتے ہیں ضبط کی حدود میں داخل ہونے چاہئیں۔ ضبط اطاعت کی صفت پیدا کرتا ہے۔ اور یہ طالب علم کی اخلاقی عادت کے اصلاح کی جانب پہلا قدم ہے۔ اطاعت شعاری مدرسہ کے لئے از حد ضروری ہے لیکن سچی اور دیرپا اطاعت وہی ہے جس کی بنیاد محبت اخلاص اور ہمدردی پر قائم ہو اور یہ معلم کی شخصیت پر موقوف ہے جو طلباء میں اطاعت شعاری کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ استاد اس جذبہ اطاعت شعاری کا تعلق خود اپنے سے قطع کر کے اس قاعدہ یا قانون سے جوڑ دیتا ہے جس کی وہ قایم مقامی کرتا ہے اور امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ جذبہ ایک اخلاقی عادت اختیار کر لیتا ہے اور یہی عادت عہد طفلی کا اعلیٰ وصف سمجھی جاتی ہے اور یہ اس وجہ سے زیادہ قابل لحاظ ہے کہ تخریبی خواہشات کو مغلوب کر لینی اور تعمیری ولولوں کو ابھارتی ہے چونکہ استاد بجائے باپ کے ہوتا ہے اس لئے ایسے موقع پر باپ کی طرح اس کو بھی چاہیئے کہ وہ خود کو طلباء کا خیر خواہ ثابت کرے۔ اس طور پر وہ اطاعت کا مطالبہ بطور ایک حق کے کر سکتا ہے۔

اطاعت اور اقتدار دونوں لازم و ملزوم ہیں اور اقتدار کی ضرورت اس وجہ سے زیادہ ہے کہ وہ عادات و خصائل کی تعمیر اور ان کی بالیدگی میں مدد دیتا ہے۔ لہٰذا اس کا استعمال صرف اخلاقی ضرورت کے تحت ہونا چاہیئے۔ واضح رہے کہ حصول ضبط کے لئے اقتدار ہی مقصود بالذات نہیں بلکہ یہ ایک ذریعہ ہے۔ بچے میں اقتدار کا احساس ابتداً اپنی بے بسی سے پیدا ہوتا ہے اور استاد پر اعتماد کرنے کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے تعلیم اور تجربہ سے۔ بچہ یہ سیکھ لیتا ہے کہ اس کی آزاد خیالی و حرکات کے لئے اوروں کے قایم کردہ ضروری حدود بھی ہیں۔ جلد یا بدیر بچہ کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اقتدار کے ساتھ سزا کی قوت بھی موجود ہے البتہ استاد کا کام یہ ہے کہ قیود اور پابندیوں کی حدود میں اور وہ بھی صرف اخلاقی لغزشوں کے ارتفاع کے

لئے سزا کو جاری رکھے۔ یہ واضح کر دیا جائے کہ اطاعت لابدی ہے لیکن اطاعت اخلاقی اوصاف کے ساتھ ہونی چاہیئے مدرسہ کے ہر کام کو تحت ضبط، سیرت سازی میں مدد دینے کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے کیونکہ عادات اور چال چلن کی تعمیر میں وہ ممد و معاون ہوتا ہے۔

ضبط اطاعت اور اقتدار کو مربوط کر دیتا ہے اس لئے اقتدار کو بروئے عمل لانے میں کسی تردد کا عنصر شریک نہیں ہو سکتا۔ ایسی تنظیم و تربیت بڑھتے بڑھتے اخلاقی اور دماغی ضبط کی حامل ہو جاتی ہے اسلئے ایسے ضبط کی تعریف میں تعلیمی مقاصد کے لئے مقررہ آئین و قوانین کی تعمیل پذیر مطابقت داخل ہے یعنے تعلیمی مقاصد کے لئے مقررہ آئین و قوانین کے مطابق استاد کے احکام کی تعمیل۔

مدرسہ کے عمدہ نظم و نسق کا اثر ضبط مدرسہ پر

مدرسہ وہ مقام ہے جہاں طلبار اور اساتذہ کی ایک کثیر تعداد تعلیمی و تربیتی مقصد کے لئے جمع ہوتی ہے اور جہاں قوم کے ہونہار پودوں کو عملی زندگی کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے مدرسہ بڑی اہمیت رکھتا ہے اس کے نظم و نسق کو جس قدر بہتر بنایا جائے کم ہے۔ نظم و نسق مدرسہ کا حسب ذیل امور پر دارومدار ہے۔

(۱) مکان و سامان مدرسہ و آلات تعلیمی

(۲) جماعت بندی۔

(۳) نظام الاوقات۔

(۴) مدرسین کا طریق کار

(۵) عام انتظامات

مکان و سامان مدرسہ و آلات تعلیمی ضبط کا بہت کچھ دارومدار عمارت مدرسہ پر ہے لہذا مدرسہ ایک ہی مکان میں اور اگر ضرورتاً دو مکانوں میں ہو تو ایک دوسرے کے بالکل قریب ہوں تاکہ مختلف جماعتوں کی دیکھ بھال میں سہولت ہو عمارت مدرسہ ایسی ہو کہ اس میں متعلقہ کام سہولت سے انجام پا سکے بلند اور روشن ہو ہوادار، صحت بخش اور اچھے ماحول میں واقع ہو اس کے اطراف اونچی عمارتیں اور بڑے درخت نہ ہوں۔ یہ مقام گدلے پانی

کے گڑھے یا مخرب اخلاق مکانوں مثلاً شراب خانوں وغیرہ کے قریب نہ ہوں اس میں اتنی گنجائش ہو کہ کوئی جماعت تنگی محسوس نہ کرے۔ اس کا ہر حصہ کام کے لئے موزوں ہو۔ کمرے ایسے ملے جلے نہ ہوں کہ دونوں جماعتوں کا کام خراب ہو۔ کم از کم ایک ہال اتنا بڑا ہو کہ مدرسہ کی ایک معتد بہ تعداد طلباء آرام کے ساتھ اس میں سما سکے خصوصاً نقشہ کشی اور دستی مشاغل کے لئے علیحدہ ہال ہوں۔ ڈرل اور لازمی کھیل کے لئے کافی میدان عمارت مدرسہ سے وابستہ رہنا ازبس ضروری ہے۔ ہر کمرہ کا رخ ایسا ہو کہ کافی روشنی طلباء کی نشستوں تک صحیح اصول سے اور بآسانی آسکے۔ ہر کمرہ میں تازہ ہوا کے داخل اور خراب ہوا کے خارج ہونے کا کافی لحاظ رہے۔ مدرسہ کا بیت الخلاء اصل عمارت سے کچھ فاصلہ پر رہے اور طلباء کی تعداد کی مناسبت سے ہو۔ نشستوں کا انتظام طلباء کی عمروں کے لحاظ سے کیا جائے۔ ہر بچہ کو کم از کم (۱۸) انچ جگہ ملے اور ایک دوسرے کے درمیان (۱۸) انچ کا فاصلہ رہے۔ ڈسک ایسے ہوں کہ طلباء کو لکھنے پڑھنے یا حرکت کرنے میں کسی قسم کی دقت نہ ہو بلکہ سہولت بخش ہوں۔ مدرس کو چاہیئے کہ بچوں کو بیٹھنے کا صحیح طریقہ بتلائے۔ بچے چونکہ کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کے عادی ہوتے ہیں اس لئے چھوٹے سیاہ تختے فری ہینڈ ڈرائنگ کے لئے مہیا رکھے جائیں تاکہ اوقات فرصت میں طلباء ڈرائنگ کرتے رہیں۔ تختہ سیاہ ہر جماعت میں مدرس کی نشست کی بائیں جانب رہے اس طرح کہ اس پر زیادہ روشنی پڑنے پائے اور ہر طالب علم بہ سہولت اس کو دیکھ سکے۔ مدرس کی نشستگاہ کسی قدر بلند ہو کہ طلباء اس کو بہ آسانی دیکھ سکیں۔ اور خود مدرس کی نظر بھی پوری جماعت پر رہ سکے۔

کام اور ضروری آلات تعلیمی بھی قیام ضبط مدرسہ کے لئے ضروری ہیں یہ امر محقق ہے کہ چھوٹے بچوں کی تعلیم میں خصوصاً توضیح و تشریح ایسی موثر نہیں جیسی کہ مقرون اشیاء چنانچہ طلباء کی سمجھ میں جب کوئی بات نہیں آتی ہے تو وہ بےچین ہو جاتے ہیں اور جماعت میں ایک قسم کی گڑبڑ پیدا ہو جاتی ہے جو حصول تعلیم کے لئے نہایت مضر ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ تعلیم کو سریع الفہم بنایا جائے اور یہ مقصد آلات تعلیمی یا بہ الفاظ دیگر مقرون اشیاء سے بدرجہ اتم حاصل ہو سکتا ہے۔ دوران تعلیم میں مقررہ جگہ پر ان کا ہونا ضروری ہے ورنہ ان کے لانے

اور لے جانے میں ضبط مدرسہ میں خلل واقع ہونے کا قوی احتمال ہے۔ المختصر امور مذکورہ بالا سے صاف ظاہر ہے کہ قیام ضبط مدرسہ میں وہ مدرس کے مدد و معاون ہو کر اس کو اس قابل بناتے ہیں کہ وہ اپنے کام کو باحسن الوجوہ انجام دے سکے۔

جماعت بندی موزوں و مناسب جماعت بندی بھی ضبط مدرسہ کا ایک اہم جزو ہے اس لئے کہ مدرس وقت واحد میں کئی طلبار کو پڑھا سکتا اور وقت معینہ پر ان کے نصاب مقررہ کی تکمیل کرا سکتا ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ ہر آن معتد بہ تعداد طلبار کے احساسات تربیت کو پیدا کر سکتا اور تقویت پہونچا سکتا ہے۔ اگر ہر جماعت کا نظم ونسق اچھا رہے تو اس کا عمدہ اثر کل مدرسہ کے نظم ونسق پر پڑے گا۔ جماعت ہائے تحتانی وسطانی و فوقانی کی تعداد تحت احکام نافذ الوقت ہونی چاہیئے لیکن ایسی جماعت بندی اسی وقت مفید سے مفید تر نتائج پیدا کر سکتی ہے جب کہ تعداد طلبار کی زیادتی قیام ضبط میں خلل انداز نہ ہو۔

تقسیم اوقات نصاب تعلیم کی بلحاظ اہمیت مضمون تقسیم اور اسی مناسبت سے موزوں اساتذہ کا حسب مذاق مضمون واری انتخاب اور مناسب تعین اوقات نہایت ضروری ہے اسی کو بہ الفاظ دیگر نظام الاوقات کہا جاتا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کس جماعت میں کن کن مضامین کی تعلیم ہوگی اور کون کون سے اساتذہ کن کن مضامین پر کتنا وقت دے سکیں گے تقسیم اوقات کے مطابق کام کرنے سے مدرسین اور طلبار کے کام میں سہولت اور دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور اہم اور کم اہم مضامین کی یکے بعد دیگرے مناسب ترتیب سے بیزاری کا رفع ہوجاتی ہے۔ ایسے اوقات نامہ میں یہ بھی ضروری ہے کہ بغرض آرام وقفوں اور ورزش کے اوقات کا بھی لحاظ رکھا جائے۔ تعلیمی گھنٹوں کی طوالت طلبا کی عمر اور استعداد کے لحاظ سے ہو۔ تعلیم کے آخری گھنٹے نسبتاً چھوٹے رہیں یہ سب امور قیام ضبط مدرسہ کے باعث ہیں۔

مدرسین کا طریق کار عمدہ اور اصولی طریقہ کار سے بھی جامعیت پیدا ہوجاتی ہے مدرس کا ہر پسندیدہ قول وفعل خواہ وہ حدود مدرسہ کے اندر ہو کہ باہر یقیناً اس کی شخصیت کی اہمیت اور اثر کو بڑھاتا ہے جس کے نتیجہ کے طور پر جماعت پر ضبط کی فضا چھا جاتی ہے اس موقع پر مدرس کے درسی کام کی حد تک روشناس کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ہر مدرس کو چاہیئے کہ اپنے مفوضہ کام

کا ایک خاکہ مرتب کرے۔ اس طور پر کہ سالانہ کام، میقاتی کام، ماہواری کام ظاہر ہو سکے بعد منہائی تعطیلات موسمی و زمانہ امتحانات سالانہ تعلیمی کام صرف دس ماہ کا رہ جاتا ہے۔ اس میں بھی مناسب ہوگا کہ آخری ایک ماہ آموختہ اور بالخصوص مشکل سوالات کے حل اور رفع شکوک طلباء کے لئے مخصوص کر دیا جائے۔ باقی نو ماہ میں ہر مضمون مفوضہ کی تقسیم بلحاظ تعطیلات متعلقہ نو حصوں پر ہونی چاہیئے اور یہ نو حصے بھی تین حصوں پر منقسم ہوں جس کے ہر حصہ کو ایک میقات کہا جاتا ہے۔ یہ میقاتی کام بھی ماہواری کام کے اجزاء پر مشتمل ہو اور ایسے ماہواری کام کو روزانہ کام پر تقسیم کرکے ہر روز کا کام ذریعہ اشارات اسباق متعین و معین ہونا چاہیئے۔ اس میں شک نہیں کہ نہایت شرح و بسط سے روزانہ اشارات اسباق کا تحریر کرنا بڑی حد تک مشکل ہے اس لئے کہ کم و بیش ہر مدرس کو روزانہ پانچ یا چھ ساعات مختلف جماعتوں میں کام کرنا پڑتا ہے ہر ایک ساعت کے لئے تفصیلی اشارات کا ضبط تحریر میں لانا آسان نہیں لیکن اس کے یہ معنی کبھی نہیں کہ اشارات اسباق کا سا مفید و ضروری کام نظر انداز کر دیا جائے یا جاذب توجہ نہ رہے بلکہ نہایت ضروری ہے کہ اس کام کو زیر ہدایت صدر مدرس متعلقہ ممکنہ سہولت و مناسب اختصار سے بہرصورت روزآنہ کیا جائے۔ ایسی تیاری ظاہر ہے کہ مدرس کو جماعت میں بے کھٹکے مشغول و مصروف رکھ کر قیام ضبط اور طلباء میں دلچسپی اور مصروفیت کا موجب ہوتی ہے

مدرس کی شخصیت ضبط مدرسہ کا ایک جزو ہے۔

قیام ضبط مدرسہ میں جہاں عمدہ عمارت کافی اور آرام دہ فرنیچر ضروری آلات تعلیم اور قوانین مدرسہ کی ضرورت ہے وہاں مدرس کی شخصیت کو بھی بہت بڑا دخل ہے۔ اکثر حضرات کا خیال ہے کہ ہم فن تدریس سیکھ نہیں سکتے۔ بہ الفاظ دیگر مدرس بنایا نہیں جا سکتا بلکہ وہ پیدائشی ہوتا ہے مگر واقعات بتا رہے ہیں کہ تجربہ سے درس و تدریس کی صلاحیت میں اضافہ ہو سکتا ہے

مدرسہ کی خصوصیات

مدرس کی بعض خصوصیات اس کو تعلیمی امور کے انجام دینے میں کامیاب بناتی ہیں مثلاً (۱) مدرس کی وجاہت (۲) جوش عمل (۳) انصاف پسندی (۴) خلوص (۵) ہمدردی (۶) قوت عمل (۷) قوت ارادہ (۸) حکمت عملی (۹) طرز تکلم

(۱۰) طریقہ تعلیم۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مدرس کی عمدہ جسمانی ساخت خدوخال اور لباس طلبار پر اچھا اثر ڈال کر قیام ضبط کا باعث ہوتے ہیں طلباء ایسے مدرس کی عزت کرتے اور اس کا حکم ماننے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ پس اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ مدرسین اپنی ظاہری حالت کو حتی الامکان بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ اگر کمزور ہیں تو ورزش صحت افزا غذا وغیرہ سے اس خامی کو دور کرسکتے ہیں معمولی سے معمولی لباس کو اگر صاف ستھری حالت میں استعمال کریں تو اپنی سادگی کی وجہ سے ایسا لباس جاذب توجہ ہوتا ہے۔

مدرس کا جوش عمل | مدرس کا جوش عمل طلبار سے سستی کاہلی عدم توجہی اور بے ضبطی کو دور کرکے ان میں دلچسپی انہماک اور ضبط پیدا کردیتا ہے۔ مدرس کے جوش عمل سے خود اس کا اپنا کام بار نہیں معلوم ہوتا اگر مدرس طلباء کے ساتھ ہمدردی سے پیش آئے تو وہ اپنی خامیوں کو ایک شفیق اور ہمدرد مدرس پر ظاہر کرنے میں کبھی پس وپیش نہیں کریں گے۔ مدرس کا طلباء کے نقائص سے اور طلبار کا مدرس کی طبیعت سے واقف ہونا تعلیم وتربیت اور ضبط کی جان ہے۔

مدرس کی قوت ارادی | مدرس کو اس کی قوت ارادی اس کی خصوصیات طبعی سے استفادے کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ مدرس کا قوی الارادہ ہونا تعلیمی امور کی انجام دہی کے لئے ازبس ضروری ہے۔ کمزور قوت ارادی والا مدرس اپنے کام کو انجام نہیں دے سکتا۔ مدرس کو چاہیئے کہ اپنا کام طلبار اور فرض کی خاطر انجام دے۔ جو کام طلبار سے لینا چاہتا ہو ان سے لے کر رہے۔ اولیا کی دھمکی اور طلبار کی حیلہ سازیوں کو بالکلیہ خاطر میں نہ لائے۔ صدر مدرس کو چاہیئے کہ اس خصوص میں مدرس کی امکانی مدد کرے قیام ضبط مدرسہ میں اس کا ہاتھ بٹائے۔ طلبار اور اولیائے طلبار کی ناجائز تائید سے بیچارے مدرس کی قوت ارادی کو پست نہ کرے۔ ورنہ ضبط مدرسہ پر اس کا بُرا اثر پڑے گا۔

مدرس کی موقع شناسی اور حکمت عملی | مدرس کی حکمت عملی بھی اس کی شخصیت کا ایک اہم جز ہے۔ جماعت میں مختلف طبائع کے طلبار ہوتے ہیں ہر ایک کے ساتھ ایک ہی قسم کا برتاؤ ناممکن ہے اس لئے ہر وقت مختلف برتاؤ کی ضرورت ہے ممکن ہے کہ اخلاقی اور تعلیمی دلچسپیوں کی وجہ سے مدرس کسی طالب علم کے متعلق خاص رائے یا رجحان رکھتا ہو مگر

اصول ضبط کے مدنظر اس کو چاہیئے کہ اس خاص رجحان کو نہایت حکمت عملی سے ظاہر کرے۔

مدرس کا طریقہ تعلیم | اگر مدرس کا صرف طریقہ تعلیم اچھا ہو تو قوی امکان ہے کہ عمدہ طریقہ تعلیم کی وجہ سے جماعت میں ضبط قایم رہے اور یہ ظاہر رہے کہ اگر ہر جماعت کا ضبط اچھا رہے گا تو مدرسہ کے ضبط پر اس کا بہت اچھا اثر پڑے گا مدرس کی آواز کو اس کی شخصیت کی تعمیر میں بڑا دخل ہے۔ بدوران تدریس مدرس کو اپنی آواز پر پورا قابو ہونا چاہیئے۔ اس کا زور سے پڑھانا خود جماعت میں شور و شغف کا موجب ہوتا ہے اس کی آواز ایسی بھی نہ ہو کہ طلبار کو نیند آنے لگے اور نہ ایسی پست ہو کہ طلبار ایک دوسرے سے پوچھیں کہ مدرس صاحب کیا فرما رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی آواز ضبط کے انتشار کا باعث ہوگی نہ کہ اس کی ممد و معاون۔

ضبط جماعت

ضبط جماعت سے مراد | ضبط جماعت سے یہ مراد ہے کہ ہر ایک کام باقاعدگی اور سلیقہ سے ہو رہا ہو استاد کے احکام کی پوری پوری پابندی ہو طلبا کے بشرون سے ان کی حقیقی دماغی کاوش اور ذہنی تحریک کے آثار پائے جا رہے ہوں ضبط کا انحصار زیادہ تر مدرس کی شخصیت پر ہے مدرس کی عملی زندگی کا طلبار کے اخلاق و عادات پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ کیونکہ عملی نمونہ پند و نصائح سے کہیں زیادہ موثر ہوتا ہے۔ چنانچہ مدرس کی پابندی اس کا اپنے کام میں شوق و انہماک اس کی آئین پسندی و منصف مزاجی اور اس کی رواداری کے گہرے نقش طلبار کے اثر پذیر دماغوں پر بیٹھ سکتے ہیں۔

مدرس کا اصلی کام بچوں کی تعلیم و تربیت ہے جس کے لئے بچوں کا متوجہ رہنا ضروری ہے اور توجہ کے لئے دلچسپی کی ضرورت ہے پس مدرس کو چاہیئے کہ سبق کو موزوں قصص تصاویر۔ توضیحات۔ نمونہ جات سے دلچسپ بنائے بچے کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہتے ہیں ان کو کام میں مشغول رکھے ان کی فطرتوں کا مطالعہ کرے اور ان کی استعداد دلچسپیوں اور رجحانات کے مطابق ان کو کام پر لگا رکھے۔ چونکہ بچے مشاغل میں تنوع چاہتے ہیں۔

اس لئے قیام ضبط کے مد نظر وقتاً فوقتاً مناسب تبدیلی سے کام لے۔ مدرس کی قوت سماعت تیز ہو۔ ہمیشہ اس کی نظر پوری جماعت پر رہے تاکہ طلبار کے بشروں سے یہ پتہ چلائیے کہ وہ مصروف بکار ہیں کہ نہیں۔ مدرس کی آواز ایسی ہو کہ پوری جماعت اس کو اچھی طرح سن سکے۔ تختہ سیاہ پر لکھتے وقت مدرس خاموش نہ رہے بلکہ جو کچھ لکھا جا رہا ہے اسے دہراتا جائے اور اس طرح کھڑا رہے کہ بچوں کے دیکھنے میں حایل نہ ہو۔ سبق کی طرف جو بچے متوجہ نہ ہوں ان کو متوجہ کرے اور ان میں سبق سے دلچسپی پیدا کرنے کے لئے موزوں سوالات کا استعمال کرے۔ سوالات حسب موقع انفرادی۔ اجتماعی۔ واضح اور ایک ہی جواب چاہنے والے ہوں تاکہ بجائے قیام ضبط کے انتشار ضبط کا باعث نہ ہو۔ مدرس کو چاہیئے کہ وہ بچوں کی فطرت کے خلاف کوئی حکم نہ دے ورنہ اس کے حکم کی تعمیل نہ ہوگی۔ مدرس کی بیجا دھمکی اس کی کمزوری کے اعتراف کے مترادف ہوتی ہے اور اس کے اعتماد کو کھو دیتی ہے جانبین کی عدم اعتمادی ضبط کے لئے نہایت مضر ہے۔

ضبط کی بنیاد مہر پر ہو نہ کہ قہر پر بعض مدرسین خوف و دہشت سے ضبط قایم رکھنا چاہتے ہیں اس قسم کا ضبط دیرپا اور پسندیدہ نہیں ہوتا۔ خوف و دہشت کے بجائے مہر و محبت کی تاثیر گہری اور دیرپا ہوتی ہے۔ جو مدرسین مہر و محبت سے کام لیتے ہیں انہیں طلبار اپنے سچے ہمدرد اور شفیق سمجھتے ہیں۔ ان سے اپنی غلطیوں کی اصلاح چاہتے ہیں جس سے ان کی ذہنی ترقی ہوتی ہے اور طلبار ایسے مدرسین کی دل سے عزت کرتے ہیں اور ان کے حکم کی تعمیل کرنے کے لئے ہر وقت آمادہ و تیار پائے جاتے ہیں۔ جماعت میں مدرس کا طرز عمل ایسا ہو کہ قیام ضبط کے لئے اظہار غیظ و غضب اور سزا دینے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ مدرس کو جماعت میں زندہ دلی اور خندہ پیشانی سے رہنے کی ضرورت ہے اس کو بچوں کے ہر کام پر ہرگز جھنجلانا نہیں چاہیئے بلکہ جہاں تک ہو سکے ان کی ذاتی سعی اور قابلیت کی تعریف کرے۔ مدرس کا بعض لڑکوں کو سر پر چڑھا لینا اور بعض کو دھتکارنا اس کی ناانصافی کی دلیل ہے ایسا کرنے سے طلبار کی نظر میں اس کا وقار گھٹ جاتا اور ضبط جماعت میں اختلال واقع ہوتا ہے۔

ازدیاد احکامات مضر قیام ضبط ہے | بعض مدرسین قیام ضبط کے لئے کثرت کے ساتھ حکم دیتے ہیں جس کی تعمیل بچے نہیں کر سکتے ایسے بہ کثرت احکام کا لازمی نتیجہ خلاف ورزی ہے۔ پس جس قدر احکام کم ہوں گے ان کی تعمیل زیادہ آسان ہوگی احکام کی تعمیل فوری اور قطعی ہونی چاہئے ضرورتاً جو قاعدے بنائے جائیں وہ تعداد میں کم جامع اور عام اصول پہ مبنی ہوں تاکہ بچے خود محسوس کرنے لگیں کہ جان بوجھ کر قواعد کی خلاف ورزی کرنا ان کا اپنا نقصان ہے۔

جماعت میں آزادی | مدرسین کو چاہیئے کہ طلبا میں ایک حد تک آزادی کا احساس پیدا کرائیں اور ان کو اپنا آپ انتظام کرنے کا طریقہ سکھائیں اس غرض کے لئے جماعت کے ایسے لڑکوں کو جو فطرتاً اپنے ساتھیوں پر اثر قایم رکھ سکتے ہوں اور ان میں ہر دل عزیزی بھی ہو مانیٹری کے عہدوں کے لئے منتخب کیا جائے جو قیام ضبط اور دوسرے کاموں میں مدرسین کا ہاتھ بٹائیں گے۔ لیکن مدرسین کو چاہئے کہ ان مانیٹروں پر غیر محسوس کافی نگرانی بھی رکھیں ورنہ اپنے اختیارات کو بری طرح کام میں لائیں گے۔ جس سے ضبط جماعت میں خلل واقع ہوگا۔ مانیٹروں کے ذمے اتنا زیادہ کام نہ کیا جائے کہ جس سے ان کی تعلیم کا نقصان ہو۔

جماعت میں انتظامی کمیٹیوں کا قیام | جماعت میں بعض لڑکے ناپسندیدہ عادتوں میں مبتلا ہوتے ہیں اور ان کو مدرسہ میں مرض متعدی کی طرح پھیلا کر انتشار ضبط کا باعث ہوتے ہیں ایسی باتوں کے انسداد کے لئے جماعت کے چند شریف اور ہر دل عزیز بچوں کی مختلف نوعیتوں کی کمیٹیاں بذریعہ انتخاب قایم ہوں۔ مثلاً صفائی کی نگرانی کی کمیٹی۔ طلبا کو حاضر باش بنانے کی کمیٹی۔ ہوم ورک کی نگرانی کمیٹی وغیرہ چونکہ طلبا ایک دوسرے کی خامیوں سے زیادہ واقف ہوتے ہیں اس لئے توقع کی جاتی ہے کہ ان کمیٹیوں کی نگرانی میں ان خامیوں کی بہت بہت اصلاح ہوجائے گی۔ علاوہ ازیں اس قسم کے امور کی انجام دہی طلبا میں ابتدا ہی سے احساس فرائض اور ایک دوسرے کی مدد کے جذبات کو ابھار کر قیام ضبط کا باعث ہوگی۔

اخلاقی تربیت کے ذریعہ قیام ضبط

گھر پر اخلاقی تعلیم نہیں ہو سکتی قیام ضبط مدرسہ کے لئے اخلاقی تربیت کا سوال ایک خاص اہمیت رکھتا ہے نامناسب نہ ہوگا اگر اس موقع پر یہ کہا جائے کہ عمدہ اخلاقی تربیت سے قیام ضبط مدرسہ کا سوال خود بخود حل ہو جاتا ہے اس لئے کہ اس سے طلبار میں ذاتی اعتماد۔ ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ اپنے کام میں شوق و انہماک۔ جھوٹ سے نفرت سچ سے محبت وغیرہ جیسی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں۔ جو قیام ضبط مدرسہ کے اجزائے لاینفک ہیں۔ گھر اخلاقی تعلیم کے لئے زیادہ موزونیت رکھتا ہے کیونکہ بچہ پر اس کی ماں کے خاص اثرات مرتب ہوتے رہتے ہیں لیکن ماں کا بیجا لاڈ و پیار اس کی اخلاقی تربیت کے لئے اہم جگہ ہے جس طرح سے مدرسہ میں بچوں کے قوائے ذہنی و جسمانی کی تربیت ہو سکتی ہے اسی طرح یہاں وہ اخلاقی تربیت بھی حاصل کر سکتا ہے۔ اور یہی مکمل تعلیم ہے۔

ذاتی مفاد کے ساتھ دوسروں کا خیال رکھا جائے موجودہ دور میں اکثر لوگ اپنی ترقی اور خوشحالی کی دھن میں منہمک نظر آتے ہیں یہ اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ میدان ترقی میں اوروں کی بہ نسبت ایک قدم آگے رہیں جس کا لازمی نتیجہ ظاہر ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ ابتدا ہی سے ہونہار بچوں کو ایسی اخلاقی تعلیم و تربیت دی جائے کہ وہ اپنی بھلائی کے ساتھ ساتھ نہ صرف اوروں کے مفاد کا خیال رکھیں بلکہ قومی اور اجتماعی وقار اور فوائد کی خاطر اپنی انفرادیت کو پس پشت ڈالنے میں دریغ نہ کریں۔

بچپن میں اخلاقی تعلیم اور دینیات کا اثر مدارس میں ہمارے مدارس کے نصاب میں دینیات کے ساتھ اخلاقیات کی تعلیم مثل دیگر مضامین کے شامل ہے اخلاقیات کے نصاب میں بزرگوں کے کارنامے بہادروں کے افسانے محبت۔ سخاوت ہمدردی۔ خلوص۔ جھوٹ سے نفرت۔ سچ سے محبت۔ جیسے جاذب توجہ مضامین شریک ہیں اور یہ طلبار کی عمر استعداد اور مذاق کے موافق ہیں جن کے پڑھنے سے طلبار کے ولولے موجزن ہو کر ان میں ان خوبیوں کے حصول کی خواہش ہوتی ہے۔ پس ہم کو چاہئے کہ ایسے

زرین موقع سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا کر بچوں میں ضبط کی روح کو جاری و ساری کردیں
اور جن چیزوں کا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے ان کی تربیت سے یہ روح بدرجہ اتم حاصل ہوسکتی ہے
اس وقت بچہ اخلاقیات کے نصاب کی تکمیل کرلیتا ہے مگر ایک حقیقت بیں کی نظر میں وہ
جاہل مطلق سے بڑھ کر حقیقت نہیں رکھتا۔ اس کو چند اخلاقی اصول سے واقفیت تو ہوجاتی
ہے مثلاً چوری کرنا یا جھوٹ بولنا بہت برا ہے لیکن وہ اپنی معلومات کی بناء پر چوری کرنا یا
جھوٹ بولنا نہیں چھوڑتا۔ ظاہر ہے کہ ایسی عادات وخصائل کی موجودگی میں ضبط قائم نہیں
رہ سکتا۔ پس ضرورت اس بات کی ہے کہ اخلاقی تربیت کے عملی پہلو پر ابتدائے تعلیم ہی
کے زمانہ میں کافی و وافی توجہ دی جائے۔ تو یقین ہے کہ طلباء میں بجائے جھوٹ بولنے
کے راست بازی اور بجائے خود غرضی کے ہمدردی پیدا ہوجائے گی۔ اور اس عملی تعلیم
کا نتیجہ ضبط مدرسہ پر بہتر سے بہتر پڑے گا۔

تکمیل نصاب سے تعمیر اخلاق افضل ہے بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ نصاب کی تکمیل اور
کافی تعداد میں طلباء کی کامیابی مدرسین کو ان کے فرائض منصبی سے سبکدوش کردیتی ہے
اس نقطۂ خیال کی صحت ظاہر ہے۔ اس لئے کہ محض نصاب کی تکمیل طالب علم کو آئندہ
زندگی میں زیادہ فائدہ نہیں پہنچا سکتی ایسا علم جس کو اس نے اپنا قیمتی وقت صرف کر کے
حاصل کیا تھا زندگی کے پہلے ہی زینہ پر کچھ غیر مفید سا معلوم ہوتا ہے کیونکہ دیکھنے والا اس کے
ذخیرہ علم کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ اس کے اخلاق و عادات کو بھی جانچتا ہے۔ مدرس کو تعلیم
کے دوران میں بیسیوں مواقع حاصل ہوتے رہتے ہیں مثلاً کمرہ جماعت میں وہ معلوم کرسکتا
ہے کہ کونسا طالب علم کام سے جی چراتا ہے کس طالب علم میں پابندی وقت کا احساس
نہیں۔ وہ کونسا طالب علم ہے جس میں ساتھیوں کے ساتھ ہمدردی کا خیال نہیں۔ کون نقل
کرنے کا عادی ہے اور کون نقل کرنے میں معاون ہوتا ہے اسی طرح کمرہ جماعت کے باہر
بھی اس قبیل کے بیشتر مواقع یعنے راست بازی، ہمدردی اور قوت برداشت، منظم کھیل تعلیمی
تفریح۔ اسکوٹنگ کے وقت بھی ظاہر ہوتے رہتے ہیں بشرطیکہ طلباء کو کافی آزادی رہے پس
ایسے مواقع سے کماحقہ فائدہ اٹھا کر طلباء میں اخلاقی تربیت کا احساس پیدا کرنا اور اس سے

ضبط مدرسہ کو تقویت دینا مدرس کے اہم فرائض میں داخل ہے۔ اس نوعیت کی عملی تربیت ہر مذہب وملت کے بچہ کو دی جا سکتی ہے۔ اخلاقی تربیت دینے والے مدرسین خود مجسمہ اخلاق ہوں تاکہ بچے بھی ان کی تقلید کریں۔ چونکہ بچوں میں تقلید کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے اس لئے مدرس کا اچھا نمونہ ان کو اس کے رنگ میں رنگ دے گا۔ یعنے مدرس کی پابندی صفائی پسندی ہمدردی صداقت شعاری کے گہرے نقوش ان کے دلوں پر منقوش ہوکر بہترین اور اندرونی ضبط کے قیام کا باعث ہوں گے۔

اخلاقی تعلیم کا ایک اہم جزیہ ہے کہ بچوں کو اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہونے کا عادی بنایا جائے۔ ہمارے ملک کے بچے عموماً ہر کام میں دوسروں کی مدد کے طلبگار رہتے ہیں ان کو اس قابل بنایا جائے کہ کام خواہ مدرسہ کا ہو یا ان کا ذاتی ہو اوروں کی مدد سے نہ کریں۔ اپنا کمرہ آپ صاف کریں اپنے کپڑے آپ دھولیں رنج وراحت میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں۔ الحاصل بچوں کی اخلاقی تربیت کی اگر کافی نگہداشت کی جائے تو وہ نیک بخت طالب علم ہی نہیں بنتے بلکہ آئندہ زندگی میں اچھے ہمسایہ اور اچھے شہری بن سکتے ہیں۔ ایسی تربیت نہ صرف ضبط مدرسہ کے قیام پر منتج ہوتی ہے بلکہ اس قبیل کے طلبا جب آئندہ زندگی میں قدم رکھیں گے تو ملک کے ہر شعبہ زندگی میں ایک عمدہ ضبط کی فضا پائی جائے گی۔

ازمنہ گزشتہ اور نشاۃ ثانیہ میں جزا و سزا کا داخلہ

جسوئٹ اور پورٹ رائلسٹ نے سب سے پہلے حصول ضبط کا ذریعہ تحائف اور انعامات کو قرار دیا۔ نشاۃ ثانیہ کی اصلاحات میں انعامات کے ذریعہ ضبط کا قیام ضروری سمجھا گیا۔ مصلحان تعلیم کی نظروں میں ضبط نفس پیدا کرنا بے نظیر ثابت ہوا جس کی اشاعت چار دانگ عالم میں ہوگئی اور جس میں اصول فطرت کے لحاظ سے سزا کو بھی داخل کر لیا گیا۔

میڈم مانٹی سوری جو بچوں کے تخیلات کی تربیت پر زور دیتی ہیں اپنی ایجاد کردہ اشیاء اور آلات تعلیمی کا نام "تحفہ" رکھتی ہیں اور کہتی ہیں کہ یہ اشیاء نازک خوش نما اور جاذب توجہ ہوں کہ بچے انہیں رغبت سے دیکھیں۔

مصنوعی طریقہ پر ضبط نفس کی عادت نقصان بخش ہوتی ہے ان تمغوں اور ترغیبی چیزوں کے متعلق کہنا ہی پڑتا ہے کہ اس قسم کی چیزیں حصول ضبط میں ممد و معاون ہو سکتی ہیں بشرطیکہ ان کے حصول کی جد وجہد میں طلبار کی صحت پر برا اثر نہ پڑے اور ان میں حسد ناامیدی، بے صبری اور پست ہمتی وغیرہ کا مادہ پیدا نہ ہو حصول انعام کا مقصد طلبار یہ نہ سمجھنے لگیں کہ جماعت میں خاموش بیٹھے رہنا بلا چون وچرا اپنے بزرگوں کے احکام کی اتباع کرنا ہے ورنہ عمل وترغیب وتحریص بلا حاصل ہی نہیں بلکہ بجائے فائدہ کے مضرت رساں ہوگا اس لئے کہ اس قسم کی نمایشی عادتیں جن میں اصلیت کا شائبہ نہیں ہوتا قایم نہیں رہتیں اور اگر یہ عادتیں جڑ پکڑلیں تو آئندہ زندگی میں یہ بچے دہوکا دہی دغابازی اور غداری سے کام لینے میں دریغ نہیں کریں گے۔

طلبار تکمیل کار کو انعام سمجھیں انعامات وتحائف صرف سال میں ایک وقت ہی دیئے جائیں بلکہ سال بھر دوران تعلیم میں جہاں جہاں ان کی ضرورت محسوس ہو ان کو دینے میں دریغ نہ کیا جائے۔ انعامات میں صرف تمغہ جات اور قیمتی اشیا، ہی داخل نہیں ہیں بلکہ تعریف وتوصیف بھی شامل ہے جس کا یا موقعہ استعمال طلبار میں اندرونی ضبط پیدا کرکے ان کے شوق کو ابھارتا اور ان کی کوششوں میں جان ڈالتا ہے۔

ہماری رائے میں انفرادی انعامات سے اجتماعی انعامات بہترین نتایج کے حامل ہوسکتے ہیں، ان سے اجتماعی مفاد کی خاطر کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اس قسم کے انعامات میں کسی جماعت کو اس کی عمدہ حاضری کے صلہ میں نصف یوم کی تعطیل دینا یا ایک ماہ کے لئے امتیازی جھنڈی کے استعمال کی اجازت دینا اور بجائے انفرادی تمغوں کے اجتماعی طور پر شیلڈ دینا داخل ہیں۔

قیام ضبط کا قدیم طریقہ قدیم زمانہ میں ضبط کا واحد ذریعہ ڈنڈے کا استعمال تھا اور اکثر اس کا استعمال نہایت بے رحمی سے ہوا کرتا تھا جس کا اعتراف خود ماہران تعلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ جان ملٹن اور سنیٹ لوئی اور دیگر اکابر قوم مدرسین کے ہاتھوں اکثر پٹتے رہے ہیں۔

سزا کی نوعیت بلحاظ عمر و استعداد اگر ہم سزائے جسمانی کو اصول نفسیات کی روشنی میں دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ جسمانی سزا بچے کے لئے نہایت تکلیف دہ چیز ہے اس میں اسے جسمانی اور روحانی دونوں قسم کی تکلیف ہوتی ہے سزا جو اس کو دوسروں کے موجہ میں دی جاتی ہے اس کو نہ صرف شرمندہ ہی کرتی ہے بلکہ اس کے ہمجنسوں میں اس کا وقار کھو دیتی ہے۔ اس کے علاوہ ہم دیکھتے ہیں کہ بے موقع سزائے جسمانی نفرت پیدا کرتی ہے۔ بچہ اپنی کم سمجھی کی بنا پر مدرس کو حقارت سے دیکھتا ہے خاص کر اس موقعہ پر جب کہ مدرس بچے کی حقیقی کمزوریوں اور مجبوریوں کو جانے بغیر سزا دیتا ہے ایسی صورت میں جماعت جو تعلیم گاہ تھی میدان رزمگاہ بن جاتی ہے۔

مدرس کو چاہئے کہ اپنے فرض منصبی سے کماحقہ واقف رہے بچوں کے ساتھ بجائے قہر و غضب کے مہر و محبت سے پیش آئے تالیف قلوب سے کام لیتا رہے بچوں میں اندرونی فطری قوتیں ایسی موجود ہیں جن کو ایک ہوشیار مدرس معلوم کرکے ترقی کے راستہ پر لگا دیتا ہے۔ بچوں میں اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ بطور خود صحیح اور غلط میں امتیاز کرسکیں۔ اس لئے وہ غیر صحیح چلبلے پن کی طرف مائل ہوجاتے ہیں اس موقع پر مدرس کو چاہئے کہ ان کو اس قسم کی حرکات سے باز رکھنے کی مختلف تدابیر اختیار کرے اور ان کو سیدھے راستہ پر لے چلے تاکہ دونوں کی کوششوں سے ضبط مدرسہ قایم رہ سکے۔

تعلیمی کمزوری کے لئے کسی صورت میں سزائے جسمانی نہ دی جائے البتہ بداخلاقی کی صورت میں حسب احکامات سررشتہ تعلیمات اس پر عمل کیا جاسکتا ہے مگر اس وقت سزایابندہ کی عمر جذبات اور جسمانی صلاحیت کا لحاظ رہے۔ بے موقعہ نہ ہوگا اگر اس خصوص میں نواب صدر المہام بہادر تعلیمات کا قول جس کو نواب صاحب معزنے گزشتہ کانفرنس اساتذہ کے موقع پر ظاہر فرمایا تھا پیش کیا جائے۔ ”سزائے جسمانی اخلاقی خطا کی پاداش میں ملنی چاہئے نہ کہ ذہنی پستی کی یا کسی ایسی شرارت کی بنا پر جو محض توانائی کی افراط سے پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً میں ایسے طالب کی بید سے خبر نہ لوں گا جو کسی سوال کو صحیح نہ سمجھ سکا یا کام کے وقت کھیلتا اور بھاگ دوڑ کرتا پھرتا تھا۔ لیکن اگر وہ جھوٹ بولا

یادانستہ کسی قسم کی فریب کاری کی ہو تو میں اسے بید سے سخت سزا دوں گا" اگر سزائے جسمانی کے وقت امور متذکرہ بالا کا لحاظ رکھا جائے تو اس سے نہ صرف بہتر نتائج برآمد ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے بلکہ اس سے قیام ضبط مدرسہ کو بھی بے حد مدد ملے گی۔

قیام ضبط مدرسہ کے لئے مدرسین اور صدر مدرس میں اشتراک عمل کی ضرورت و اہمیت۔

یہ امر محتاج دلیل وحجت نہیں کہ ایک خاندان کے بچوں کی تعلیم وتربیت اور خوش حالی کا دارو مدار بالعموم اس خاندان کے بزرگوں اور بالخصوص ان کے والدین کے اشتراک عمل پر ہے اور یہ اشتراک عمل نتیجہ ہوتا ہے جانبین کی باہمی محبت اور ان کا ایک دوسرے کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کا۔ اور جس خاندان میں اشتراک عمل مفقود ہوتا ہے اس میں امن وچین کی زندگی ہوتی ہے اور نہ بچوں کی تعلیم وتربیت کا خیال۔ ان افراد کا تمام وقت آپس کی لڑائی جھگڑوں میں صرف ہوتا ہے۔ ایسے والدین کی زندگی نہ صرف نہ ان کے لئے وبال جان رہتی ہے بلکہ ان کی اولاد کے لئے بھی بار خاطر

قیام ضبط مدرسہ کا بہت کچھ انحصار مدرسین اور صدر مدرس کے اشتراک عمل پر ہے ان کا اشتراک عمل ان کی درمیانی اجنبیت کی خلیج کو پاٹ دیتا ہے ایک دوسرے میں اتحاد وخلوص کا بیج بونے اور اعتماد پیدا کرنیکا موجب ہوتا ہے اس قسم کے اشتراک عمل سے دونوں اپنے گوہر مقصود سے پُر دامن ہوتے ہیں۔ یعنے خاطر جمعی اور اطمینان قلب کے ساتھ بچوں کو تعلیم وتربیت دے کر خود کو سرخ رو اور بچوں کو فائز المرام کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مدرسہ کی اس قسم کی فضاء قیام ضبط کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ ورنہ مدرسہ مدرسین اور صدر مدرس کی باہمی نزاع کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اور پُرامن فضا کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکتا ہے صدر مدرس اور مدرسین اپنی پوری قوت بجائے اپنے مفوضہ کام کی انجام دہی میں صرف کرنے کے ایک دوسرے کی تخریب میں صرف کرتے ہیں لہذا بمصداق "دگر ہمیں مکتب وہمیں ملا۔ کار طفلاں تمام خواہد شد" ان کا عدم اشتراک عمل بچوں کی تعلیم اور ضبط مدرسہ کا ناس کر دیتا ہے۔ پس اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ مدرسین اور صدر مدرس مدرسہ کے درمیان اشتراک واتحاد عمل ہو۔

مثل مشہور ہے کہ ایک ہاتھ سے تالی نہیں بجتی پس محض صدر مدرس یا مدرسین کی غیر متحد کوشش ان کے درمیان اتحاد عمل نہیں قائم کر سکتی۔ اس کے لئے طرفین کی جدوجہد کی ضرورت ہے اگر صدر مدرس خوبی کار و ضبط مدرسہ کی خاطر مدرسین کا رہنما ان کے جائز حقوق کا محافظ۔ ان کے فرائض میں ممد و معاون ان پر شفیق و مہربان ہو اور دوسری جانب مدرسین اپنی قابلیت پابندی وقت۔ فرض شناسی۔ کار مفوضہ کی بطریق احسن انجام دہی اور فرماں برداری احکام صدر مدرس خود کو اپنے کما حقہ فرائض منصبی کے انجام دہی کے لئے اہل ثابت کرنے کی سعی بلیغ سے دریغ نہ کریں تو ان کی یہ کوششیں قیام ضبط مدرسہ کا باعث ہو کر مدرسہ کو اپنی کام میں بار آور کریں گی۔

ضبط بیرون جماعت

مدرسہ کی انجمنوں کی تقسیم | یہ امر ظاہر ہے کہ اندرون جماعت قیام ضبط میں قواعد مدرسہ۔ مدرس کی شخصیت اور اس کا عمدہ طرز تعلیم بہت کچھ دخل رکھتا ہے مگر جیسا کہ ہم نے کہا ہے حقیقی ضبط وہ ہے جو کسی اثر کے تحت قائم نہ ہو بلکہ اندرونی ہو۔ اور اس نوعیت کا ضبط بیرون جماعت ہی بدرجہ اتم حاصل ہو سکتا ہے۔ ہمارا تجربہ یہ بتلاتا ہے کہ طلباء اپنے حقیقی جذبات رجحانات اور خیالات کا جیسا کہ آزادانہ اظہار بیرون جماعت کرتے ہیں ویسا اندرون جماعت نہیں کرتے۔ لہذا مدرس کو طلبار کے حقیقی خیالات و رجحانات طبعی کے معلوم کرنے کے بہترین مواقع بیرون جماعت حاصل ہوتے ہیں اگر طلباد کے حقیقی رجحانات اور آزادانہ کام کے صحیح مواقع بیرون جماعت فراہم کر دیئے جائیں تو ان کے اعمال و کردار میں حقیقی اور دیرپا ضبط قایم ہو جائے گا۔ اور طلبار کی کامیاب زندگی کا دارومدار اسی قسم کے ضبط پر ہے نامناسب نہ ہوگا کہ اگر اس موقعہ پر ضبط بیرون جماعت کا مفہوم ظاہر کر دیا جائے طلباء کا نصابی مضامین کے سوائے مدرسہ کی مختلف کمیٹیوں اور منظم کھیلوں میں اس طرح انہماک شوق اور تنظیم کے ساتھ حصہ لینا اور منہمک رہنا جس سے دوسروں کے احساسات کو مجروح کئے بغیر اپنے مقصد کو حاصل کرنا پایا جائے ضبط بیرون جماعت کہلاتا ہے۔

اس قسم کے ضبط کے اصول کے لئے ممالک یورپ کے اکثر و بیشتر مدارس میں مختلف النوع مشاغل اور مصروفیات کی انجمنیں قایم ہیں تاکہ ہر طالب علم اپنے مذاق اور رجحان طبعی کے لحاظ سے ان میں حصہ لے کر اپنے میں اندرونی ضبط کا جوہر پیدا کرے برخلاف اس کے ہمارے اکثر مدارس مفید اور ضروری انجمنوں کے وجود سے خالی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے مدارس مثل جسم بے روح کے ہوتے ہیں جن میں طلباء اور مدرسین کی دلچسپیوں اور مذاق کے سامان نہیں ہوتے اس لئے ایسے مدارس ہر دو کے لئے بار خاطر ہو جاتے ہیں لہذا اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ مدارس کو جاذب توجہ بنانے کے لئے ان میں مختلف قسم کی انجمنیں قایم کی جائیں تاکہ طلباء کھیل کھیل میں اپنے اندر وہ جوہر پیدا کرلیں جو ان کی آئندہ زندگی کی کامیابی کے ضامن ہوں۔ انجمن ہائے مدرسہ کی مختلف نوعیتوں اور مقاصد سے حسب ذیل تقسیم کی جا سکتی ہے مثلاً علمی۔ اخلاقی۔ ذہنی۔ ورزشی۔ تعلیمی تفریح اور کھیل اور بازی وغیرہ۔ اس قسم کی انجمنوں کا مقصد یہ ہے کہ طلباء میں ذوق سلیم پیدا کیا جائے وہ اپنا کام آپ کرنا سکھیں ان میں اشتراک عمل اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ ظاہر ہے کہ ان صفات کا مجموعی نتیجہ اندرونی ضبط ہوگا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ طلباء تاریخی کتاب پڑھ کر قطب شاہیوں کے حالات و واقعات تو سمجھ جاتے ہیں لیکن اس سبق کو اگر مدرس گولکنڈہ کے گنبدوں کو دکھاکر پڑھائے تو ان کی توجہ و دلچسپی کے لحاظ سے وہ نسبتاً زیادہ استفادہ کر سکتے ہیں۔

ہر انجمن کی تنظیم کے لئے ایک دلچسپی رکھنے والا مدرس چند منتخب لڑکے اور اولیاء طلباء کی اعانت کی ضرورت ہے۔ اس قسم کی انجمنوں میں تجربہ کار مدرس کی رہنمائی سے طلباء خود کام کریں گے اپنے کام میں اگر کچھ خامی پائیں گے تو خود اصلاح کرنے کی کوشش کریں گے ورنہ مدرس ان کی خامی کو دور کرے گا۔ اس نوعیت کار سے ضبط بیرون جماعت قایم ہو سکتا ہے۔

انجمن کے کام کو صحیح اصول پر چلانے کے لئے حسب ذیل عہدہ داروں کی ضرورت ہے (۱) صدر انجمن جو صدر مدرس ہوگا۔ (۲) نائب صدر جو خصوصی دلچسپی رکھنے والا مدرس ہوگا۔ (۳) طلباء میں ایک بہترین لڑکا جلسہ کا صدر نشین بن جائے گا۔ (۴) معتمد جلسہ ایک سمجھ دار طالب علم ہوگا۔ اسی طرح خازن وہ لڑکا بنایا جائے گا جو کفایت شعار ہونے کے علاوہ معتبر بھی ہوگا۔ (۶) ایک متین اور محتاط طالب علم کے ذمہ روئداد جلسہ لکھنے کا کام سپرد

ہوگا۔ باقی دوسرے طلبا، جن میں قوت ارادی اور انتظامی قابلیت ہوگی۔ اراکین انجمن کی حیثیت سے کام کریں گے۔

ہر مدرسہ میں متعدد انجمنیں قایم ہوسکتی ہیں | ایک مدرسہ میں کئی انجمنیں قایم کیجا سکتی ہیں مثلاً کشافہ۔ انجمن مباحثہ۔ عام خبریں دینے والی انجمنیں۔ موسیقی۔ پکوان۔ قرارت۔ وغیرہ کی انجمن عجائب خانہ۔ مدرسہ کی انجمن۔ ورزشی کرتبوں اور کھیلوں میں حصہ لینے والی انجمن اور تیراکی سیکھنے والی انجمن وغیرہ وغیرہ۔

ہوس سسٹم | بے موقع نہ ہوگا اگر اس ضمن میں ہوس سسٹم کے متعلق کچھ کہا جائے کیونکہ یہ طریقہ بھی مثل دیگر انجمنوں کے قیام ضبط مدرسہ میں بہت کچھ مدد دیتا ہے۔ انگلستان کے پبلک اسکولز میں عام طور پر رائج ہے اور بعض ہندوستان کے مدارس میں بھی پایا جاتا ہے چنانچہ جامعہ علیگڈھ میں اس کا رواج ایک عرصہ سے ہے۔ ہمارے پاس بھی مدرسہ عالیہ میں یہ طریقہ جاری ہے اس طریقہ کی رو سے مدرسہ یا بورڈنگ کو چند ممتاز ہستیوں کے نام پر تقسیم کیا جاتا ہے جن کی مایہ ناز ہستیوں سے مدرسہ کو متعدبہ فائدہ حاصل ہوا۔

طلبار کو عام طور پر اپنی جماعت سے لگاؤ اور ہمدردی رہتی ہے۔ اس طریقہ کی موجودگی میں ان کی یہ ہمدردی اپنے ہاؤس کی طرف منتقل ہوجاتی ہے گویا جماعتی ہمدردی کو وسعت دینے کا یہ طریقہ ایک بہترین آلہ ہے۔ یہ دیکھا اور سنا گیا ہے کہ طلبار اپنے ہاؤس کی نیک نامی کو عین اپنی شہرت تصور کرتے ہیں اور اس کے وقار کو برقرار رکھنے اور ترقی دینے کے لئے انفرادی اور اجتماعی کوشش کرنے میں دریغ نہیں کرتے۔ قیام ضبط کا مدار طبیعت کے اسی قسم کے رجحانات پر منحصر ہے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے حقیقی ضبط بیرون مدرسہ ظاہر ہوتا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ ڈیپارٹمنٹل ٹورنمنٹ کے زمانہ میں کھیل کے میدان پر ایک شور وغوغا رہتا ہے جو طلبار سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ہماری رائے میں اس شور کو صرف طلبار کی طرف منسوب کرنا درست نہیں۔ کھیل کے میدان پر پبلک اور طلبار ایک جگہ جمع رہتے ہیں قیام ضبط کی خاطر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ طلبار کے لئے کھیل کے میدان پر ایک علحدہ مقام مختص کردیا جائے جس سے

طلبا نہ صرف مدرسین کی نگرانی میں رہیں گے بلکہ اپنے افعال کے آپ ذمہ دار رہیں گے۔

اسکوٹنگ کا اثر ضبط مدرسہ پر نظم و نسق یا صدر مدرس اور مدرسین میں اشتراک عمل یا اولیائے طلبا کے تعاون یا مدرس کی شخصیت وغیرہ کا ضبط مدرسہ پر جو اثر پڑتا ہے اسی طرح کشافہ کو بھی قیام ضبط مدرسہ میں خاصہ دخل ہے۔ ایک خاص قسم کی خوبی جو ایک کشافہ میں پائی جاتی ہے یہ ہے کہ وہ اپنے اور اپنے ساتھیوں کے وقار کو باقی رکھتا ہے۔ قانون کشافہ کی رو سے ایک کشاف کا فریضہ ہے کہ وہ اپنی عادات و خصائل کو بہتر سے بہتر بنائے۔ اپنے وقار کا خیال اس کے اندر ایک ایسی حسی قوت پیدا کرتا ہے کہ وہ اپنا کام آپ کرتا اور دوسروں کا دست نگر ہونا نہیں چاہتا۔ ظاہر ہے کہ اس کا یہ عمل ذمہ دارانہ حیثیت سے کام کرنے کے قابل بناتا ہے یہی وہ طاقت ہے جو ضبط مدرسہ پر اثر انداز ہوسکتی ہے وہ اپنے عمدہ خصائل کے سبب ہم جماعتوں کے ساتھ نیک سلوک کرتا اور مدرسہ کے عام کاروبار اور جلسوں میں ضبط قایم رکھ سکتا ہے۔

کشاف مدرسہ کے وقار کا ایک ایسا نمونہ پیش کرتا ہے کہ اس کے ہم مدرسہ لڑکے اس کی تقلید کرنے لگتے ہیں۔ وہ اپنے عمل اور قوت ارادی سے مدرسہ کے باہر دوسروں میں کام کرنے کی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے اکثر دیکھا جاتا ہے کہ کشافوں کو عملی طور پر کام کرتے ہوئے دیکھ کر انتظامی امور میں ذمہ دارانہ حیثیت سے کام کرنے کا موقعہ دیا گیا ہے چنانچہ انھوں نے اپنے فرض منصبی کو نہایت عمدگی سے ادا بھی کیا اور خاص شہرت حاصل کی ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ان میں کا ایک اچھا مانیٹر بن کر جماعت میں ضبط قایم رکھ سکتا ہے۔

کشافہ کی کوششیں کس قدر مسرت بخش ہوتی ہیں اور کیوں نہ ہوں جب کہ ان کو باقاعدگی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ انہیں بتلایا جاتا ہے کہ اپنے ساتھی بھائیوں کی امداد کو اپنا اولین فرض سمجھو۔ خود داری کا جذبہ پیدا کرو اور ہمیشہ چست و چالاک رہو تو ظاہر ہے کہ ان اوصاف کی موجودگی سے نہ صرف بیرونی بلکہ اندرونی ضبط قایم ہوگا جس کا ضبط مدرسہ پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔

تعلیم کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ عملی زندگی کے لئے تیار کیا جائے جس کی اعانت

کشافہ کرتا ہے تو لازم ہوا کہ مدرسین اور طلبار تعلیم کے ساتھ ساتھ کشافہ میں بھی دلچسپی لیں تاکہ اس کی بنا مستحکم طریقہ پر رکھی جا سکے چونکہ ہر مقصد کے حاصل کرنے کے لئے قوت عمل کی ضرورت ہے اور کشافہ عملی تعلیم میں داخل ہے اس لئے کشافہ میں حصہ نہ لینا تعلیمی مقصد سے کوسوں دور ہو جانا ہے۔ اسکوٹنگ کی تعلیم خود پٹرول کے اصول پر ہے ہر پٹرول لیڈر کو اپنے آپ پٹرول سنبھالنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ کیمپ میں انھیں مختلف عہدے دئے جاتے ہیں۔ کورٹ آف آنر۔ ایک مجلس ہوتی ہے جس میں مختلف کارندے مل کر مشورہ کرتے ہیں اس طرح ان میں ہر آن خود اعتمادی اور یا ضبط تنظیم کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

صدر مدرسہ اور مدرسین کی یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ ہر مدرسہ میں جہاں تک ہو سکے طلبار کشافہ میں شریک کئے جائیں۔ اور اساتذہ صاحبان کو چاہیئے کہ وہ اپنا نام بھی کشافون میں شریک کرکے ان کی تعداد میں امکانی اضافہ کریں اور اس کی ٹریننگ سے فائدہ اٹھائیں جملہ صدر مدرسین اور ان کے ماتحت اساتذہ سرگرم حصہ لیں گے تو طلبار بھی خود بخود اپنے اساتذہ کی پیروی کریں گے اور ہر مدرسہ میں کشافہ کی متعدد جماعتیں قایم ہونے سے ضبط مدرسہ پر بہت اثر پڑے گا اس بیش بہا مقصد کے حصول کے لئے کشافہ کی تحریک کو موثر اور زیادہ موثر بنانے کے لئے (ا) ٹریننگ کالج میں کشافہ کی تعلیم کا انتظام کیا جائے (ب) مختلف مظاہروں اور نقاریر کے ذریعہ تحریک کشافہ کی تشہیر کی جائے تاکہ بالراست و بالواسطہ مدرسہ کے غیر کشاف طلبار اس عالمگیر تحریک کے مفید اصول پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں۔

اولیائے طلبار سے تعاون کا اثر ضبط مدرسہ پر

گھر کا ضبط ماہرین تعلیم اس پر متفق الخیال ہیں کہ گھر ہی سے بچے کی تعلیم و تربیت شروع ہوتی ہے۔ بچہ چند خواہشات کا مجموعہ ہوتا ہے اور گھر ان میں سے کسی ایک کی تکمیل کرتا ہے گھر میں وہ بہ نسبت مدرسہ کے زیادہ خوش اور آزاد رہتا ہے یہاں اس کو اپنی ذہنی کیفیات اور رجحانات کو ظاہر کرنے کا زیادہ موقع ملتا ہے اس لحاظ سے والدین کو مواقع حاصل ہیں کہ وہ اپنے اعمال و کردار کے اچھے نمونے سے بچے کے افعال میں ضبط قایم کردیں تاکہ ہر ایک

بچے سے مدرسہ کا ضبط قایم ہوسکے۔

گھر اور مدرسہ کا باہمی ارتباط تعلیم وتربیت اور سیرت سازی کا انحصار بڑی حد تک ضبط پر ہے اور جب تک مدرسہ اور گھر دونوں مل کر دوش بدوش کام نہ کریں اور باہمی اتحاد عمل اور تعاون کے ساتھ ان کی زندگی کو سدھارنے اور درست کرنے میں ہم آہنگ نہ ہوں بہتر نتائج برآمد ہونے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ آج کل مدرسین اور والدین کا عمل یہ بتاتا ہے کہ گویا دونوں اپنی اپنی جگہ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ طلبار کی گھر اور مدرسہ کی زندگی ایک دوسرے سے کچھ بھی تعلق نہیں رکھتی لیکن یہ خیال جس قدر افسوس ناک ہے اس سے کہیں زیادہ مضر ہے بچے دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں میں سے صرف پانچ گھنٹے مدرسہ میں بسر کرتے ہیں اور تقریباً اٹھارہ انیس گھنٹے مدرسہ سے باہر گھر اور اپنے محلہ وغیرہ میں گزارتے ہیں ظاہر ہے کہ مدرسہ کا محدود وقت ان کی سیرت سازی کے لئے ہرگز کافی نہیں ہوتا۔ اگر گھر اور مدرسہ میں باہمی تعلق رہے تو اس کمی کی ایک حد تک تلافی ہوسکتی ہے باہمی تعلق کے قیام کے لئے مدرسہ مختلف مواقع فراہم کرسکتا ہے مثلاً اولیائے طلبار کو مدرسہ کے سالانہ جلسوں میں مدعو کرکے ان کے بچوں کے کاموں سے ان کو روشناس کرانا۔ دارالاقامہ کے معائنہ کا موقع دینا۔ دارالمباحثہ کے کاروبار سے ان میں مدرسہ سے دلچسپی پیدا کرانا۔

اس کی ایک اور صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اساتذہ اور تعلیم سے ہمدردی رکھنے والے چند منتخب اولیائے اطفال کی ایک مجلس قایم کی جائے۔ یہ جماعت مدرسہ اور گھر کی ایک درمیانی کڑی ہوگی جو گھر اور مدرسہ کو قریب سے قریب تر کرکے یکسانیت عمل اور قیام ضبط مدرسہ کا باعث ہوگی اس سے کار اساتذہ اور مقصد مدرسہ میں بڑی خوبی اور آسانی پیدا ہوجائیگی۔

گھر پر بچوں کے ساتھ والدین کا سلوک بعض گھروں کی بے جا رعایت اور بعض کی غیر ضروری سختی بچوں میں اپج اور آزادی سے کام کرنے کا حوصلہ پیدا نہیں ہونے دیتی اور بعض اوقات دونوں صورتیں ساتھ ہی ساتھ اختیار کی جاتی ہیں یعنے بے جا لاڈ و پیار اور غیر ضروری سختی اس کا مجموعی نتیجہ بچے کی طبیعت میں بے ضبطی اور والدین سے نفرت پیدا کرتا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ گھر پر جو بچے کا پہلا تعلیمی ادارہ ہے بچے کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے

تاکہ اس کو اپنی نفسیاتی کیفیات کے ظاہر کرنے کے مواقع فراہم رہیں اور مدرس اسکی کیفیات اور طبیعتوں کے اتار چڑھاؤ کی نسبت والدین سے کافی معلومات بہم پہنچا کران کو صحیح راستہ پر ڈالے یہ اوسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ والدین خود اس کی نفسی کیفیات سے بخوبی واقف رہ کر اس خصوص میں مدرس کی رہنمائی کریں۔

مدرسہ کے متعلق رائے عامہ ایک اچھا مدرس اس امر کی کوشش کرتا ہے کہ اس کے مدرسہ کے متعلق رائے عامہ اچھی رہے کیونکہ وہ وزنی ہونے کے سبب اخلاقی قوت کا کام دیتی ہے۔ اس سے مجموعی اور انفرادی دونوں طرح پر طلبار کے چال وچلن اور عادات و خصائل پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ یہ قانون اور مدرسہ کی روایات دونوں کی معاون ہوتی ہے۔ یہ عزت و توقیر کے غیر تحریری قواعد وضوابط کو ظاہر کرتی اور سب کو ان پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دیتی ہے۔ مدرسہ کے لئے رائے عامہ کی خوبی بالکلیہ ضبط مدرسہ پر منحصر ہے۔

اختتام ضبط مدرسہ کے متعلق تفصیلاً بحث کرنے کے بعد یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند اہم اور ضروری امور خاص طور پر پیش کئے جائیں تاکہ مضمون کی وسعت کے لحاظ سے ان کو سمجھنے میں سہولت ہو۔

بلاخوف و تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ قیام ضبط مدرسہ کے لئے شرط اولین مدرسہ کا عمدہ اور موزوں محل وقوع۔ کافی اور ہوادار عمارت۔ کافی اور آرام دہ فرنیچر۔ ضروری اور جاذب توجہ آلات تعلیمی اور عمدہ نظم ونسق ہے اگر کسی مدرسہ میں بغیر ان ضروری اشیار کے ضبط قایم رہے تو یہ اپنی آپ نظیر ہے اس کی نظیر دوسرے مدارس کو ان اجزا کے قیام ضبط سے مستغنی نہیں کر سکتی۔

قیام ضبط مدرسہ کی زنجیر کی دوسری اہم کڑی مدرس کی شخصیت ہے جس کے اجزائے ترکیبی میں اس کی وجاہت۔ آواز حکمت عملی۔ انصافانہ برتاؤ۔ طلبار کے ساتھ ہمدردی۔ جوش عمل۔ قوت ارادی۔ اور طرز تعلیم داخل ہے۔ ایک مدرس میں ان اوصاف کا نقطہ اعتدال پر ہونا ضبط مدرسہ پر بہت اچھا اثر ڈال کر طلبار کو شاہ راہ ترقی پر گامزن کر دیتا ہے مدرس کی اچھی شخصیت طلبار کو اپنے رنگ میں رنگ کر ملک اور مالک کا خیر خواہ اور سماج کا مایۂ ناز

فرد بنا دیتی ہے۔

حقیقی ضبط مدرسہ کا قیام مہر و محبت پر ہے نہ کہ قہر و غضب پر۔ مشفقانہ منصفانہ اور کم احکامات پر نہ کہ جابرانہ اور ازدیاد احکام پر۔ ضبط مدرسہ کا حامل طلبار کی جائز آزادی اور مدرسہ کی متعدد انتظامی مجلسوں کا عمدہ طریقہ کار ہے اگر طلبار کو انتظامی مجلسوں کے ذریعہ اپنا کام کرنے کا موقعہ دیا جائے تو کار مدرسہ کو بھی بطریق احسن انجام دینے کی ان میں صلاحیت پیدا ہوگی۔ طلبار طبعاً اپنے مفوضہ کاموں میں ضبط کی فضا کو پسند کرتے ہیں۔ تاکہ شور و شغب ان کاموں کے سرانجام دینے میں حائل نہ ہو۔ ان کی یہ خصوصیت ان کے خالص تعلیمی کاموں پر رونما ہوکر ان کو چار چاند لگادیگی۔

بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اخلاقی تربیت ضبط مدرسہ کی روح رواں ہے اس کے ذریعہ جو ضبط قایم کیا جاتا ہے وہ نہ صرف دیرپا بلکہ حقیقی ہوتا ہے اور یہ ضبط زندگی کے ہر شعبہ کو کامیاب بناتا ہے۔ اس کی ضرورت ہے کہ مدارس میں اس طرف مخصوص توجہ برتی جائے اخلاقیات کی تعلیم کو بجائے کتابی حد تک رکھنے کے بلحاظ اخلاقی تربیت، عملی بنایا جائے۔ اس کو عملی بنانے کا بہترین ذریعہ خود مدرس کا اپنا اچھا نمونہ پیش کرنا اور بدوران درس میں ہر موقع سے فائدہ اٹھاکر اخلاقی تربیت کا طلبار میں احساس پیدا کرنا ہے۔ اخلاقی تربیت کے بہترین مواقع اس وقت حاصل ہوتے ہیں جب کہ طلبار کو آزادانہ حرکات کے مواقع حاصل ہوں اور اس قبیل کے مواقع تعلیمی تفریحات۔ منظم کھیل اور کشافی مشاغل و مصروفیات میں حاصل ہوتے ہیں اور ان کا ترتیب دینا مدرسین کے فرائض میں داخل ہے۔

عام طور پر دنیا کے کاموں کو جاذب توجہ بنانے اور ان میں ضبط پیدا کرنے کا ذریعہ تحفہ جات و انعامات قرار پایا ہے۔ چنانچہ سیول اور فوجی ملازمین کو ان کی کارکردگی کے لحاظ سے تمغہ جات اور طلبار کو ترغیبی وظائف کا دینا ہمارے اس خیال کی تائید کرتا ہے۔ پس اس امر کی ضرورت ہے کہ قیام ضبط کے لئے مدارس میں تحفے اور انعامات کے دینے کا ضرور انتظام رہے۔ اور یہ باموقع اور طلبار کے ابھارنے کے موجب ہوں۔

سزائے جسمانی کو قیام ضبط مدرسہ کا جزو سمجھا جاتا ہے ہمارے خیال میں سزائے جسمانی بجائے قیام ضبط کے انتشار ضبط کا باعث ہوکر طلبار اور مدرسین میں منافرت پیدا کردیتی ہے۔

سزائے جسمانی ذہنی یا طبعی شرارت کے لئے جو جولانی طبیعت کا نتیجہ ہو مطلقاً نہ دی جائے بلکہ اخلاقی لغزش مثلاً جھوٹ۔ چوری وغیرہ کو مستحق سزا تصور کیا جائے جب کہ طلباء کی عمر، تصور اور ان کی استعداد کا کافی لحاظ رہے۔

قیام ضبط مدرسہ کے لئے صدر مدرس اور مدرسین مدرسہ اور اولیائے طلباء میں اشتراک عمل ایک جزو لاینفک ہے۔ بغیر اس اشتراک عمل کے نہ مدرس کی شخصیت کارگر ہو سکتی ہے اور نہ عمدہ مکان مدرسہ اور نخصہ جات کی تقسیم۔ لہذا ارباب متعلقہ کو چاہیئے کہ اپنے اشتراک عمل کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ قیام ضبط مدرسہ میں وہ ممد معاون ہے یا سد راہ۔ اگر سد راہ ہے تو فوراً اس کے ازالہ کی کوشش کر کے دیگر اجزائے قیام ضبط مدرسہ کو موثر و کارگر ہونے کا موقع دیں ورنہ اس پر عمل کریں۔

تجاویز

(۱) عمارت مدرسہ اس کا محل وقوع و آلات تعلیمی و دیگر ضروری سامان مدرسہ مناسب و موزوں ہونا چاہیئے۔

(۲) ہر مدرسہ میں تعداد طلباء وسعت مکان اور اسٹاف کے لحاظ سے زیادہ نہ ہو تاکہ ضبط قایم رہ سکے۔

(۳) ایک جماعت میں مختلف ضرورتوں کے لحاظ سے متعدد مانیٹر ہونے چاہیئں۔

(۴) مدرس اپنی شخصیت کو حتی الوسع موثر بناتا رہے۔

(۵) مدرسین کی کارکردگی بہتر ہونے کے لئے ضرورت اس کی ہے کہ بعجلت ممکنہ ٹرینڈ ہو جائیں اگر وہ نہ ہوں۔

(۶) حتی الوسع اساتذہ کشافہ۔ تربیت جسمانی۔ اور صرف ایسے ہی دیگر مفید سررشتہ امتحانات میں شرکت فرمائیں۔

(۷) تعریف و تحسین و اجتماعی انعامات کے ذریعہ طلباء کی قابل قدر کوششوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

(۸) جہاں تک ہوسکے مدرسین کو طلباء اور اولیائے طلبار سے فرداً فرداً واقف ہونے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

(۹) بچوں کی عملی تربیت کے لئے مختلف نوعیتوں کی متعدد انجمن ہوں۔

(۱۰) طلبار کے بیرونی مشاغل سے بھی حتی الوسع واقفیت حاصل کی جاتی رہے۔

(۱۱) تحریک کشافہ کو اس کی عملی اور تربیتی اہمیت پر نظر کرتے ہوئے شریک امتحان معلمی کیا جائے۔

شذرات

خلاصہ رُوداد جشن سیمین مبارک مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ چنچل گوڑہ بلدہ

بتاریخ ۹ ارفروردی ۱۳۴۴ ف مدرسۂ ہذا میں جشن مبارک منایا گیا۔ ٹھیک نو بجے مدرسہ کی شاندار عمارت میں تمام اساتذہ وطلباء کے علاوہ دیگر اولیاء طلبار بھی جمع ہو گئے۔

سب سے پہلے مدرسہ کے اسکوٹ ماسٹر مسٹر بال ریڈی اور اسکوٹ نے پرچم آصفی بلند کیا اور سلامی دی اور کمسن اور خوش الحان طلباء نے ترانہ پڑھا۔ پھر سب کے سب مدرسہ کے لکچر ہال میں آگئے۔ جہاں بخط جلی زرد اطلس پر یہ شعر لگایا گیا تھا۔

زندہ کردی چو مسیحا علم و فن را در دکن ‏ ‏ ‏ زندہ باش اے حضرت عثماں علیخاں زندہ باش

اس کے بعد مدرسہ کے ایک طالب علم نے قرات پڑھی اور مسٹر ترل راؤ مددگار مدرسۂ ہذا نے پرارتھنا سنایا۔

بعد ازاں مسٹر ڈنکرنا راین۔ بی۔اے۔بی۔ٹی اول مددگار مدرسہ نے حضرت تاجدار دکن وبرار خلد اللہ ملکہ وسلطنتہٗ کا وہ پیام اقدس جو اپنی عزیز رعایا کے نام شرف صدور لایا تھا پڑھ کر سنانے کی سعادت حاصل کی جسے سب نے نہایت ادب کے ساتھ کھڑے ہو کر سنا۔

مولوی عبد القدیر صاحب مددگار مدرسہ نے ایک دلچسپ نظم پڑھی اور حاضرین سے داد حاصل کی
پھر مسٹر مبین الرحمن و مسٹر پاشا متعلمان جماعت دہم نے اعلیٰ حضرت خسرو دکن کے ۲۵ سالہ
عہد حکومت کے فیوض و برکات بیان کئے۔ اور مولوی ظفر الرحمن صاحب مددگار مدرسہ نے ایک
دلچسپ تقریر کی جس میں سرکار کے پچیس سالہ عہد حکومت کے دیگر فیوض و برکات کے علاوہ تعلیمات
کی ترقی اور خاص کر اردو کی نشو و نما اور ترقی کا ذکر کیا اور حکومت آصفیہ کی تعلیمی خوبیاں بیان کرتے
ہوئے کہا کہ یہ ہمارا طریقہ تعلیم ہندوستان کے لئے شمع راہ بن کر رہے گا۔

اس کے بعد مولوی سید علی محمد صاحب اجلال نے ایک پر زور و دلکش نظم پڑھی اور حاضرین
سے خراج تحسین حاصل کیا۔

پھر مولوی محبوب الحسن صاحب مددگار شعبہ دینیات نے حضرت اقدس و اعلیٰ کے محاسن
کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارے محبوب آقا کی زندگی ہمارے لئے نمونہ ہے اور ہم کو اپنے
لئے نمونہ بنانا چاہیے۔

آخر میں صدارتی تقریر ہوئی جس میں برکات عہد عثمانی کا ذکر کیا گیا اس کے بعد مولوی
محبوب الحسن صاحب نے آقائے ولی نعمت و شہزادگان بلند اقبال و شہزادیاں فرخندہ فال
و خانوادہ آصفی کے لئے دعا فرمائی اور تمام مجمع کے آمین آمین کی صداؤں سے مدرسہ کا ہال گونج
رہا تھا۔

آخر میں تھری چیرز پر جلسہ نہایت کامیابی کے ساتھ برخاست ہوا طلبا کو شیرینی۔ فواکہات
اور بیاجز تقسیم کئے گئے۔

خلاصہ روئداد جشن سلور جوبلی مبارک مدرسہ فوقانیہ دارالشفاء بلدہ

بتاریخ ۱۹ رفروری ۱۳۴۵ ف جلسہ منعقد کیا گیا
جس میں مدرسہ کی جانب سے حضرت بندگان عالی
متعالی شہزادگان و شہزادیان بلند اقبال نیز شہزادہ مکرم جاہ بہادر اور شہزادی دردانہ بیگم
صاحبہ و فرحت بیگم صاحبہ کی دعائے عمر و اقبال سے متعلق ایک بسیط مضمون پڑھا گیا جس میں
کچھ فارسی زبان کی دعائیہ نظم اور کچھ عربی زبان کی دعائیہ عبارت بھی شامل تھی۔ ایک طالب علم
مسمی محمد معین الدین متعلم مدرسہ نے اورنگ آباد دکن کے عنوان سے ایک ۱۶ صفحات کا تاریخی مضمون

پڑھا جو چھوٹی سیفو کی کتابی شکل میں طبع کرایا گیا تھا۔ مولوی عبد السلام صاحب ذکی اور مولوی طلعت یزدی صاحب اور سید تراب علی صاحب منشی فاضل مددگار ان مدرسہ ہذا نے قصائد و مسدسات تہنیت سنا کر حاضرین کو محظوظ فرمایا۔ مولوی سید دلدار حسین صاحب اظہر نے جو قطعات تاریخی جشن سلور جوبلی بارگاہ ظل سبحانی میں پیش کرنے کی عزت حاصل کی تھی اس جلسہ میں پڑھ کر سنائے جو نہایت قابل تعریف تھے۔

خلاصہ روئداد جشن سلور جوبلی مدرسہ وسطانیہ شاہ علی بنڈہ

۱۹ ر فروری ۱۳۵۵ف صبح ۸ ساعت بازی گاہ مدرسہ میں حسب پروگرام مطبوعہ طلبا، اور اساتذہ کا اجتماع ہوا صدر صاحب مدرسہ نے شبیہ ہمایونی کی نقاب کشائی اور گل پوشی کی عزت حاصل کی اسکوٹ نے پرچم آصفی کو لہرایا حاضرین نے سلامی دی۔ لکچر ہال میں قومی ترانہ اور دعا کے بعد مکرر شبیہ مبارک کی نقاب کشائی و گل پوشی عمل میں آئی جلسہ کا آغاز قرارت، پر ارتقا اور بندگان عالی کی ایک نظم سے ہوا جس کا ابتدائی مصرعہ یہ ہے

تجھے یہ جشن عشرت خسرو گیہان مبارک ہو

طلبا، مدرسہ نے عہد عثمانی کے مختلف زرین ابواب پر تقریریں کیں اور نظمیں پڑھیں مولوی عبد الجبار صاحب جبار نے اردو قصیدہ پڑھا مولوی شیخ مہتاب صاحب نے دور دمان آصفی پر مولوی لیاقت علی خاں صاحب مددگار نے شاہ پرستی اور برکات عثمانی پر مولوی مصباح الدین صاحب مددگار نے دور عثمانی میں گیمس اور اسپورٹس کی ترقی پر سشرو شوا ناتھم اسکوٹ ماسٹر نے دور عثمانی میں کتانہ کے قیام اور اس کی ترقی پر اور صدر صاحب مدرسہ نے عہد عثمانی میں تعلیمی ترقی پر مبسوط مدلل اور پرجوش تقریریں کیں مولوی محمد فاضل صاحب فاضل نے فارسی نظم سنائی جو قابل تعریف تھی سب کے آخر میں بندگان عالی کے لئے دعا کی گئی اور شیرینی کی تقسیم کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔ سہ پہر میں مختلف اسپورٹس ہوئے اسکوٹس نے کیمپ فائر کیا اور سات بجے شام کو بعد تقسیم انعامات جلسہ ختم کیا گیا۔

خلاصہ روئداد جشن سلور جوبلی مبارک مدرسہ وسطانیہ گوشہ محل بلدہ

۱۹ ر فروری صبح ۹ ساعت بصدارت جناب مولوی محمد عبد النور صاحب صدیقی بی۔اے۔بی ٹی

صدر مدرس مدرسہ جلسہ سلور جوبلی مبارک منعقد ہوا جس میں جملہ مدرس صاحبین وطلبائے مدرسہ ہذا شریک تھے۔ مولوی سید فصیح اللہ حسینی صاحب مددگار نے تبرکاً وتیمناً جلسہ کا آغاز کیا اور مسٹر شاردی نے پرارتھنا پڑھی جناب صدر صاحب مدرسہ نے اعلیٰحضرت اقدس کا پیام بنام باشندگان وخیر طلبان ریاست حیدرآباد دکن سنایا جس کو حاضرین نے کھڑے ہوکر نہایت عقیدت مندی سے سنا۔ اس کے بعد مولوی یوسف الدین احمد صاحب اول مددگار نے ذرائع آب رسانی وآبپاشی عہد عثمانی پر مضمون پڑھا جس میں اخراجات کے اعداد وشمار کی تفصیلی بحث تھی جس کو بندگان عالی نے اپنی عزیز رعایا کی فلاح وبہبود کے لئے منظور فرمایا تھا اور جو آپ کے سچے ایثار کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ پھر مولوی محمد عبدالحکیم صاحب مددگار نے ایک مدحیہ قصیدہ پڑھا جو آصف جاہ اول سے نواب میر محبوب علی خاں بہادر کے اسماء گرامی کی صنعت ایہام، حضور پرنور کے ایثار، جشن سلور جوبلی کی مبارکباد اور دعائے کامگاری شہریار دکن پر مشتمل تھا اس کے ساتھ ہی موصوف نے ایک مضمون برکات عہد عثمانی بھی سنایا جس میں حضور پرنور کے فلاح وبہبود اور ایثار کی تفصیل شرح وبسط کے ساتھ تھی اور مسٹر رام راؤ مددگار نے قیام جامعہ عثمانیہ اور اس کے فوائد پر مضمون سنایا جس میں زمانہ قیام سے اب تک جس قدر ملک نے فائدہ اٹھایا اس کی تفصیلی بحث تھی جب تقریر ختم ہوئی تو بوائے اسکوٹس نے کورس جشن عثمانی خوش الحانی سے سنایا۔ سب کے آخر میں مولوی سید فصیح اللہ حسینی صاحب نے ایک دعائیہ مضمون پڑھا جو اپنے اسم گرامی کی مناسبت سے بلحاظ فصاحت الفاظ اپنا آپ نظیر تھا جس کے آخر میں دعائیہ مقفع مسجع عربی عبارت بھی تھی اس سے سامعین پر ملک ومالک کی وفاداری وعقیدت مندی کا پرسکون جذبہ طاری ہوگیا حاضرین نے دعائے عمر واقبال بندگان عالی وشہزادگان بلند اقبال وشہزادیان فرخندہ فال پر آمین کہا اور جلسہ تھری چیرز کے ساتھ ختم ہوا۔

خلاصہ روئداد جشن سلور جوبلی مبارک مدرسہ تحتانیہ قصبہ ویل پور تعلقہ آرمور ضلع نظام آباد

۱۲/ فروردی ۱۳۴۵ف طلبا اور رعایا کا کثیر مجمع موجود تھا فوٹو لیا گیا۔ رات بھر مدرسہ میں روشنی کی گئی۔ ۱۳/ فروردی ۱۳۴۵ف صبح وساعت ترانہ کے ساتھ جلوس نکالا گیا جس میں معززین مقامی بھی شریک تھے۔ پرچم آصفی کے

سامنے سلامی دی گئی پھر ۴ ساعت شام بصدارت مسٹر سیتا رام ریڈی مقدم کوتوالی جلسہ منعقد ہوا پہلے طلباء کے اسپورٹس ہوئے پھر حمد و نعت سے جلسہ شروع کیا گیا مسٹر گنگا ریڈی مددگار اور طلبائے مدرسہ نے تلنگی اور اردو میں برکات عہد عثمانی پر تقریریں کیں صدر صاحب مدرسہ نے رپورٹ مدرسہ سنائی اور برکات عہد عثمانی پر روشنی ڈالی حاضرین کے شکریہ اور دعائے عمر و اقبال ظل الٰہی پر جلسہ ختم ہوا آخر میں طلباء کو انعامات تقسیم کئے گئے۔

خلاصہ روئداد جشن سلور جوبلی مبارک مدرسہ تحتانیہ ابراہیم پٹن تعلقہ آرمور ضلع نظام آباد

۱۴ر فروردی ۱۳۴۶ف ۳ر ساعت شام بصدارت مولوی سبط حسین صاحب انچارج منتظم پولیس جلسہ منعقد ہوا۔ ترانہ کے ساتھ جلوس نکالا گیا شبیہ مبارک کے سامنے پولیس مقامی اور طلباء نے سلامی دی صدر صاحب اور ایک مددگار صاحب نے نیز طلباء مدرسہ نے تقریریں کیں صدر نشین صاحب نے برکات دور عثمانی پر تقریر فرمائی اسپورٹس میں اول و دوم آنے والے طلباء اور نادار طلباء کو اشیائے نوشت و خواند دیے گئے دعائے ترقی عمر و اقبال بندگان عالی پر جلسہ برخاست ہوا اور شرکاء جلسہ کو شیرینی تقسیم کی گئی

خلاصہ روئداد جشن سلور جوبلی مبارک مدرسہ نمکور تعلقہ دیگلور

یکم ذیحجہ ۱۳۵۵ھ صبح ۸ ساعت طلباء و مدرسین و معززین و رعایا کا کثیر مجمع تھا ترانہ اور دعا سے جلسہ کا آغاز ہوا چند طلباء نے اردو اور مرہٹی میں مکالمے کئے اور بندگان عالی کے ترقیات و برکات پر تقریریں کیں۔ مولوی شرف الدین صاحب و مسٹر رام لنگم صاحب مدرسین نے اردو اور مرہٹی میں دور عثمانی کے ترقیات اور بلدہ کی آمدنی و خرچ کی توضیحی تقریر کی پھر صدر صاحب مدرسہ نے بندگان عالی کے کارہائے نمایاں بیان کرتے ہوئے دعائے ترقی عمر و اقبال پر جلسہ ختم کیا اسی روز سہ پہر میں طلباء کے اسپورٹس ہوئے۔ کھیل میں کامیاب اور نادار طلباء کو انعامات دیے گئے۔ اور شیرینی تقسیم کی گئی۔ ۳ر ذیحجہ ۱۳۵۵ھ ۷ ساعت شام میں روشنی کی گئی اور ۱۱ ساعت شب میں جلسہ برخاست ہوا۔

خلاصہ روئداد جشن سلور جوبلی مبارک مدرسہ تحتانیہ ملے گاؤں تعلقہ احمد پور ضلع بیدر شریف

یکم ذیحجہ ۱۳۵۵ھ ۸ ساعت صبح پرچم آصفی کے ساتھ جلوس

نکالا گیا پولیس مقامی اور طلبا نے سلامی دی بعد دعائے سلامتی اعلیحضرت بندگان عالی جمیع طلبا و حاضرین کو شیرینی تقسیم کی گئی مختلف اسپورٹس ہوئے مدرس صاحبین نے عروج عثمانی پر تقریریں کیں انعامات تقسیم کرکے جلسہ برخاست ہوا۔

خلاصہ روئداد جشن سلور جوبلی مبارک مدرسہ تحتانیہ قصبہ لوہا تعلقہ قندہار ضلع ناندیڑ

۱۲ / فروردی ۱۳۴۶ف ۸ تا ۲ ساعت پرچم آصفیہ کے ساتھ جلوس نکالا گیا جس میں جناب ڈویژن افسر صاحب تعلقہ دیگلور کثیر التعداد رعایا، ملازمین سرکار عالی اور پولیس مقامی نے شرکت کی شبیہ مبارک کے سامنے پولیس نے سلامی دی اور طلبا نے حمد باری و دعائے سلامتی بادشاہ دکن پڑھی۔

۱۳ / فروردی ۱۳۴۶ف ۸ تا ۱۲ ساعت اسپورٹس ہوئے۔ ۲ تا ۵ ساعت طلبا نے تقریریں کیں اور ڈرامے اسٹیج کئے شب میں روشنی کی گئی۔

۱۴ / فروردی ۱۳۴۶ف ۹ تا ۱۱ ساعت مدرس صاحبان مدرسہ نے تقریریں کیں ۲ تا ۵ ساعت مسٹر نارائن راؤ صاحب مقطعہ دار نے طلبا کو انعامات تقسیم کئے اور جلسہ دعائے سلامتی و ترقی اعلیٰ حضرت بندگان عالی پر ختم ہوا۔

خلاصہ روئداد جشن سلور جوبلی مبارک مدرسہ تحتانیہ قصبہ مسکی تعلقہ لنگسگور ضلع رائچور

یکم ذیحجہ ۱۳۵۵ھ صبح تزک کے ساتھ جلوس نکالا گیا۔ پرچم آصفی اور شبیہ مبارک کے سامنے پولیس مقامی نے بصدارت مولوی سید محبوب حسینی صاحب منصرم منتظم پولیس سلامی دی۔ سہ پہر میں حسب پروگرام جلسہ کیا گیا جس میں قرارت کے بعد اردو اور کنڑی میں طالب علموں کے تقریری مقابلے اور مکالمے ہوئے آخر میں طلبا کے اسپورٹس ہوئے۔

۲ / ذیحجہ ۱۳۵۵ھ کو جلوس نکالا گیا اور بصدارت مولوی محمد علی خاں صاحب منتظم پولیس جلسہ کیا گیا۔ آخر میں طلبا کے اسپورٹس ہوئے۔

۳ / ذیحجہ ۱۳۵۵ھ غربا کو کھانا کھلانے کا انتظام کیا گیا اور سہ پہر میں بصدارت مولوی محمد علی خاں صاحب منتظم پولیس جلسہ کیا گیا۔ صدر صاحب مدرسہ نے بجیس سالہ

دورِ عثمانی کے فیوض و برکات پر روشنی ڈالی اور طلباء نے اردو اور کنڑی میں تقریریں کیں اور دعا سلامتی بادشاہ دکن پر جلسہ ختم ہوا۔

۴ ذیحجہ ۱۳۵۵ھ بصدارت منتظم صاحب موصوف جلسہ کر کے قصبہ ہذا کے چار مدارس کے طلباء کو انعامات تقسیم کئے گئے اور محتاجوں اور نادار طلباء کو پندرہ روپیہ کا پارچہ دیا گیا اور دعا سلامتی بادشاہ دکن پر جلسہ ختم ہوا۔

خلاصہ روئداد جشن سلور جوبلی مبارک مدرسہ تحتانیہ قصبہ کلاری تعلقہ لاتور ضلع عثمان آباد	۱۳ فروردی ۱۳۴۶ف صبح ۸ تا ۱۱ ساعت طلباء کو شیرینی

تقسیم کی گئی پرچم آصفی کا جلوس نکالا گیا پھر ۶ ساعت شام میں عام رعایا کا جلسہ منجانب پٹیل پٹواری قصبہ چاوڑی منعقد ہوا جس میں تقریریں ہوئیں اور شیرینی تقسیم کی گئی۔

۱۴ فروردی ۱۳۴۶ف ۸ تا ۱۱ ساعت اسپورٹس ہوئے پھر ۵ ساعت شام کو طلباء کا فٹ بال میاچ ہوا۔

۱۵ فروردی ۱۳۴۶ف صبح ۸ ساعت طلباء کو شیرینی تقسیم کی گئی پھر ۵ ساعت شام بصدارت مسٹر ہنمنت راؤ مالی پٹیل جلسہ منعقد ہوا جس میں منتظم صاحب پولیس اور سہ بھی شریک ننھے بچوں نے حمد اور ترانہ پڑھا مکالمے کئے۔ انعام وغیرہ تقسیم کئے گئے۔ صدر صاحب مدرسہ نے حالات خاندان آصفی پر تقریر کی مولوی غلام حسین صاحب نے نظم سنائی اور مولوی عبدالواحد صاحب نے اصلاحات ملکی و برکات عثمانی پر مرہٹی زبان میں تقریر کی اور دعائے سلامتی اعلیحضرت و شاہزادگان بلند اقبال پر جلسہ ختم ہوا۔

خلاصہ روئداد جشن سلور جوبلی مبارک مدرسہ تحتانیہ مردوڑی تعلقہ سدی پیٹھ ضلع میدک	۱۲ فروردی ۱۳۴۶ف ۸ تا ۹ ساعت صبح شبیہ مبارک کے سامنے

طلباء نے سلامی دی حمد باری کے بعد ترانہ کے ساتھ جلوس نکالا گیا جس میں معززین مقامی اور عام رعایا نے شرکت کی پھر ۴ ساعت شام طلباء ترانہ پڑھتے ہوئے مال گذھ روانہ ہوئے۔ اور بصدارت صدر مدرس صاحب مدرسہ طلباء کے مختلف اسپورٹس ہوئے اور انعامات تقسیم کئے گئے۔ مسٹر وینکٹ جگناتھ ریڈی نے بڑے بچوں کو جو اسپورٹس میں اول نمبر پر آئے تھے

۱۰ عدد مڈل انعاماً پیش کئے جو شکریہ کے ساتھ لے کر تقسیم کئے گئے۔ دوسرے مدارس کے طلباء اور معزز حاضرین کی بھی شیرینی سے ضیافت کی گئی۔ پھر صدر صاحب مدرسہ نے اپنے آقائے ولی نعمت کے ساتھ محبت و خلوص کی بنسبت روشنی ڈالی اور جلسہ کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔

خلاصہ روئداد جشن سلور جوبلی مبارک مدرسہ تحتانیہ کنٹری مستقر یادگیر

۱۴ار فروری ۱۳۴۶ف بصدارت نواب ذوالفقار علی خاں صاحب بی۔ اے۔ ڈپ ایڈ انگلینڈ صدر مدرسہ فوقانیہ یادگیر جلسہ منعقد ہوا جس میں جملہ عہدہ داران و معززین مقامی شریک تھے شبیہ مبارک کی گلپوشی ہوئی طلباء نے پرچم آصفی کے سامنے سلامی دی ترانہ پڑھا صدر مدرسہ نے دعائیہ نظم پڑھی اسپورٹس ہوئے طلباء کو انعام دئے گئے شیرینی تقسیم کی گئی آخر میں صدر صاحب جلسہ نے برکات وفیوض دور عثمانی پر مجملاً روشنی ڈالی اور ظل سبحانی و شہزادگان و شہزادیان بلند اقبال کی دعائے عمر و اقبال پر جلسہ ختم ہوا۔

خلاصہ روئداد جشن سلور جوبلی مبارک مدرسہ وسطانیہ گنگاپور ضلع اورنگ آباد

۱۲ار فروری ۱۳۴۶ف صبح ترانہ کے ساتھ جلوس نکالا گیا جس میں تحصیل کے ہر محلہ کے لوگ بھی شریک تھے پرچم آصفی کے سامنے سلامی دی گئی شیرینی تقسیم کی گئی اور غرباء کو پارچہ وغیرہ دیا گیا پھر دوپہر میں بعد نماز ظہر حضور پُرنور کے لئے دعائے ترقی عمر و اقبال مانگی گئی طلباء نے اسپورٹس کئے شام میں روشنی کی گئی۔

۱۳ار فروری ۱۳۴۶ف بصدارت جناب تحصیلدار صاحب جلسہ عام منعقد کیا گیا شیرینی تقسیم کی گئی شبیہ مبارک کی گلپوشی ہوئی پھر قرأت کے ساتھ جلسہ کا آغاز ہوا اردو اور مرہٹی میں حمد و نعت نظمیں پڑھی گئیں اور ذات شاہانہ کی شان میں قصیدہ سنایا گیا۔ برکات عثمانی پر تقریریں ہوئیں۔ دلچسپ مکالمے ہوئے اور ڈرامے اسٹیج کئے گئے۔ بغیر آلات کے منھ اور ہاتھ کی مدد سے اسکول بینڈ بجایا گیا جو نئی اور قابل ذکر چیز تھی بعد نماز مغرب صدر صاحب جلسہ نے ایک تقریر فرمائی جس سے یہ ثابت کیا گیا کہ ذات ہمایونی میں شاہان سلف کی تمام خوبیاں موجود ہیں پھر تقسیم انعامات کے بعد دعائے ترقی عمر و اقبال ہمایونی پر جلسہ برخواست ہوا۔

۱۴ ار فرور دی ۱۳۴۶ف کو شام میں اسکوٹس کے دلچسپ مظاہرے دکھلائے گئے اور طلباء نے مکالمے اور نظمیں سنائیں۔

۱۵ ار فرور دی ۱۳۴۶ف شام میں روشنی کا انتظام کیا گیا مکالموں نظموں اور دلچسپ کھیلوں سے حاضرین کو محظوظ کیا گیا۔

خلاصہ روئداد جلسہ جشن سلور جوبلی مبارک مدرسہ تحتانیہ قصبہ ساکول تعلقہ نیلنگہ ضلع بیدر شریف

۱۲ ار فرور دی ۱۳۴۶ف صبح ۸ ساعت طلباء و مدرسین مدرسہ جو کثیر تعداد میں حاضر تھے ترانہ پڑھتے ہوئے سلور جوبلی ہال پہنچے جہاں شبیہ مبارک کی گلپوشی کی گئی پولیس اور طلباء نے سلامی دی اور ظل اللہ کے لئے دعا مانگی پھر ۴ ساعت شام بصدارت جناب منتظم صاحب پولیس جلسہ ہوا جس میں طلباء کے مختلف اسپورٹس ہوئے۔

۱۲ ار فرور دی ۱۳۴۶ف ۸ ساعت صبح مقامی عہدہ دار رعایا و طلباء جلوس کی شکل میں نکلے مسجد و مندر میں دعائے تندرستی ظل اللہ مانگی گئی پھر سہ پہر میں مختلف اسپورٹس ہوئے اور کشتیاں ہوئیں صدر صاحب جلسہ نے کشتی جیتنے والوں کو انعامات عطا کئے۔

۱۴ ار فرور دی ۱۳۴۶ف صبح غربا اور معذوروں کو غلہ تقسیم کیا گیا سہ پہر میں بصدارت جناب مرزا محبوب بیگ صاحب منتظم پولیس جلسہ منایا گیا جس میں مقامی عہدہ دار معززین و عام رعایا نے شرکت کی شبیہ مبارک کی گلپوشی ہوئی کمسن بچوں نے حمد و ثنا سے جلسہ کا آغاز کیا طلباء مدرسہ نے اُردو اور مرہٹی میں تقریریں کیں نصیحت آمیز مکالمے کئے مدحیہ نظمیں پڑھی گئیں مددگار صاحبان مدرسہ نے بندگان عالی کے خاص کارنامے بیان کئے اور پنڈت سنگٹی صاحب پٹیل نے حضور پرنور کے احسانات کی توضیح کی صدر صاحب مدرسہ نے حاضرین کا شکریہ کا ادا کیا سب کے آخر میں جناب صدر نشین صاحب نے بندگان عالی کی عدل گستری روا داری بلا تفریق مذہب اور اہل ملک کی بہبودی پر روشنی ڈالی پھر بندگان عالی و شہزادگان بلند اقبال شہزادیان فرخندہ فال کے لئے دعائے زیادتی عمر و اقبال کی گئی بچوں کو انعامات غربا اور معذورین کو پارچہ تقسیم کرکے جلسہ ختم کیا گیا۔

خلاصہ روئداد جشن سلور جوبلی مبارک مدرسہ تحتانیہ قصبہ گجویل تعلقہ سدی پیٹھ ضلع میدک

۹ ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ

ے ساعت طلباء و مدرسین اور رعایا و مقامی عہدہ دار جمع تھے شبیہ مبارک کی گلپوشی کی گئی جلوس نکالا گیا ایک میدان میں پہنچ کر جو پہلے سے معین تھا پرچم آصفی کے سامنے طلباء و مقامی پولیس نے سلامی دی اور ظل اللہ و شہزادگان بلند اقبال و شہزادیان فرخندہ فال کے لئے دعائے ترقی عمر و اقبال مانگی گئی مدرسہ آکر صدر صاحب مدرسہ نے اردو میں اور ایک مددگار صاحب مدرسہ نے تلنگی میں عہد عثمانی پر تقریر کی شیرینی تقسیم کرکے جلسہ برخاست کیا گیا۔

خلاصہ روئداد جلسہ تعلیمی مدرسہ تحتانیہ اسد گنج ضلع بیدر شریف

۲۷ر دے ۱۳۴۶ف بصدارت جناب مولوی سید محمد جواد صاحب بی۔اے۔بی۔ٹی مہتمم تعلیمات ضلع بیدر شریف جلسہ تعلیمی منعقد ہوا مدرس صاحبین مدارس قرب و جوار و باشندگان مقامی وغیرہ سے پانسو سے زائد افراد کا مجمع تھا۔ جلسہ کا آغاز قرات سے کیا گیا کمسن طلبا نے حمد و نعت پڑھی صدر مدرسہ نے زمانہ قیام مدرسہ سے تاحال مدرسہ کے عروج و زوال کی رپورٹ سنائی۔ بعض مدرس صاحبین مدرسہ نے تعلیم کے فوائد پر تقریریں کیں جناب صدر نشین صاحب نے مدارس ضلع بیدر شریف کی ترقی کا ذکر فرمایا بعض طلبا نے مختلف موضوع مثلاً تندرستی سورج گہن پر تقریریں کیں اور فقیرانہ بھیس میں ڈراما اسٹیج کیا مولوی شیخ مہتاب صاحب مالی پٹیل نے رعایا کی جانب سے جناب صدر نشین صاحب اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور صدر نشین صاحب نے ضروریات تعلیم کھیل اور اخبار بینی پر موثر اور جامع فاضلانہ تقریر فرمائی اور بادشاہ ذی جاہ و شہزادگان و شہزادیان بلند اقبال کی درازی عمر پر جلسہ برخواست ہوا۔

خلاصہ روئداد افتتاحی جلسہ مدرسہ تحتانیہ قصبہ لنگسگور ضلع رائچور

۱۳ر بہمن ۱۳۴۶ف مدرسہ ہذا جدید عمارت میں منتقل ہوا جس کی تقریب میں یہ افتتاحی جلسہ منعقد ہوا۔ جناب مسٹر کرافٹن صاحب ڈائرکٹر جنرل مال نے اپنے دست خاص سے اس کا افتتاح فرمایا۔ رضاکاروں، ممبران انجمن امداد باہمی، منتظمان تنظیم دیہی مقامی وکلاء و معززین نے جلسہ کو کامیاب بنانے میں خاطرخواہ حصہ لیا۔ جناب نواب غوث یار جنگ بہادر اول تعلقدار ضلع رائچور مولوی حبیب الدین صاحب بی۔سی۔ایس دوم تعلقدار ڈویژن، ڈویژنل انجنیر صاحب صوبہ گلبرگہ شریف، مولوی رفیع الدین صاحب صدیقی بی۔اے مہتمم تعلیمات

ضلع ہذا مسٹر ولیم بٹ سوم تحصیلدار تعلقہ ہذا اور جناب مسٹر گرافٹن صاحب ڈائرکٹر جنرل مال بھی شریک جلسہ تھے جنہیں معیت صدر مدرسہ پھول پہنائے گئے۔ مسٹر وینکٹ راؤ صاحب وکیل عثمان آبادی اعزازی رکن و نائب میر مجلس بنک امداد باہمی نے ترقی تعلیم سے متعلق تقریر کی جس میں موجودہ زمانہ کے ترقی اور آقائے ولی نعمت مدظلہ العالی کی مساعی کا ذکر کیا گیا اور جن عہدہ داران مقامی نے اس مدرسہ کی ترقی و تنظیم میں کوشش فرمائی ان کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد مسٹر گرافٹن صاحب ڈائرکٹر جنرل نے جناب نواب غوث یار جنگ بہادر اول تعلقدار ضلع ہذا کے ایما سے تقریر فرمائی کہ جب سرکار نے بمصارف زر کثیر مدرسہ ہذا کے تعلیم کا انتظام فرمایا ہے تو گاؤں کے سربرآوردہ اصحاب کا یہ اہم فریضہ ہے کہ علم کی تحریص و ترغیب میں کافی مدد دیں جس سے طلباء میں وفاداری خیرخواہی ہمدردی کے صحیح جذبات پیدا ہوں اس کے بعد حاضرین کی پھول پان سے تواضع کی گئی اور آقائے ولی نعمت کے دعائے سلامتی پر جلسہ برخواست ہوا۔

خلاصہ روئداد تعلیمی جلسہ مدرسہ تحتانیہ ہرسور ضلع گلبرگہ شریف

۲۵ بہمن ۱۳۴۶ف بصدارت جناب مولوی ہاشم علی خاں صاحب منتظم پولیس ہرسور منعقد ہوا اور جلسہ کا آغاز ترانہ دکن سے کیا گیا۔ طلبا ر مدرسہ نے مختلف عنوانوں مثلاً علم کی اہمیت ضرورت وغیرہ پہ تقریریں کیں اور کنٹری ڈراما اسٹیج کیا گیا جس میں مدرسہ کا طالب کسان کی تعلیم کے مختلف غلط خیالات کا جواب دیتا ہے آخر میں صدرنشین صاحب اپنے بیش بہا خیالات کا اظہار فرمایا صدر مدرسہ نے رعایا اور مدرسین کے تعاون کے طریقہ پر روشنی ڈالتے ہوئے تقریر کی اور معززین کو پھول پہنائے گئے نمائشی کمرہ کا معائنہ کرایا گیا اور آقائے ولی نعمت کے دعائے عمر و اقبال پہ جلسہ برخاست ہوا۔

جشن سیمین مبارک مدرسہ تحتانیہ مکراج پیٹھ (میدک)

بتاریخ یکم ذیحجہ ۱۳۵۵ھ منعقد ہوا عمارت مدرسہ اور بازی گاہ جھنڈیوں سے آراستہ کیا گیا تھا طلبا مدرسین اور رعایا کا جلوس بینڈ کے ساتھ گشت لگاتا ہوا مدرسہ پہنچا راستہ میں طلبا ترانہ (میر عثمان علی خاں شہریار دکن) گاتے جاتے تھے۔ بموجب پروگرام معقول طریقہ پر اسپورٹس منعقد ہوئے پھر تماشے ہوئیں انعامات تقسیم کئے گئے اور دعائے سلامتی بندگان عالی و شاہزادگان بلند اقبال

وشاہزادیاں فرخندہ فال مانگی گئی۔ تقسیم شیرینی کے بعد یہ جشن مسعود ۶ بجے اختتام کو پہنچا۔

جلسہ تعلیمی مدرسہ تحتانیہ منمول ضلع اطراف بلدہ

بتاریخ ۲۲ بہمن ۱۳۴۶ف جلسہ تعلیمی بصدارت راجہ مہیشور ریڈی منعقد ہوا۔ صحن مدرسہ میں چمن بندی کی گئی تھی اور بیرقوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ حمد و نعت پر ارتھنا اور عربی نقصیدہ سے کارروائی کا آغاز ہوا۔ محمد حسین طالب علم نے فوائد علم پر نظم پڑھی۔ عبد الحفیظ صاحب صدر مدرسہ نے اردو میں اور لچھمیا صاحب مددگار نے تلنگی میں فوائد علم اور طلباء کی حاضر باشی پر تقریریں کیں اور اولیاء اشتراک عمل کی اپیل کی۔ احمد علی صاحب متعلم مدرسہ نے خوش الحانی کے ساتھ نظم سنائی اور مختصر تقریر بھی کی۔ فائق النساء بیگم عمرہ ۸ سال نے بھی نظم سنائی۔ وینکٹا چاری صاحب اور عبد الوحید صاحب صدر مدرسہ ببری لنگم، راجہ سری رام ریڈی صاحب اور وینکٹ رام ریڈی صاحب نے مختلف عنوانات پر تقریریں کیں اور جلسہ کی کامیابی میں حصہ لیا بندگان عالی اور خانوادۂ شاہی کی درازی عمر و اقبال کی دعا مانگی گئی اور جلسہ برخاست ہوا۔ اور برخاست پر پان سگریٹ سے مہمانوں کی تواضع کی گئی اور شیرینی تقسیم ہوئی۔

جلسہ سلور جوبلی مبارک مدرسہ تحتانیہ سانگڑی (آصف آباد)

بتاریخ ۱۲ فروری ۱۳۴۶ف صبح ۷ بجے مدرسہ کے بچے اور قصبہ کی رعایا کمپونڈ مدرسہ میں جمع ہوئی تلاوت کلام پاک کے بعد پرچم آصفی لہرایا گیا اور سلامی ہوئی بچوں نے خوش الحانی کے کے ساتھ حمد و نعت بزبان مرہٹی اور اردو نظمیں سنائیں پھر بندگان عالی کے شبیہ مبارک کی پالکی کا جلوس نکالا گیا جلوس کے سامنے طلباء کا ترانہ اور تلوار کے کرتب کا مظاہرہ ہوتا رہا۔ ا بجے جلوس مدرسہ پہنچا اور دعا سلامتی حضور پر نور کے بعد پان سگریٹ سے تواضع کی گئی اور جلسہ برخاست ہوا۔ دوسرے روز صبح طلباء کے اسپورٹس بہ نگرانی مسٹر لنگنہ لچھما ریڈی سا ہو منعقد ہوے اور تیسرے روز صاحب موصوف کے زیر صدارت تقسیم انعامات کا جلسہ ہوا۔ مولوی شیخ امام صاحب صدر مدرسہ نے قرارت پڑھی اور برکات عہد عثمانی پر تلنگی میں اور اسی عنوان پر مسٹر سیتا رام راؤ صاحب مددگار مدرسہ نے مرہٹی میں تقریریں کیں۔ مسٹر گوگل نارائے صاحب سب انسپکٹر آبکاری اور مسٹر گمبھیر راؤ صاحب دیسمکھ نے بھی اپنی تقاریر سے حاضرین کو محظوظ فرمایا۔

صدر جلسہ نے طلباء کو حصول علم کے بارے میں نصیحت فرمائی اور مدرسہ کے کام میں امداد
اور اشتراک عمل کا وعدہ کیا پھر سلور جوبلی کے تمغہ اور شیرینی تقسیم ہوئی اور جلسہ برخاست ہوا دوسرے
روز مہمانوں کو ٹی پارٹی دی گئی۔

جلسہ سالانہ تقسیم انعامات مدرسہ تحتانیہ الاوہ بیتیاں

بتاریخ ۹ ر اردی بہشت روز شنبہ بوقت ۴½ ساعت
شام بصدارت عالیجناب مولوی سید علی اکبر صاحب
ایم۔ اے۔ کنٹب صدر مہتمم تعلیمات بلدہ منعقد ہوا۔ صدر عالی قدر کی تشریف آوری پر نمائش
تعلیمی مدرسہ ہذا کا افتتاح کیا گیا۔ نیز صاحب معزز نے نقشہ جات حیدرآباد و ہندوستان کو شرف
ملاحظہ بخشا جو صحن مدرسہ میں سمنٹ سے تیار کئے گئے تھے اور جس کے حدود کو مختلف رنگوں سے
نمایاں کیا گیا تھا۔ من بعد جلسہ کا آغاز حمد سے کیا گیا۔ طلباء مدرسہ نے مختلف اکسرسائز کے بیانڈ
کے ساتھ بسرکردگی مولوی میر اشرف علی صاحب گیمس سکرٹری مظاہرہ کیا ازاں بعد انگریزی
وار دو مکالمے ہوئے۔ صدر مدرس مدرسہ نے رپورٹ سالانہ سنائی جس میں اساتذہ صاحبین
کے اشتراک عمل کا تذکرہ کرتے ہوئے سالانہ نتائج جو قابل اطمینان تھے ظاہر کیا و نیز مولوی
میر اشرف علی صاحب گیمس سکرٹری مدرسہ ہذا کی قیادت میں طلباء کو گولکنڈہ کے آثار قدیمہ
کا معائنہ کرایا گیا تھا اس کا ذکر کیا اور مولوی عبد الغفار صاحب مددگار مدرسہ ہذا کی اس
ہمدردانہ تحریک کا بھی تذکرہ کیا جس کی وجہ ماہ صیام میں روزہ دار بچوں کو منجانب اساتذہ
کھانا کھلایا گیا تھا۔ آخر پر حضرت اقدس اعلیٰ اور خانوادۂ شاہی کی سلامتی کے لئے درگاہ رب
العزت میں دعا مانگی گئی۔ رپورٹ کے اختتام پر صدر عالی قدر نے ایک پر مغز اور جامع تقریر
فرمائی جس میں مدرسہ تحتانیہ الاوہ بیتیاں کی عام ترقی خصوصاً جسمانی ورزش و نتائج امتحانات
سالانہ پر اظہار خوشنودی فرمایا۔ اور مولوی اشرف علی صاحب گیمس سکرٹری مدرسہ ہذا
کو مبارکباد دی۔

افتتاحیہ

ہمارے نئے ناظم تعلیمات

جناب مولوی محمد حسین جعفری صاحب بی اے اکسفورڈ نائب ناظم تعلیمات نے پنجشنبہ ۸ تیر ۱۳۴۶ف کو جناب مولوی فضل محمد خان صاحب ام اے۔ رنگلر سابق ناظم تعلیمات سے نظامت تعلیمات کا جائزہ حاصل فرمایا۔ عہدہ داران تعلیمات اور عمال نے مولوی فضل محمد خان صاحب کو چیف آرگنائزنگ افسر کی خدمت اور مولوی محمد حسین جعفری صاحب کو نظامت تعلیمات کی خدمت پر فائز ہونے کی خوشی میں پھولوں کے ہار پہنائے۔

خاندانی حالات مولوی محمد حسین جعفری صاحب ۱۲۹۷ف میں بلدہ حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں پیدا ہوئے اور ایک اعلیٰ اور ممتاز خاندان کے فرد ہیں آپ کے جد امجد نواب باقر نواز جنگ مرحوم، مختار الملک بہادر کے عہد میں نہایت کامیاب ڈاکٹر اور طبیب حاذق تھے جن کی نام آوری اور حذاقت سے اب بھی لوگ واقف ہیں اور ان کا نام ادب احترام سے لیتے ہیں۔ جاگیر و مناصب کا سلسلہ نسلاً بعد نسل اب تک جاری ہے۔

تعلیم و تربیت آپ نے علوم ظاہری و دینی کی تکمیل اپنے جد امجد کے زیر سایہ فرمائی اور ۱۴ سال تک نواب صاحب مرحوم کے ظل عاطفت میں تعلیم و تربیت پاتے رہے۔ مدرسہ عالیہ میں جو اس زمانے میں امرا کے لڑکوں کے لئے وقف تھا، میٹرک کی تعلیم پا کر صاحب موصوف انگلستان روانہ ہوئے۔ یہاں اکسفورڈ یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری لی۔ اسی زمانے میں بلقان کی جنگ چھڑ گئی اور سید محمد حسین جعفری صاحب جو اکسفورڈ اسلامک سوسائٹی کے معتمد و صدر نشین تھے، انجمن کی جانب سے ایک وفد کے ہمراہ بلقان روانہ ہوئے۔ آپ نے ۴ ماہ انجمن ہلال احمر کا ہاتھ بٹایا اور میدان جنگ کے زخمیوں کی مرہم پٹی کر کے اخوت و ہمدردی کا ثبوت دیا۔

ملازمت جب آپ حیدرآباد تشریف لائے تو ۱۱ خورداد ۱۳۲۲ف کو پرسنل مددگاری نظامت تعلیمات ملک سرکار عالی پر آپ کا تقرر عمل میں آیا۔ اس کے بعد پرنسپل ہائی اسکول ورنگل اور مہتمم تعلیمات عثمان آباد مقرر ہوئے۔ پھر ہائی اسکول اورنگ آباد کی پرنسپلی اور سمت میدک کی صدر مہتممی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۵ آذر ۱۳۳۴ف کو نائب نظامت تعلیمات کے عہدہ پر فائز ہوئے اور درمیان میں دو مرتبہ چار پانچ ماہ کے لئے منصرمانہ حیثیت سے ناظم تعلیمات بھی مقرر ہوئے تا آنکہ موجودہ خدمت پر مستقلاً تقرر عمل میں آیا۔

تصنیف و تالیف آپ کا تعلیمی تجربہ وسیع ہے۔ مدارس میں باقاعدگی اور ڈسپلن کو ہمیشہ آپ نے اہمیت دی۔ "مفتاح التعلیم" آپ کی پہلی تالیف ہے جو فن تعلیم و نظم و نسق مدرسہ پر ہے۔ حیدرآباد میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب تھی جو منظر عام پر آئی۔ اب سے تقریباً پندرہ سال پیشتر جب کہ علمی چرچے نہ تھے اور نہ ذخیرہ ادب کی فراوانی تھی اور نہ تربیت یافتہ مدرسین ہی کافی تعداد میں تھے، اس کتاب نے فنی معلومات کی نشر و اشاعت میں قابل قدر کام انجام دیا۔ فنی معلومات کو اردو میں منتقل کرنے کی ابتدا صاحب موصوف ہی نے فرمائی۔ اس لحاظ سے اولیت کا سہرا صاحب موصوف ہی کے سر ہے۔ اس کے ایک سال بعد دوسری تالیف "ہدایات برائے مدرسین" منظر عام پر آئی۔ اس میں بھی درس و تدریس اور نظم و نسق مدرسہ سے متعلق ہدایات ہیں جو محترم مولف کے ذاتی تجربوں اور مشاہدوں پر مبنی ہیں۔ تیسری کتاب "کنڈرگارٹن" چھوٹے سائز کی باتصویر کتاب ہے جس میں فروبل کے "بالک باغ" اور اس کی تعلیمات کا ذکر ہے۔ اس کے بعد ہی آپ نے ایک ماہانہ رسالہ "المعلم" جاری فرمایا تاکہ ملک کے طول و عرض میں خالص تعلیمی اور فنی معلومات کی مکمل طریقہ پر نشر و اشاعت ہو سکے۔ جن اغراض و مقاصد کے تحت رسالہ جاری ہوا اس کے حصول میں کس درجہ کامیابی ہوئی اس کا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے رسالہ مذکور اب تک اسی شان سے جاری ہے اور خدا کا شکر ہے کہ اس نے اپنی زندگی کے بارہ سال پورے کر لئے۔

سنہ ۱۹۲۷ء میں امپیریل ایجوکیشنل کانفرنس لندن میں منعقد ہوئی۔ اس میں جناب مولوی سید محمد حسین صاحب اور جناب مولوی علی اکبر صاحب ریاست حیدرآباد کے نمایندوں کی حیثیت سے شریک ہوئے اور واپسی پر انگریزی میں ایک دلچسپ اور مفید رپورٹ پیش کی جو منجانب سرکار طبع ہوئی۔ امپیریل ایجوکیشنل کانفرنس کے اختتام پر جناب مولوی سید محمد حسین صاحب ڈنمارک گئے اور وہاں کے مدارس کا معائنہ فرمانے کے بعد وہ معرکۃ الارا تالیف جو "ڈنمارک اور اس کے نظام تعلیم" سے موسوم ہے پبلک کے سامنے پیش کی۔ ڈنمارک جدید کے مشہور تعلیمی علمبردار بشپ گرانڈٹگ اور کرسٹن کولڈ نے ڈنمارک کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اس کے نمایاں خط و خال اس کتاب میں ملیں گے۔ چونکہ ہندوستان اور ڈنمارک دونوں زراعتی ملک ہیں لہذا اس بیش قیمت تالیف کا مطالعہ بصیرت افروز ہے۔

انجمن اساتذۂ متفرقہ بلدہ سے دلچسپی جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے کہ آپ کو تعلیم سے گہری دلچسپی ہے، آپ نے

انجمن اساتذہ بلدہ سے گہری دلچسپی شروع ہی سے لی۔ ۳۷ء کی سالانہ کانفرنس میں آپ نے بعنوان "ڈنمارک میں تعلیم بالغاں" ایک دلچسپ، مبسوط اور پُر از معلومات مضمون پڑھا جو بے حد پسند کیا گیا۔ ۳۸ء میں آپ کمیٹی تعلیم پیشہ ورانہ کے میر مجلس تھے۔ کمیٹی مذکور کا انتخاب انجمن اساتذہ بلدہ نے اس غرض سے کیا تھا کہ وہ مدارس میں پیشہ ورانہ تعلیم کے رائج کرنے اور فروغ دینے میں مناسب تجاویز پیش کرے۔ انجمن کی دسویں سالانہ کانفرنس میں جناب ممدوح نے ضمنی جلسہ کی صدارت فرمائی جس میں ضبط مدرسہ پر مباحثہ ہوا سال حال بھی آپ نے حفظ صحت مدرسہ کی کمیٹی کے عہدہ میر مجلسی کو قبول فرمایا ہے۔ گزشتہ سال انجمن کے کتب خانہ کو صاحب ممدوح نے تقریباً .. اکتب مرحمت فرمائیں جن سے کتب خانہ میں قابل لحاظ اضافہ ہو گیا۔ انجمن کا کتب خانہ اور ایک لحاظ سے بھی صاحب موصوف کا زیر بار احسان ہے امپیریل ایجوکیشنل کانفرنس میں آپ اور جناب مولوی سید علی اکبر صاحب کامیابی کے ساتھ نمایندگی فرمانے کے بعد واپس ہوئے تو ایک شان دار ایٹ ہوم دینا طے پایا۔ مگر ہر دو محترم حضرات نے اس تجویز کو صواب جاریہ کی صورت میں تبدیل فرما دیا وہ یہ کہ مجتمعہ رقم سے انجمن کا کتب خانہ قایم ہوا۔ ایٹ ہوم وغیرہ سے تھوڑی دیر کے لئے شیرین کام ہونے کے بجائے اب تشنہ کامان علم اس سرچشمہ سے دواماً سیراب ہوتے اور روحانی مسرت پاتے ہیں جناب جعفری صاحب کے دل میں ملک کی تعلیمی ترقی کا ولولہ ہے آپ کو مدرسین سے خاص ہمدردی ہے اور ان کو خوش حال اور مرفہ الحال دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ اخلاقی جسارت کے ساتھ حق کا ساتھ دیتے ہیں۔ فرائض کی ادائگی میں والہانہ جذبہ کارفرما رہتا ہے۔ طبیعت میں باقاعدگی اور خوش سلیقگی خداوند تعالیٰ نے ودیعت فرمائی ہے۔ غرض کہ بمصداق آیۂ کریمہ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ اب آپ جلیل القدر عہدہ پر فائز ہیں۔ توقع ہے کہ ملک و مالک کی خدمت انجام دینے میں آپ نمایاں امتیاز حاصل فرمائیں گے۔

Review.

Maxims of Ali, **Oxford University Press, Price Rs. 1-8-0.**

Ali, the son-in-law of the Prophet Mohammad, was a profound philosopher and the greatest saint of Islam. His maxims are noteworthy for their pithiness and lofty ideals. No less remarkable is the wide range which they cover. No one who reads this book can fail to be impressed by the erudition, wisdom, versatility, and above all, the spirituality of the great Khalif. A few examples will suffice:

"I do not exhort you to obey God before obeying him myself: I do not forbid you to commit sins that I do not forbid myself".

"The most detestable man is he who returns evil for good, and the most praiseworthy, he whose answer to villainy is a generous deed".

"The truly learned man is he who understands that what he knows is little in comparison with what he does not know".

"One who praises you for qualities you lack, will next be found blaming you for faults not yours".

"Give to a poor man before he asks; for if you place him under the necessity of stretching out his hand, you take from his self-respect more than the value of your alms".

"It is right that the King should govern himself before governing his subjects".

Mr. Sayyid Abu Muhammad, who has written a useful introduction to the book, is right when he says, "Mr. J. A. Chapman has rendered a great literary service to the English-speaking world by translating the maxims into his mother-tongue". The book is attractively and neatly got up and is well worth the modest price at which it is offered. No school library should be without it.

S. A. A.

We congratulate His Excellency the Rt. Hon'ble Sir Akbar Hydari, Nawab Hyder Nawaz Jung Bahadur, P.C., L.L D. President of the State Executive Council, on his being awarded the degree of D. C. L. by Oxford University.

The omission of the name of our worthy and able colleague Rev. F. C. Philip from the list of the members of the Editorial Staff in the present number of the *Hyderabad Teacher* is due to the fact that he has left for Europe on furlough. We hope that on his return here at the beginning of next year, his valuable assistance will once again be available. In the meantime, he has our best wishes for the rest and holiday which he has so well earned.

---

was largely responsible for the report prepared by that committee. After the last Annual Conference, he very kindly accepted the chairmanship of the committee on "School Hygiene". He has earned the gratitude of the members of the Hyderabad Teachers' Association by his generous gift of over 100 very useful and costly books to its library. Now after his appointment as Director of Public Instruction he has readily agreed to be the patron of *The Hyderabad Teacher.* In his letter accepting our offer to him to become its patron, after wishing the journal every success and promising to do his best to further its aims and objects, he says:—

> "*The Hyderabad Teacher* is a most useful publication and I consider it to be one of the best educational journals in India".

Mr. Jaferi has assumed charge of the office of Director of Public Instruction at a very critical period in the educational history of our State, when apart from Educational Reorganisation, questions of outstanding importance like the expansion of Primary Education and Women's Education are pressing for solution. But not only is he full of zeal and enthusiasm, but he brings to his new and responsible task a ripe and varied experience. We feel confident that under his sympathetic administration and wise guidance education in our State will make more rapid advance in all directions.

The Chief Secretary to His Exalted Highness the Nizam has written to the Hon'ble the Education Member informing him that His Exalted Highness has read the Silver Jubilee Number of *The Hyderabad Teacher* with pleasure. We are proud to know this.

Editorial.

Our New Director of Public Instruction.

We offer our hearty congratulations to Mr. Syed Mohamed Husain Jaferi, B. A. (Oxon), on his elevation to the office of Director of Public Instruction in succession to Mr. Fazl Muhammad Khan, M. A. (Wrangler), who has been appointed to the newly-created post of Commissioner for Educational Reorganisation. Mr. Mohamed Husain Jaferi took over charge on 13th May, 1937.

Mr. Syed Mohamed Husain Jaferi entered service in 1913 as Assistant Director of Public Instruction, and since then he has served the Department in various capacities—as a District Inspector of Schools, as the Principal of a First Grade High School, as a Divisional Inspector of Schools, and lastly as Deputy Director of Public Instruction. He has also acted on different occasions as Director of Public Instruction. Mr. Jaferi has always been an enthusiastic worker in the field of education. He is the author of at least half a dozen books in Urdu on educational problems. It is to his initiative that the *Almoalim*, the first Urdu Educational Journal in the State, owes its origin. In 1927 he and Mr. Syed Ali Akbar attended the Imperial Educational Conference in London as delegates from Hyderabad. At the conclusion of the Conference, Mr. Syed Mohamed Husain Jaferi proceeded to Denmark and on his return published a most valuable book in Urdu known as 'Denmark and its Educational System', which not only gives a clear and full account of the educational system of that country, but also contains useful suggestions for the improvement of the system of education in India.

Mr. Jaferi has taken a keen interest in the Hyderabad Teachers' Association since its inception. He has delivered several addresses at our Annual Conferences and has also presided over various sectional meetings. As Chairman of the Sub-Committee on "Vocational Education", he

solution of comparatively useless problems. All teachers have equal responsibility regarding the education of children, whatever the class or subject may be. They discharge their duties with sincerity and earnestness so that the children might be benefited. The pupils are made to understand that Arithmetic, Algebra and Geometry are not subjects different from one another but that they are inter-related. Continuity of the subject throughout the school course is maintained. There is harmony in all its parts. That harmony is not disturbed when the pupil quits Arithmetic for Algebra or practical Geometry for theoretical Geometry. In each case the new study is homogeneous with the old. There is, generally speaking, a spirit of earnestness on the part of students and a spirit of kindness on the part of teachers. Both these make for the success and popularity of the modern methods of handling the subject.

the comparison of different things. For example, the children might count three sticks and four sticks and give the total; the sticks might then be removed and the calculations made again in terms of sticks; the process might then be repeated with other objeets, e. g. 3 seeds and 4 seeds etc., the numerical idea might then be strengthened by measuring 3 ft. and 4ft. on the class-floor, the total still being asked for; the semi-final step might be the total of three things and four things, and the abstract calculation 3 plus 4 would be the final step. All the lessons in the beginning are short and simple. Dr. Rabindranath Tagore says, "One thing is truly needed to be a teacher of children. It is to be like children; to forget that you are wise or have come to the end of knowledge. In order to be truly the guide of children you must never be conscious of the age or of superiority or of anything of that kind. You must be their elder brother ready to travel with them in the same path of higher wisdom and aspirations. This is the only advice I can offer to you".

Compared with the schools of the earlier days there is a very different spirit in the schools of to-day. The pupils are now happier in schools than they ever used to be before, and they have an agreeable time with their teachers. Rarely is a child whipped at the present day, whereas in past years a school without frequent floggings was exceptional. The reason for the change is the introduction of more efficient and interesting methods of teaching. Teachers of to-day allow a large margin for the spontaneous activities of pupils. A healthy tendency is now at work towards making the study of mathematics practical and useful by keeping in view its application in pure and applied science and in matters of every-day concern. The result is that the pupils are no longer uninterested in the subject as they formerly were. It is now recognised that an extensive knowledge of principles is of greater importance than mere dexterity in manipulation of symbols or ingenuity in the

are within the limits of the child's capacity and experience. The teaching is not confined to integers; elementary ideas of fractions are also given from the first. The teaching is graded, proceeding from small numbers to big ones. Each topic is thoroughly dealt with in all its ramifications before the next is taken up. It is done with a proper appeal to the senses so that all truths and definitions may be *discovered* by the pupils and *not received as pieces of information.* The teaching in modern days recognises the child's innate love of activity and for this reason sticks, cubes and other suitable articles are allowed to be handled, counted, or manipulated, as the case may be, by the children themselves. When mistakes are committed by a child, he is given an opportunity to correct them himself. A mistake is never passed over but the child is set to repeat the particular operation until it is performed correctly. There is little teaching without repetition and hence it is necessary to repeat various operations at different times, or at the same time by varying the objects used, so that the repetition itself might be intelligent and what is repeated might stand a greater chance of dwelling in the memory. This kind of repetition is especially necessary in teaching the various tables where names, often strange to the child, correspond to the facts of experience. For this reason even at later stages common tables only are to be taught. In the lowest classes it is sufficient to teach the pupils the parts of a rupee, a seer, the number of days in a week, the foot and the yard. The work is still to be concrete; where possible, the coins should be seen and handled, and the lengths measured by the pupils. All the requisite tables are at present learnt in this concrete manner and the knowledge thus acquired is generally applied at once to carefully chosen practical examples.

The transition from the concrete to the abstract is made by carefully graded steps and for this purpose the objects are varied. For simple abstract ideas are obtained only by

be kept in the forefront. He now understands that the teaching of weights and measures of any sort, which does not give them practical acquaintance with the units employed, is unreal to them and therefore psychologically defective. Care must be taken in early years to make the pupils' power of thinking in Arithmetic exact, so that they can translate correctly, when need be, the results reached in the solution of their problems. As an aid to this work, the children nowadays are required to draw diagrams illustrating the problems involving weights and measures unless such diagrams are felt to be too complex. When a pupil is required to do this work he gets a clear insight into the processes involved, which he can never do if he simply learnt the tables and then tried to apply them blindly to solve the problems placed before him. In an Arithmetical problem every word is significant. The pupil should first be required to read the problem carefully and to explain in his own words what is given in the problem and what he is required to find ; then to supplement this interpretation by diagrams, whenever possible ; for example, in problems involving the determination of lengths, areas, volumes etc. In this way the pupil should construct each problem correctly. He should understand clearly what a problem means before he attempts to solve it.

In schools of the present day, such problems in Arithmetic are set as necessitate clear thinking and are useful in satisfying their actual needs. It is a matter for congratulation that the new text-books in Arithmetic are eliminating the formal, and unreal problems and bringing the subject-matter right within the experience of the pupil and thereby making it full of meaning to him. The new Arithmetic induces the pupil to take an active and intelligent share in what is going on in the class room. The first notions are derived from observations and by the handling of material objects. The teaching in our schools deals with practical problems which have a local colour and

generally followed the deductive method of the text-books. Cut and dried rules for every little operation formed the starting point. Too much emphasis was laid on the formal examination. The result was that the ability to get by rote was developed at the expense of reasoning. It was only the mechanical ability which was tested in the examinations. Pupils in schools, therefore, acquired the ability to perform mechanical operations. The characteristic differences between pupils in their ability to commit facts to memory were not taken into consideration. We know as a matter of fact that the pupil who can solve a rider in Geometry knows much more Geometry than one who knows only how to reproduce each one of the demonstrations given in the book.

I have already said that in past years Mathematics was regarded as the most difficult subject in the school curriculum. That wrong estimate of the subject was persisted in by pupils, teachers and the public at large. It accounted for the state of mind which led to *certain* failure. In most cases candidates expected to fail and they failed. It was the business of the Mathematics teacher to have dispelled that wrong notion about the subject. This could have been achieved only by emphasising the practical, instead of the formal, aspect, by improving the methods of teaching the subject and by bringing about a change in the attitude of the examiners. Experience has taught us that no good comes of threatening or exhorting pupils who have developed inaccurate methods of work. The efficient teacher will analyse the situation before him, seek to discover the psychology involved in the persistent errors of a pupil and then he will set about developing new habits. Old habits cannot be broken up in an instant; they can be corrected only by building up different habits which in time will replace the undesirable ones.

The teacher at present realises that in teaching Mathematics to young children, its practical aspect alone should

Formulae, or Theorems verbatim. But he could not create *general thinking ability* in his pupils. The chief reason for this was that often the teaching situations did not require thought in the sense in which we use the term at the present day. Many of the school exercises made a demand only on verbal memory.

Let us look at the results of mere verbal teaching in Arithmetical work. The teacher used to teach weights and measures to children without showing these to them. He required the pupils to learn by heart the Tables of Linear measure without giving them a chance to see or handle a foot-ruler. They had only a vague idea of what a yard measure was, though they repeated over and over again that "12 inches make one foot", "Three feet make one yard", "5½ Yards make one pole", "40 Poles make a furlong", and "eight furlongs make a mile", and so on. The effort of the children was directed towards remembering the tables and performing correctly the multiplication given by the teacher. He apparently never once thought of asking the pupils to indicate the length of a yard, either on the board or in any other way. It did not occur to him as at all necessary that he should ask the children to draw a line one inch long, one foot long, and so on. His principal aim was to have his pupils remember verbal statements they had learnt and apply them in some meaningless, formal situations. But those situations did not involve any knowledge of actual measurements. They required only a knowledge of words.

The pupils were afraid of the subject and so disliked it very much. The main cause of such fear and dislike was that the subject was badly taught in schools in the past years. The pupils were too soon introduced to the abstract. Correct ideas of numbers, weights, and measures were not imparted. Mechanical work was generally resorted to. Reasons for rules were neglected. Great stress was laid on the theoretical aspect of the subject. The teacher

ing instruction into a great number of water-tight compartments, have become more and more apparent. The economy of time and effort that would result from a proper grouping has led to many attempts to evolve new schemes. The school material is too formal in conception. Instead of seeking to create a demand, attention is tending to be turned to the modification of the subject-matter. So many facts have to be learnt, and the teacher has to resort to various devices to interest the children and sugar the pill. A new way of approaching the problem of school instruction is indeed needed in Indian Schools. I shall deal with this important and interesting subject on a future occasion.

Recent Developments in the Teaching of Mathematics

BY

D. C. Bhogle, B. A., B. T.

Superintendent Normal School, Aurangabad.

Bertrand Russell says in his admirable book 'On Education', "Knowledge wielded by love is what the educator needs and what his pupils should acquire. Love can conquer fear and if we love our children, nothing can make us withhold the great gift which is in our power to bestow."

In the old days the teacher paid greater attention to government than to instruction proper. He used to have disciplinary periods when the pupils were required to sit erect in their seats with arms folded and every muscle tense. All communication during school hours was forbidden. Not even a friendly word now and then with one's neighbour was permitted. He used to ask the pupils to memorise the words of a text-book in Arithmetic, Algebra or Geometry, as the case might be, and used to test their mastery of the subject by requiring them to reproduce the Tables,

the importance of making the science scheme fit in with local conditions. Mechanics and chemistry were recommended as suitable for town schools, bee-keeping, poultry management and lessons centering round agricultural processes as useful in rural districts, and so on. Another outcome of the scientific movement was seen in the spread of Hygiene and Physical Training. Swedish drill appeared in girls' schools about the year 1879, and somewhat later, in boys' schools. After 1895 o nschool could earn the maximum grant which failed to make provision for some form of physical exercise.

Some attempt was also made to show how the demand for vocational training had arisen from time to time as a protest against the bookishness of the schools. This feeling was again very marked in Western Europe after 1860, largely as a result of the rapid changes that were taking place in industry and commerce. The movement may be said to have begun with the publication of the Report of the Royal Commission on Technical Education in 1882. The Cross Commission considered that such instruction ought to have a place in the elementary school curriculum. Grants were paid by South Kensington for manual instruction after 1890, and since that time the work has spread rapidly.

With the abandonment of the system of individual examination and payment by results, which began in 1890 but was finally abolished in 1897, a gradual extension of the curriculum took place, culminating in the present-day position. Now something of the true Frœbelian spirit is to be seen. It was till recently urged that sufficient attention had not been paid in the past to the following principles: (1) the recognition of the child's spontaneous activity and the stimulation of this activity in certain well defined directions by the teacher, and (2) the harmonious and complete development of the child's faculties.

As the curriculum has steadily widened, teachers are now faced with an over-crowded time-table. The artificiality of a long list of disconnected subjects and the result of divid-

certain they were put into as low standards as possible. The Code had tended to discourage attention to the higher branches of elementary instruction.

In the development of educational thought and practice during this period, the influence of Froebel, Herbart, and Pestalozzi has been very marked. Of contemporary writers Herbert Spencer, John Ruskin, and of more recent date, John Dewey, occupy a foremost place. Spencer's value is felt to lie in the powerful plea he made for a training in scientific method and for the introduction of science into the school curriculum. He urged a more rational grading of instruction so that it might harmonise with the mental development of the individual. Education, he considered, was capable of exerting a determining influence not only on the rising generation, but on mankind in future. According to him the primary need of man was to acquire (1) knowledge calculated to assist him in his self-preservation; (2) knowledge that would enable him to gain a livelihood; (3) knowledge that would help him in bringing up his family; (4) knowledge that would make him a good citizen; and (5) knowledge which would teach him the right use of his leisure. To acquire all this the study of science in its broad sense was considered indispensable. The demand for instruction in science and for a more practical education was the result, and various scientific subjects—domestic economy, physiology, physical geography, mechanics and botany—were encouraged by the Education Department. Further encouragement was given by Mr. Mundella's Code of 1882, which for the first time sought to introduce the teaching of elementary science in all classes.

A further advance was made at the international Conference on Education at London in 1884. Since 1890, owing to the removal of certain restrictions in the Code, elementary science has made remarkable progress and has also gained in popularity. In 1900 the Board of Education sought to give direction to these tendencies by emphasising

tary teaching became a profession, the method of mutual instruction was replaced by the modern class system, and a type of Pestalozzian practice was imposed upon schools and retained almost undisputed for half a century.

Until the issue of the Revised Code in 1862, the central authority exerted no direct control over the school curriculum. Any changes that were made depended entirely upon the initiative of the master, or the managers, or were due to the stimulus of a Government inspector, who, like Mathew Arnold, looked to the schools to inspire an element of culture into their pupils. A great majority of elementary schools, both public and private, taught nothing beyond the three R's. History lessons and physical exercises found a place in some schools, the latter in particular becoming increasingly popular. In 1847 grants were made towards the cost of hiring field-gardens and erecting workshops for the teaching of handicrafts. Between 1850 and 1860 gardening and domestic subjects received considerable attention.

Under the Revised Code a new era began for the elementary school. Reading, writing and arithmetic were divided into six stages or standards, and immediately attained an exaggerated importance along with plain needlework for girls. The bulk of the grant that could be earned depended upon the success with which each child could pass an annual examination in them. The natural evolution of curriculum, organisation and method that had been going on under the fostering care of Kay-Shuttleworth came to a stop. The child became a money-earning unit to be driven and the teacher a sort of foreman whose business it was to keep his gang hard at work. The school managers generally threw the responsibility of the new system on to the shoulders of the teachers by making their salary depend upon the amount of grant earned. Children were kept grinding at the three R's in an endeavour to ensure success at the examination, and to make the grant still more

sought to abolish all meaningless repetitions. In treating a subject the correct order was to begin with what was significant and immediately connected with the experience of the pupils. In these oral lessons much emphasis was laid on questioning and descriptions, aided by familiar illustrations.

The effect of these reforms on the average school was, however, small until 1840. Between 1833 and 1862 the reforms in organisation, staffing, curriculum and method slowly made their way into general practice. The policy of payment by results took no thought of anything but results, and left methods and general conditions to take care of themselves. Religious instruction was still the main function of the elementary schools. Committees still believed in children treasuring up the materials of religion in their memories. In a few schools the dry rigid rules of grammar and the barren definitions of geography were memorised by children.

With the spread of Pestalozzian practice in England the names of Mayo and Kay-Shuttleworth are especially associated: the one as practical teacher and writer of text-books, the other as an administrator. Dr. Mayo, on his return to England from Yverdum, had conducted, together with his sister, a school on Pestalozzian lines. The practice of this school was set out in a series of text-books, the best known of which was Miss Mayo's, "Lessons on Objects," 1830. The influence of this book was very great. Not only did it serve to popularise object teaching in schools, but it set up a recognised procedure in lessons of this type which was adhered to for nearly three-quarters of a century.

Kay-Shuttleworth's influence was of a different kind. He was the first secretary to the committee of council and so had many difficulties to face and opportunities to learn. He was a man with a profound faith in education, who had made a special study of the social aspect of the subject. He inaugurated a number of far-reaching reforms. Elemen-

Teaching was to proceed by means of objects and pictures: pupils were to be led to examine, compare, and express what they saw, the inferences they drew, and so on. The spirit was excellent, and at any rate it had the merit of approaching the question of education from the standpoint of the child. In conclusion, Wilderspin himself was far from understanding the real significance of much that he preached. He confused education with instruction. He thought he was laying a basis of sense experience when, as a matter of fact, the children were mechanically memorising names. Monitors were still employed, but only for the more mechanical parts of the work. The real teaching depended upon the master or mistress.

David Stow exerted a far greater influence on the development of primary education during this period. His aim was the moral elevation of the masses, particulary in large towns. He thought that the general attitude towards education was fundamentally wrong. Man is a moral and physical being in a constant state of development It was absurd to compare the mind to wet clay ready to be fashioned when all education was essentially self-education. The business of the teacher is to evoke activity and to direct it to arouse worthy motives and to implant ideals. "Training" implied two things, understanding and action. The true educational system, he felt, must be based on universal principles applicable throughout life, for education is progressive and never completed. The essence of education, again, consisted in the inter-action of a cultivated on an uncultivated mind, in awakening thought, stimulating and directing inquiry, and evolving the energies of intellect. Accordingly, great stress was laid upon oral teaching on the ground that it was provocative of thought, and that it could be adapted to suit particular circumstances. For this to be effective the number of children that could be committed to the care of a single teacher was strictly limited. In emphasising the oral lessons, Stow

juvenile depravity. In fact, some organisation was required to supplement the monitorial school and to help in disciplining the children.

It was Robert Owen's Infant School at New Lanark that set a new standard. His object was to banish all harshness in words and action from the school, and to adopt means to inculcate a spirit of loving kindness, brotherliness and social service. Great emphasis was laid on physical training and education in contact with realities. He proposed to direct the interest of children to nature and the objects around them by means of conversation. There were to be no set tasks. Much time was to be spent on the playground, and story-telling was to be given a prominent place in the work of the school. Children, from two to four years of age, were occupied with games, singing, object lessons, conversation and story lesson. Those from four to six had lessons in reading, geography, natural history singing and drawing. An equally liberal curriculum governed the work of children from six to ten or twelve years of age. Instruction was conveyed in as pleasing a manner as could be devised, the object being to evoke and maintain interest and quicken the understanding. Owen showed a truer conception of children than was customary at that time. But in other quarters vicious ideas continued to persist.

Many were in favour of capturing the children young and inuring them to habits of industry by setting them to various industrial occupations, utterly regardless of physical consequences. It was through the energy and ingenuity of Wilderspin that the ideas were reduced to a system and spread up and down the country. Wilderspin had a genuine interest in and sympathy with the poor. In the infant school organised at NEW LANARK he saw a means of checking the growth of juvenile depravity in even large towns. His success was due to his considerable organising ability. He realised the importance of making the school bright and cheerful by giving instruction in subjects which were likely to "amuse" the children.

Teaching was comparatively little in the majority of these schools. It was too much a matter of helping children to learn their lessons in the most mechanical way. Reading was taught as a mechanical art, arithmetic was the manipulation of figures, writing was concerned with penmanship and spelling. To teach reading was the chief end of the monitorial school, a power to recognise words and string them together orally. Though each reformer introduced improvements, the basis of their work was Mrs. Trimmer's Charity School Spelling Book, and the New and Old Testaments furnished the reading material.

A careful study of children with whom John Wood was brought into contact soon led him to the discovery that pupils are not machines or irrational animals to be driven, but intellectual beings who may be led. Teaching that did not strike a responsive note in the pupil, that did not quicken his understanding, was dead. School work to be of any value must start from the pupils' experience. This was Wood's contribution to the educational practice. He invented no new system but took the monitorial system and sought to infuse it with a new spirit. Higher qualities were demanded of master and monitor alike. Great stress was laid upon questioning, though the use of books of set questions was not forbidden so long as they were not used mechanically. A real effort was made to brighten the school and to stimulate a vigorous intellectual life.

Other improvements came with the development of infant schools. It must be noted that the primary function of the preparatory and dame schools of the working classes during the early nineteenth century was to mind children while their parents were at work. It was the improvements in common school education brought about by the introduction of the monitorial method, that directed attention to the need of reform in infant education. Without efficient preparatory schools there was no provison for checking the formation of bad habits and stemming the growth of

mined and imposed upon the individual from without, the other, *subjective*, considered education as conditioned by the spontaneous development of the individual. It was the former of these two conceptions that implicitly or explicitly dominated educational thought in England. In the schools education tended to become purely a matter of machinery, the grading of instruction, the length of periods and invention of ingenious devices for assisting memory. Schooling seems to have been entirely a matter of imitation and the getting off of tasks with no attempt at exposition. Confusion existed in the majority of these schools, as they were conducted without any method by teachers who had no special capacity or training for the work.

The innocent device discovered by Bell and Lancaster and worked up by each into an independent system exerted a determining influence on the educational practice in that country for half a century; so much so that mutual instruction came to be regarded abroad as the distinctively English Method of Elementary Schooling. Their ideals of education were low, being confined to imparting the elements of reading, writing and arithmetic, with the addition of sewing in the case of girls. But they aimed at doing this more efficiently and more cheaply than before. To this end both pupils and subjectmatter were to be carefully graded. Short lessons and working to a time-table were to be insisted upon. Each class was to be put in charge of a picked boy or girl monitor who could assist the teacher in his work. This helped greatly in increasing the number of children that could be looked after by one schoolmaster. The entire mechinery of the New School was fitted to prevent idleness and offences and to call forth diligence. In short, the Monitorial System introduced two important things: (1) a new plan of school organisation on a cheap scale and (2) improvements in the methods of instruction. Boys are naturally active and full of spirits, and so, instead of attempting to repress their spirits, we must use them for the good of the school.

Richard Lovell Edgeworth (1744–1817) was a prominent figure in the literary aud scientific world of his day. He was an Irishman of independent means, possessing considerable literary and social interests. Rousseau was the oracle of that period. The *Emile* with its novelty and eloquence had made a profound impression on thinking men and women. He taught that man is born good, and unless interfered with, will develop according to natural law. Hence it is the business of education not to make man to this or that arbitrary pattern, but to allow him freedom to self-realisation. In other words, there is a shifting of emphasis from the curriculum to the child.

In strict accordance with Rousseau's plan, Edgeworth began to educate his son. At the end of nine years he regretfully admitted his mistake. The boy was self-willed from a spirit of independence which had been iuculcated by his early education, and which he cherished the more from the inexperience of his own powers So Rousseau was put aside, and Edgeworth set out to discover a better method for himself. By education he understood much more than instruction. It meant, among other things, cultivating the understanding, encouraging initiative and inventiveness, and evoking a deep sense of religion. To accomplish this all meaningless tasks were to be abolished and the school room was to be brought into relation with the outside world He recognised in childreu's play a great educational means. The child was essentially an active individual. *Doing* is the keynote of his life. This spirit reached a much wider circle in early nineteenth century through the medium of Maria Edgeworth's "Children's Tales." Maria Edgeworth was a past mistress in the art of didactic fiction, and in her various children's books she embodied the principles she held in common with her father.

In the first part of the nineteenth century, two rival conceptions of the educative process held the field; the one, *objective*, regarded education as primarily external, deter-

principle leads to grotesque results. The pupils try to memorise the words and sometimes wrongly reproduce them. Here is a wrong quotation, "The price of democracy is eternal and vigilance". It has been my experience that even students of the Senior B. A. class are not able to understand the meaning of this quotation: "The price of liberty is eternal vigilance". Instead of doing little boys good, we do them harm when we are using words which they cannot understand. That is why we find it stated in one of the recent books on "The Teaching of History" that history, instead of being one of the easiest subjects to teach, is one of the most difficult subjects to teach well.

The Development of Elementary School Curriculum in England

BY

A. R. Mohajer, B. Sc., M. Ed. (Leeds)., M. R. S. T. (London.)

Osmania Intermediate College, Gulburga.

The conception of an elementary education more or less common to all classes was nonexistent at the close of the eighteenth century in England. Equality of educational opportunity was undreamt of, and the nature and scope of even an elementary schooling depended upon the social grade to which the individual belonged. The motive of the charity school was primarily to give a moral and religious training. Instruction in reading, writing, and arithmetic was sometimes added to increase the economic efficiency of the pupil, or to improve the quality of instruction by coupling it with a training in some occupation according to the judgment of the particular governor. Much attention was given to religious observances, and illustrations for teaching purposes were freely drawn from the Bible. In such a school everything depended upon the way of exposition and the interest of the ministers.

government, *autocracy* and *despotism*. But yet, with proper examples, analogies and comparisons, something better than the following can be produced. "Charles was a democrat in character and wanted to remain absolutely independent of Parliament." "This Great Revolution changed the era of monarchical despotism to the constitutional autocratic government." "No taxation *with* representation." "The most important cause of the American war was that colony wanted partnership instead of *independency*."

It must be admitted that the teacher is not solely responsible for the comic mistakes just pointed out. A thoroughly unprepared student happens to be sent up in spite of the teacher and we get an edition of the "Punch", here and there, as a sort of variety entertainment. Twenty years ago, a candidate for the Intermediate Examination exhibited remarkable patience in filling nearly 300 pages, spread over 12 different answer papers, with verses from the Ramayana, written in the Sanskrit language but in the Latin script. This came to my mind when I happened to read in one of the answer books, "Some gentleman invented steam engine, might be Sir Walter Scott", and in another, "On account of the invention of steamships the rain became less and not only England suffered but all the world. Because when the oil stands on the sea, the water could not be evaporated soon."

I will close this article with one observation to the younger teachers. Certainly they are full of the enthusiasm of youth, for which they deserve credit. But when we are fresh from college, we have an over-abundance of enthusiasm. We want to impart to our pupils all that we know. In some cases the result is that we fail to bear in mind that our mental background is different from that of the pupils and that we must adjust our teaching to their intellectual level; otherwise, it would result in our talking above the pupils' heads. Whether it is an oral lesson or whether we are dictating notes the neglect of the above-mentioned

A lengthy discussion took place on the proper means of eradicating illiteracy but there was a difference of opinion on fundamental points. The delegates from British India did not share the view of the States' representatives that in order to popularise education primary schools should be taken away from the hands of Municipal Committees and placed under the control of the Central Government.

Examination Howlers

BY

S. Hanumantha Rao, M. A., L. T.,

Professor of History, Nizam College.

The following errors committed by candidates at a public examination at the end of the school course will be of some interest to teachers of history in schools.

The errors may be classified under different heads. A large number of them are spelling mistakes, due to an improper or inadequate use of the textbook or carelessness in taking down the school notes; for example:—*Merry Tudur, Invisible* Armada, Thomas *Bucket, Beet,* Act of *Apples, Char* Chamber, *Start* Chamber, Anny *Bylon, Mail* issue, *Staw* Act, *Tamp* Act, Middle *Clause* people, *Steward* Kings, *Statue* of Mortmain.

Of a different kind are the following:—(1) "Gladstone got education at Aden and Oxford". "Gladstone was a great novelist". "Gladstone was an able general."

(2) "Milton wrote some of his works in *Elizabeth's* reign." "Shakespeare wrote "The Faerie Queen." "Among writers of Prose and Poetry are Shakespeare, Spenser and *Frobisher.*"

Of course, it is difficult for a school boy to grasp easily the ideas behind the words, *representation, constitutional*

talented teachers should write books for children in a style which is at once simple and graded and also suited to the various stages of their mental growth. He also brought home to the audience the fact that a large portion of the expenditure on education was a waste as seen from the poor output. He pleaded that efforts should be made to educate a large number of children with a minimum of expenditure without jeopardizing efficiency. Speaking about the project method, Dr. A. E. Harper of Moga stated that the method was particularly successful at Moga and gave an account of its working there. With regard to the Dalton plan, he stated that his experience with the plan had convinced him of its efficacy if it was carried out properly. The speaker was silent, however, on the financial difficulties involved in the working out of the plan.

The Secretary of the Educational Corporation, Calcutta, gave his experiences of primary and rural education. He said that due to the fact that primary education was made compulsory in Calcutta, the expenditure on it had swelled to such an extent that it appeared impossible to extend education to all. The problem was, however, solved by dividing the school-going children into two batches—one attending the school in the morning hours and the other in the afternoon hours. Thus the school building and staff which could educate a certain number of boys formerly did now educate double that number, although the duration of the period of teaching was shortened. The result was that some of the children attending the morning classes desired to attend the afternoon classes as well, whilst some of the children attending the evening classes liked to attend the morning classes also. A list was therefore made of the really desirous children and arrangements were made to keep them busy with additional work. Thus education of a larger number of children was made possible with a minimum of expenditure.

meet the growing needs of the country, instead of attempt-ting to completely overhaul the system all at once which will be fraught with danger. He pointed out further that in England, too, the modern system of education evolved gradually out of the old. After the discussion was over, many of the teachers agreed with the speaker and said that the change from the present system should be gradual and that hasty measures would result in the unemployment of teachers already employed and in a place like the United Provinces where there is a good number of schools, the consequences would be really appalling.

In the 'Vocational Education' section there was a lively discussion on, "How far the introduction of industrial education will be beneficial to India?" Mr. Abbot was not in favour of the introduction of Industrial Education in India. He said that he found everywhere, in the course of his tour in India, a general demand for vocational education. But he differed from Indians in the kind of vocational education they craved for. He was of opinion that as India is an agricultural country Indians should not attempt, without forethought, to industrialise the country on the English pattern. They should know that England had been tinkering with machines for ages. He believed that such education would tend to add to the number of the unemployed and make the problem of unemployment graver still. Mr. Abbot is a very able man and has a wide knowledge of industries. But there are strong arguments against his opinion regarding industrial education.

In the 'Teachers' Training', and 'Research in Education' sections it was unanimously agreed that the training of teachers was a matter of primary importance and that its significance could not be exaggerated. Research work in education was considered essential to educational advancement. Mr. Iqbal Narayan, Vice-Chancellor of the Allahabad University, laid emphasis on the fact that

The subject 'University Education and Unemployment' was discussed at considerable length at a sectional meeting. Mr. Seshadri refuted the suggestion that University education was responsible for the growing unemployment in India. He gave statistical evidence in support of his contention. He showed that the number of students attending the first year class in the Indian Universities was 50,000 in a certain year, out of which the number of students who took the degree was found to be only 10,000. He contended that such a small number of degree-holders could easily be provided for in a vast country like India and that the real cause of unemployment should be looked for elsewhere viz. in the economic condition of the country.

Another question which was threshed out in this meeting was whether the standard of education in Indian Universities was high enough or whether it should still further be raised. The delegates who had their education in Indian Universities expressed their satisfaction with the present standard. They argued that the Indian Universities had produced very able and distinguished men and women. The delegates who had received foreign education were of opinion that the standard of Indian Universities did not compare favourably with that of foreign Universities, and that it should therefore be raised. They observed further that the standard of Indian Universities differed widely, and for that reason advocated the adoption of a uniform standard in all Indian Universities.

At the sectional meeting on "Secondary Education" an interesting discussion took place on the utility or otherwise of the present curriculum of Secondary Schools. Mr. Chander Sekaran, Director of Education, Travancore State, spoke against the prevailing notion that the present system of education multiplies the number of clerks and that it should be completely overhauled. He suggested that vocational courses and industrial training should be gradually introduced in the present system of education to

(10) Primary and Rural Education.
(11) Internationalism and Peace.
(12) Women's Education.
(13) New Education Fellowship.

There was an All Gwalior State Educational Exhibition, in which were found exhibits exclusively from Gwalior. The exhibits were divided into several sections. In the Music Section there were some songs for boys and girls, and a few musical instruments. In the Art Section the pictures and the needle work designs exhibited were not of a high order.

The conference began with the opening of the All Gwalior State Educational Exhibition. The Maharaja in performing the opening ceremony of the exhibition delivered a remarkably good speech which he summed up as follows :—

"If I were a teacher and if I were asked to exhibit here my idea about education, my contribution would be something like this. You would see three clay figures of children of about ten years. In one of those you would see a bulky head on a thin and rickety body scarcely able to support it. The second figure would show you a robust body with the head so small that you have to look carefully to be able to see it. The third figure would show the well developed form of a smiling child with the light of intelligence shining in its eyes—though I am not sure how I would be able to show that in my clay figure !

I hope this illustration will explain itself. There is always the danger of the pendulum swinging from one extreme to the other. Though it is a good thing that the days are past when knowledge was supposed to be imparted with the surest effect with every stroke of the cane, we must not run to the other extreme of regarding education as something that would always provide amusement to the child. *The Element of Effort can never be Eliminated.* The best that could be done would be to make it congenial to a degree only compatible with the successful achievement of the end towards which it is directed. Only in that way can we hope that the children in our schools may approximate to the engaging figure I have imagined for my exhibit."

These words will ever resound in the hearts of all those who are interested in education.

It was not possible for the delegates to attend all the sectional meetings as most of them were held simultaneously at various places. So they attended only those meetings which were of special interest to them.

of the conference. The paper was characteristic of the happy attitude of the people of Gwalior.

The Maharaja evinced keen interest in the activities of the conference. He had postponed, in view of the conference, his intended journey to Calcutta. Profuse hospitality was extended to the delegates of the conference. Military sports were organised and the Maharaja was 'At Home' to the delegates in the museum. A luxurious Dinner was arranged in the Durbar Hall to which certain high officials of the State were also invited. The Durbar Hall was built by the grandfather of the Maharaja in the best European style. This is a beautiful building exquisitely furnished. The Maharaja met and chatted with many of the delegates in this Hall. The court dress consisted of a "churidar pyjama," a "black achkan," and "safa." Enchanting musical entertainment, representing Gwalior School of Music, followed the dinner. The delegates were deeply impressed by the keen interest taken by the Maharaja in educational matters and the kind hospitality that was extended to them. The members of the teaching profession were made to feel that even in this decadent age their profession is looked upon with honour. I cannot pass on without expressing my feelings of gratitude for the great kindness and regard shown by Rao Sahib Muley, Education Member, to the Hyderabad delegates in particular, and to all the delegates in general.

Proceedings of the Conference.

The conference was divided into the following sectional meetings:—

(1) University Education.
(2) Moral and Religious Education.
(3) Adult Education.
(4) Secondary Education.
(5) Health and Physical Education.
(6) Vocational Education.
(7) Educational Research and Teachers' Training.
(8) Child-hood and Home Education.
(9) Examination.

was assassinated. Gujari Mahal and Man Singh Mahal are the two palaces inside the Fort worth seeing; the ceiling of the latter is made of huge slabs of stone. Close by, there is a temple known as Devi's temple which is built in the characteristic style of the Southern temples. There are some deserted military quarters within the Fort which are now being used for a peaceful purpose—a secondary school is accommodated in these quarters and Mr. Pears, the head of the Institution, lives there. At the foot of the Fort is the shrine of St. Md. Ghouse. This shrine was built by Akbar who was his disciple. It is a good specimen of the early Moghul architecture and contains exquisite design work in stone. Not very far is the tomb of Tansen, the famous Indian Musician, who is claimed by the Muslims and the Hindus alike to have belonged to their folds. Abul Fazal, the famous historian of Akbar's reign, speaks of him as 'Miyan Tansen' which makes us think that he was, in all probability, a Muslim. The author of the handbook of Gwalior writes, "There is a tamarind tree near the tomb the leaves of which are chewed by singers in the belief that they impart a sweet voice." I had a longing to see the miraculous tree and to try its mysterious power upon me. But alas! I found, on local inquiry, that the tree was chewed down to its very roots by the millions of innocent Indian believers—a fact as strange as the miracle of the tree.

Arrival at Gwalior.

When I arrived at Gwalior, I was received by a party of volunteers under the leadership of a few teachers. This party was discharging its duties with diligence and alacrity. Arrangements were made for accomodating some delegates in big boarding houses and some others in hotels. I was lodged in a hotel as a guest.

No newspaper worthy of note is published in the town. A special daily was published for the time being as an organ

"My Impressions of the All India Educational Conference held at Gwalior."

BY

Sajjad Mirza, M. A., (Cantab).

[Mr. Sajjad Mirza, Principal, Osmania Training College, Hyderabad, was a delegate of the Hyderabad State to the 12th All India Educational Conference recently held at Gwalior. The following is a free translation of the Urdu speech he delivered at a meeting of his College Staff and pupil-teachers on "My impressions of the recent All India Educational Conference"]

A large number of delegates from all parts of India attended the All-India Educational Conference held recently at Gwalior presided over by an eminent educationist, Mr. P. Iqbal Narayan Gurtu, Vice-Chancellor of the Allahabad University. Before giving my impressions of this conference I think it will not be out of place to give an account of the Gwalior State and some of its historic places.

Gwalior State is governed by an enlightened Ruler in the person of His Highness Maharaja Jivaaji Rao Scindia. The area of the State is 2,63,975 sq. miles with a population of over 35 lakhs. The State spends on the education of its inhabitants as much as one-fifth of its income which is over two crores. This expenditure is a little less than half of the amount spent annually on education in Hyderabad.

Several languages are spoken in the State. Eastern and Western Hindi are the chief languages of the State except in Malwa where Malwi dialect is spoken. Marathi is the language of the Durbar and Urdu is generally spoken throughout the State.

The strong fort of Gwalior claims historic significance. It is one of the most famous fortresses in India. It contains several underground rooms one of which was pointed out to me as the place where the unhappy Moghul Prince, Murad

one of Mexico's premier annual events and, as a substitute for the misdirected Rivalry Impulse it is looked upon as a total success.

53 nations chose to give expression to the Rivalry Impulse through organised competitive games, healthful athletics and swimming activities in the 1936 Olympic Games, while, in Spain, a whole nation of 24 millions split off into two sides to shoot, maim and kill one another.

A well organised and directed game speaks a Universal language. Mutual exchange through this kind of medium is one of the surest ways of educating the Rivalry Impulse and promoting understanding, sympathy, appreciation and friendship. The harnessed Rivalry Impulse results in Sportsmanship.

It is the responsibility as well as the privilege of teachers of the youth of this great State to *guide the Rivalry Impulse into Constructive Channels.*

several successive days and nights, or a 21 year old school student to stay 69 consecutive hours on his push cycle until he falls off at 2 a. m, from sleepiness or exhaustion?

In the Western India men's singles tennis finals, played at Bombay about the year 1926, the Bombay local favourite was leading in sets, two to nil. More than that, he was leading in games in the third set by 5 to 1. And further he was serving and needed only two points for game and set. Some of the spectators were already leaving, the large crowd having already conceded the victory to the Bombay favourite. But there was one person present who had not and he was the Bombay favourite's opponent. From there on it is interesting tennis history, but it is especially interesting to us in Hyderabad because the Bombay favourite's opponent on that occasion was a Hyderabadi. I think anyone in talking to Mr. S. M. Hadi about that occasion could not but conclude that the determining factor which turned obvious defeat into a remarkable and glorious victory for him was the attitude of the opponent as reflected in an incident which roused in him to an unusual degree the motive force of the Rivalry Impulse.

Where was a country more badly torn asunder by internal strife and bloodshed than Mexico 15 years ago? Rival faction was on the death trail of rival faction. A trifle was provocation enough for a new outbreak of arson, pillage and wholesale murder. The misdirected Rivalry Impulse was on a rampage for over a decade. But a change took place. Come on to some years later and what do we see? Instead of witnessing the misdirected Rivalry Impulse shooting off into murderous faction feuds, we see thirty thousand selected athletes from all parts of the country collected in Mexico City, the nation's capital, to compete in the national championships. It was the nation's first large scale organised effort to provide a wholesome channel for the expression of the Rivalry Impulse and the experiment proved so satisfactory that it has since become accepted as

the athletes up to now won one first and one second place. Everyone was anxious to see how the third and last event in the last year of College competition between these great rivals would turn out. The result, after a neck to neck race from start to finish, ended in a tie. And thus those two great rivals ended their college athletic sports' career on a footing of equality only because, in the final analysis, the Rivalry Impulse urged each to his utmost ability and stimulated his ambition for victory.

When in a tennis tournament match on the French Riviera, two young women hit the ball back and forth over the net in a single rally 126 consecutive times, the whole lasting 13 minutes, with the result that both collapsed at the end, it was very obvious with what great energising force the Rivalry Impulse supported the efforts of one to excel those of the other.

When a woman, once a famous tennis player, was urged by friends not to drop out of international competitions, she is reported to have replied, "I no longer would amount to much on the courts for my zest of rivalry has left me".

When Gama, outweighed by 35 lbs. and with ten inches less chest girth, defeated his rival, the World's champion wrestler Zbysko in 10 seconds, it required something more than wrestling tricks to perform such an astounding feat. One has only to speak to Gama about wrestling to understand what a significant part the Rivalry Impulse plays in his life as a wrestler.

When the young Turk who was successful in the 1936 Olympic Games was presented by his compatriots with a free house and lot, the government annulled his taxes for life and the restauranteur offered him free meals for a year, the expression of the Rivalry Impulse was national in scope.

What is it that causes an otherwise staid advocate of a High Court to perform 5,130 dhandals; or P. K. Ghosh, the Calcutta swimmer, to stay in the water continuously for

value of *accuracy* and *speed.* Besides, they were learning how to work as a team. Thus learning was taken out of the sphere of pure individual ends.

One can see that this method readily lends itself to a good deal of keen competition and that it can be adapted to most of the class-room subjects.

Not the least interesting to the teacher is the great motivating force the Rivalry Impulse provides in stimulating efforts and improving the performance of the individual boys. And in case a boy is occasionally found lagging behind and is satisfied with mediocre results, the cumulative effect of the rest of the team members will take care of him, for the Team is *the thing* and the competitive spirit is as keen here as on the playfield. The problem of discipline is simplified.

Rivalry Impulse and Athletics.

"He runs faster who runs to outrun another" is a remark as true today as it was more than two thousand years ago when it was first made by a Greek. The expression of the Rivalry Impulse in athletic sports or team games is a common-place that needs no supporting evidence here. But it may be that a well-known classic example is worth repeating. Two college students had competed with each other in athletic sports annually for three successive years, one winning one year, the other winning the next year, but with each succeeding year the competition between them became keener. They came to their last year of competition, before graduation. Both were entered in the same three events as in previous years—the shot putt, the long jump and the 100 yards race. For weeks each had been training and improving his performance with the one object in view, namely, defeating his three-year standing rival. Every one expected a very close competition between them and that was exactly what everyone present saw. The long jump proved a very closely contested event. The shot putt proved just as closely contested with the result that each of

The same method is used in the arithmetic classes. Below is given but one example, and that in adding up sums.

1	3	2	4	5	7	6	8
4	9	3	5	7	2	8	6
							4

Boy No. 1 of each of the two, three, or four teams, runs to the blackboard, writes down the total of the first two digits, properly "carries over", then hurries back to the seat of the next boy of his team to hand him the chalk, and so on until the last boy of each team has finished. The same basis of judging is used as in geography competition.

SENTENCE FORMING is another sphere in which this method proves fruitful. Two teams of equal strength are formed, each member of a team in his turn runs to the blackboard and writes one word, then hurriedly returns and hands the chalk to the next boy who runs to add another word. This procedure goes on until all the boys have written a word, but each writing not more than one. Example: First boy runs to write, *We;* the second boy receiving the chalk runs to write *are*, the third boy, *going*, the fourth boy *to*, etc., until all the boys have had their turn and the sentence is completed. A typical completed sentence follows: *We are going to the fine big green maidan to play a football match.* Every unit is counted a word, as the articles *the*, *a*, etc. Since this "learning game" requires some imagination it affords some humour as well as exercise of the body and mind.

The employment of this method resulted in a number of changed conditions for the Bombay teacher. His complaints vanished; the boys not only learned their lessons better, they learned them more naturally. While they were learning geography, arithmetic and the formation of sentences, they were also learning better to appreciate the

pened. Two outline maps of India were drawn on the blackboard, the thirty-two pupils divided into two sides and a piece of chalk was put into the hands of the first boy of each side or team of sixteen. At the teacher's word, "go", the first boy of each team ran to the blackboard and wrote the name of the city, which he drew by lot, in the outline map of his side at the place where he thought that city is actually located. When all the sixteen boys of each side had finished, the teacher checked the results and declared the winner on the basis of *Accuracy* and *Speed*—Accuracy depended upon where the boys placed the cities in their respective outline maps and Speed was counted in favour of the team which finished first. Accuracy was adjudged as possessing the greater virtue. Details as to how the actual scoring points were worked out around those two qualities, Accuracy and Speed, were rather well codified but need not be gone into here.

Having disposed of the most important cities in this way, provinces, states, rivers, mountains and other geographical features of the country were taken up in succession. Afterwards world geography was contested in the same way. Sometimes the class would be divided into three or four groups instead of two, in each instance to suit the convenience and the nature of the subject.

An outline map of India is drawn on the blackboard. The boys draw lots for the names of cities, rivers, mountains, provinces, states etc., as the case may be. Should the lesson be on cities, names of important cities are written on pieces of paper e. g., Calcutta, Bombay, Delhi, Hyderabad (Dn), Hyderabad (Sind), Lahore, Lucknow, Madras, Bangalore, Dehra Dun, Rawalpindi, Agra, Secunderabad (Dn.), Sikandarabad (Punjab) and each boy writes the name of the city he drew by lot at the place in the map where he thinks it should be located. The teacher decides on the basis of Accuracy and Speed which team wins.

in its effects; it also brings about action that is protective, economical, self-respecting and creative. It brings sorrow; it brings cheer. It brings death and destruction; it brings life and initiative.

It is said of Charley Chaplin, the funny man of the cinema that of all the compliments paid to him the one he likes best is that he is *without a rival* in his particular field of making people laugh.

Recently the National Baby competition of Great Britain was held in Crystal Palace, London. The idea was to give the mothers a chance to exhibit the merits of their babes. The Committee was prepared with facilities and personnel to manage 5,000 babes. But 25,000 babes, brought by their proud mothers, appeared for the competition and they presented a difficult problem for the Committee. As the newspaper story goes, much confusion and delay on a hot day resulted and fathers cursed, babes shrieked and mothers fainted. Yet, because of this hardship, will the show be a failure next year for lack of babes? Not so long as there are mothers and fathers left in Great Britain with a spark of Rivalry Impulse to bolster up their parental pride.

For every one of the available 100,000 seats in the stadium on the opening day of the 1936 Olympic Games, there were 25 requests for it—so reported the Committee Chairman. Were the stadium large enough to hold all who wished entrance on that opening day, 25 lakhs of people would have been present. The Rivalry Impulse has more than a little to do with the "rush" for seats on such an occasion.

Rivalry Impulse as an aid to learning in the classroom.—A teacher in a Bombay school complained that his pupils were not learning their Geography lessons. "They cannot even locate the important cities on a skeleton map of their own country," he complained. Then something hap-

ders. The question of unsettling what comparatively little international, political and economic stability there remains today is pretty much at the mercy of the Rivalry Impulse in those two dictators.

On the other hand, the Rivalry Impulse may show itself in the finest and best sentiments expressed constructively and creatively; for example, the fine arts, architectural designing and structural achievement. That world-renowned artistic creation, the Taj Mahal, is the result of inspiration in the soul of a man, prompted, no doubt, in large measure to see the erection of a building to outrival any other in contemporary existence used for a similar purpose.

One of the most æsthetically pleasing creations of artistic skill is to be seen in the panels of the pair of bronze doors on the Baptistry of Florence, Italy. A competition was held among the well known artists of the day who submitted their designs. Ghiberti won the competition and was awarded the honour of executing the order. The noted sculptor and painter, Michæl Angelo, pronounced those doors, worthy to be the gates of Paradise. So beautiful are they. They have stood for five hundred years as a monument to that great surging motive force which prompts every normal, healthful human being to do a thing better than his neighbour. The same can be said of that immense and beautiful edifiice, which was about a hundred years in building, the Milan Cathedral. This great work, like Ghiberti's unrivalled bronze doors in Florence, is the result of creative and artistic genius *plus* the force of the Rivalry Impulse expressed in its intensest degree.

The world's greatest architectural and artistic creations have come into existence largely through the stimulus of the Rivalry Impulse among competing architects and artists.

The Rivalry Impulse, as a force, brings about action that is inflammable, expensive, humiliating and destructive

The Rivalry Impulse and its Guidance into Constructive Channels.[1]

BY

F. Weber, B. P. E.

Director of Physical Education for Colleges and Principal of the College of Physical Education, Hyderabad-Dn.

Rivalry, as used in this article, may be defined as "effort to obtain an object which another is seeking; in other words, an endeavour to equal or excel another in the same undertaking."

Impulse, used as the second word in the title, is chosen for its aptness over such words as instinct (which is too vague) and spirit (which may be confusing). The dictionary meaning of "Impulse" is eminently suitable for it tells us that Impulse means "impelling force, impetus, urge or drive, a mental motive or feeling tending to induce action without much reflection."

The Rivalry Impulse as a force in life may result in the greatest good or the greatest harm.

At the door of the Rivalry Impulse, directed into intense national, economic and political channels, can be laid the initial responsibility for the barbaric destruction of ten million lives and the maiming of more than that figure in the Great War of 1914-18. We see the force of the same Impulse at work in the statement of Italy's dictator, Benito Mussoloni viz., "Italy will tolerate no foreign rival within her borders." Adolp Hitler, Germany's dictator, in his book, "Mein Kamf", is quoted as saying, "The will of the German nation should be steeled for a final, active settlement with France in a death struggle". These two statements are but vocal expressions of the Rivalry Impulse at work within the breasts of two present-day national lea-

1. Substance of a lantern Lecture delivered at the 10th Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association held in October, 1936.

comfortably and smiles pleasantly. The latter 'method' is however more innocuous than the former, and if a choice were offered to me, I should prefer it. The teacher who 'teaches' the non-detailed text might protest that the text is above the comprehension of his boys, and therefore in the conscientious discharge of his duties, he is obliged to explain it. Even if this is true viz. that the text is difficult (and I am prepared to admit that it should not be above the standard), the explanation of every word and phrase is a waste of time and effort. The aim of the teacher should be to guide the children to understand and follow with intelligent appreciation the plot of the story. Questions may be put to be answered orally or in writing on the subject-matter and occasional explanation may be resorted to, wherever necessary. This appears to me the best way to handle the non-detailed text.

I have offered here a few of my own conclusions. I have done so with great diffidence but in the confident hope that these random observations may be found useful.

---

effective expression. Special attention should be paid to spelling, punctuation, the structure of the sentence and the paragraph, the correct use of articles, pronouns and degrees of comparison, the sequence of tenses, the use of connectives, prepositions etc'.

In teaching prose, the emphasis should be laid on word-study and the object should be the extension of the pupil's vocabulary. Thus 'telegraph' offers an opportunity for the teaching of many other words beginning with the same prefix, 'tele'; 'describe' and 'description' (not 'describtion' as our boys often write) should lead to other words like 'subscribe', 'prescribe' etc. Again, idiom should be taught as part of the prose lesson for it has been truly said that ignorance of idiom is more common than ignorance of grammar.

In the teaching of Poetry, attention should be directed to the literary aspect. The appeal of poetry is not to the intellect but to the emotion. The beauty of thought and phrase leaves an impression not on the mind but on the feeling. A poem should therefore be enjoyed as a 'thing of beauty'. The imagery employed by the poet should chiefly engage the attention. Figures of Speech such as metaphors and similes, effects of rhyme, assonance, alliteration etc., should be studied more than words or phrases.

The Non-detailed lesson is an absurdity. The best way to teach the non-detailed text is not to teach it at all. The book is intended for reading and enjoyment by the pupil himself. It is prescribed for extensive reading and not for intensive study. It is a great pity that this is often forgotten and the teacher begins to explain and annotate the text in a manner not very different from the way he teaches the detailed text. This is as deplorable as another 'method' which would appear to be equally popular—of reading the text from cover to cover, the teacher himself taking on this unpleasant task or asking his boys to do it, while he sits

appreciates and loves the literature of his mother-tongue, may very usefully quote parallel passages to create real appreciation in his pupils.

Ryburn suggests that a taste for reading should first be created with reference to the vernacular. Teachers of English often deplore the fact that boys read very few English books outside the prescribed course. The pity is that the taste for reading, the love of books and reading for its own sake (and not for the examination), is hardly ever cultivated or encouraged on a great scale in our schools. It is thought that teachers of the vernacular may render valuable assistance to their colleagues on the English side, if they inculcate this love of reading in their pupils with reference to vernacular books.

Having indicated how the vernacular may be put to good use in the teaching of English, I shall now offer a few practical suggestions on class-room work.

The question whether the aim is practical or cultural in the teaching of foreign languages has been frequently discussed. The wise conclusion seems to be that 'much might be said on both sides'. I am suggesting that in the Prose-lesson the practical, and in the Poetry hour the cultural and emotional, aim may be constantly kept in view.

The Prose Lesson should be a lessson in language. The teacher and his pupils should pay more attention to words and their ways in English speech than to the mere subject-matter of what is read. It is a great pity that in the final examination it is a knowledge of the subject-matter that is tested more than the extent of the pupil's vocabulary and his power to express himself in English. This is recognized by one of the Indian Universities and a reform is under consideration. I make no apology for quoting the following:

'In the S. S. L. C. and Intermediate, there should be a change of emphasis from the study of the subject-matter to the study of language as an instrument of accurate and

I have just spoken of the abuse of the vernacular in the teaching of English, but there is a definite place for the vernacular in the method of teaching a foreign language. Thus in the teaching of the idiom of the foreign language by comparison and contrast it is indispensable. When a boy says 'enter into a room', 'reach to a place', 'meet with a friend', 'angry on me' or commits some such solecism, the teacher should indicate to him by contrast the difference in idiomatic usage between the vernacular and English. It is not sufficient to point out that these expressions are wrong and give the correct forms. He cannot complacently pass on till he has pointed out to the class the source of such errors and warned them against a word for word translation from the vernacular.

In the teaching of Grammar also the vernacular may be put to great use. Word-order differs in different languages. Particular difficulty is offered by the interrogative form in English, and the boy who says, 'Why you did not come?' for 'Why did you not come?' may be taught the true English word-order by contrast and comparison with the vernacular. Again the Indirect or Reported Speech has to be taught with care because the Indirect forms are alien to the spirit of some of our vernaculars. The Form of the Passive also offers difficulty. A boy turned the sentence, 'A tiger was eating him', into 'He was eating a tiger' which is impossible both from the point of view of grammar and of common-sense.

Again the vernacular may be used in a lesson on literary appreciation. 'Literature is the best that has been thought and said in the world'. The experiences and emotions which are the stuff that literature is made of, are the same among all nations. Nature Poetry is not peculiar to the English language. Descriptions of Nature are frequently met with in vernacular literatures. Religious fervour is not peculiar to English, but is found in the literature of all languages. The teacher of English, who

Ryburn's "A Few Suggestions for the Teaching of English in India" and Michael West's "Bilingualism". These are informative and suggestive. (Michael West's volume is a challenge. It is original and imaginative, if not always convincing.) These books cannot be said to constitute a complete library of information on the subject of teaching English in India.

In Hyderabad the problem again takes on a new aspect. In British India the medium of instruction in the Secondary Stage is English. In Hyderabad in the Osmania High Schools and in the Osmania University the medium of instruction is the vernacular. English is studied as a compulsory second language and this implies that different methods of teaching it may have to be evolved to meet our special requirements.

For instance, I submit that we have to make a careful study of the relation of the vernacular to English. The use of the vernacular as the medium of instruction has the effect of making the student 'think in the vernacular.' In writing English he 'thinks in the vernacular' and translates consciously or unconsciously into the foreign language. This leads to errors of grammar and idiom.

I have discussed elsewhere the sources of the most common errors of spelling, grammar and idiom in the exercises of our pupils and I have tried to point out that many of these arise out of the habit of translation. I shall not repeat the argument here.

This habit of translation is not discouraged in his pupils by the teacher who himself makes use of the vernacular in the English lesson for purposes of explanation. The vernacular may certainly be used for interpretation in the Early and Middle Stages but in the High Stage it should be gradually given up. In the High School rarely, if ever, should a teacher use the vernacular to explain English words and idioms.

to increase their efficiency, or their usefulness to the *profession.*

Mirza Mahmood Ali Beg, B. A., B. T., (Chairman)., Mohamed Yusuf (Secretary), B. A., B. T., Mohamed Sultan, Gulam Dastagir, B. A. Dip. Ed., Dinkar Narayan, B. A., B. T., Ganesh Chand, B. A., B. T., N. V. Iyer, B. A., Syed Ghousuddin, Gulam Ghouse Khan. B. A., Dip. Ed., Syed Sadruddin, Hafeezulla Meer, Meer Mohamed Husain.

A Few Suggestions for the Teaching of English[1]

BY

M. S. Doraiswamy, M. A. L. T.,

Lecturer in English, Osmania University.

During the last quarter of a century the subject of Modern Language Teaching has engaged the attention of educationists and has been discussed by them from many different aspects. In France, Germany and other countries English is often studied as a second language and in the schools in England boys study French or German in addition to their own mother-tongue. The problem is therefore one of vital importance. Many books have been written on this subjeet by Jespersen, Palmer, Ripman and others.

While the teacher of English in India might usefully consult some of these volumes, he is not really enlightened on his own special problem. English differs in essentials (such as grammar and idiom) from Indian vernaculars much more than from European languages. It is easier for a French or German boy to learn English than for one of our pupils. The particular aspects of this problem have not, so far as I know, been fully discussed. There are one or two books like Thomson's " The Teaching of English in India,"

1. Substance of a lecture delivered at the 10th Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association held in October, 1936.

Hence teachers should participate in school games to get into more intimate touch with the students.

(2) The school should be located in surroundings which are hygienic and morally healthy.

(3) It should be well equipped with the right type of furniture and the necessary educational apparatus.

(4) It should have a sufficient and competent staff.

(5) Only trained teachers should be appointed and the untrained teachers in service should be got trained as early as possible, and the necessary facilities should be provided for their training.

(6) It is advisable to have a number of monitors in each class, each with specific responsibilities.

(7) Prizes should be awarded to individual boys to act as a spur to do something praiseworthy and to teams to foster the spirit of comradeship or what is known as *esprit de Corps*.

(8) Boys should be given opportunities and encouragements to manage their societies, clubs, etc., by themselves.

(9) The teacher should have a strong personality. He should try to establish contact with as many of his students and their parents as possible and try to get acquainted with the boys' mode of life outside the school.

(10) On account of the practical and educational importance of scouting, steps should be taken to make it a compulsory subject for the pupil teachers in the Training College.

(11) Corporal punishment should be resorted to only in cases of grave moral delinquency.

(12) Teachers should be given every encouragement and facility to appear for all such examinations as are likely

cannot be achieved. But in India we cannot boast of this kind of co-operation. The child spends barely 6 hours in the school and often the teacher is called upon not only to educate the child on the right lines but also to counteract the evil influences from other quarters. Parental co-operation could be secured by inviting parents to the school day celebrations, by posting them with the progress their children have made during the month, by inviting them to visit the school during its normal working hours and by constituting a committee consisting of select teachers and parents to discuss matters affecting both the school and the home. When parents realise the difficulties which a teacher has to contend against in his task, they may have some sympathy for the teaching profession and regard for the institution. Thus a healthy public opinion could be created, which would be a source of great strength and encouragement to the school.

Conclusion.—We have tried to show that discipline in the class-room is bound up with the discipline of the school. If there is a breach of discipline in a class and if it is not checked immediately, it will communicate itself to the whole school. The discipline of the school as a whole depends upon the traditions of the school, the personality, characters and calibre of its teachers and the interest which its *alumni* are able to evince in their curricular and extra-curricular activities. We have discussed the proper site for the location of the school, nature of the building required, the necessary furniture and educational appliances, the school organisation, the starting of students' clubs and societies for specific purposes, the rules of conduct, the place of rewards and corporal punishment, the co-operation between the head and the staff, parental co-operation, etc. It now remains for us to make certain recommendations based on our conclusions :—

(1) Discipline should be based on love and not on fear. Love implies intimate knowledge of one another.

responsibility is largely to be placed at the door of a section of the public which loves excitement. We suggest that separate accommodation should be provided for students and that teachers should be in charge of them.

The following societies or clubs might be organised in our schools e. g. debating society, excursion committee, swimming club, music club, recreation club, etc. The management of these by the boys themselves will give them self-reliance and training in self-government. We must bear in mind that the primary aim of education is to make of the child a good citizen.

In some schools class-rooms and boarding houses are named after the donors and distinguished persons. A fellow-feeling is created among the members belonging to a particular house. The House system therefore helps to promote corporate life and is very convenient for organising games in the school.

Scouting.—The training which a scout receives makes him self-respecting, self-reliant and helpful. He has dignity and strength of character. The services which the scouts render to the public when opportunities present themselves do great credit to the movement.

Experience has shown that on account of his special training a scout is capable of discharging his responsibility as monitor etc , more efficiently than one who is not a scout. Every one should have the scout spirit. Every teacher should join the movement in some capacity or other and induce as many students as possible to become scouts. It is suggested that scouting should form part of the course in the Training College.

Parental Co-operation.—Naturally the parents are the first educators of the child. So the home environment should be conducive to the free expression of his faculties. Unless the home co-operates with the school, good results

and severely, if he told a lie or practised some deliberate form of deceit".

A child is born with certain natural tendencies, some of which are good and some mischievous. It is the duty of the teacher to weed out the harmful and to direct the healthy ones along proper channels. The child has no power of discriminating the right from the wrong. His moral sense should be gradually but steadily developed.

Co-operation between the Head-master and the Staff.— Just as in a family where there is disunion every-body is unhappy, so in a school where co-operation between the head and the staff is wanting, the school work suffers. Co-operation is based on mutual respect and trust. The head-master and his assistants are colleagues. They should identify themselves with the activities of the school, with a view to promoting the interest of the school and the welfare of the pupils. Where there is willing co-operation, the smooth and efficient working of the school is ensured. Equality of treatment, refined behaviour and the granting of little concessions to the teachers are some of the easy but effective means of securing their willing co-operation.

Discipline Outside the Classroom.—This means discipline connected with extra-curricular activities, e. g. discipline on the play-ground, while serving on committees, during public functions, etc.

We have already said that discipline is the formation of desirable habits. If good habits are well-formed they could very easily be carried over to all situations in life. By watching the behaviour of students in their activities outside tho classroom a teacher can get a deeper insight into their nature than he could by simply observing their behaviour in the class-room.

Occasionally we witness scenes of disorder on the play-ground, especially during a tournament. For such disorders the students are not entirely to blame. The

They must have ingrained in them the ideas of tidiness and clean habits. These are calculated to make them good citizens. A good citizen should be capable of impartial, independent and intelligent thinking.

Gifts and Rewards.—Prizes should not take the form of bribery. They should be awarded in recognition of some real merit. The award of a prize to a batch of students or a team produces better results than the award of a prize to individual students. It creates a sense of collective responsibility and *esprit-de-Corps.* Commendation, certificate of merit, certificate of good conduct etc., also come under gifts and rewards.

Corporal Punishment.—In olden days Solomon's precept, "Spare the rod and spoil the child", was followed to the letter. Famous men like Milton, St. Louis and Goldsmith were brought up by the rod and that is why they had bitter recollections of the days which they spent at school.

The use of the rod is not merely painful to the child, but it is baneful in its effects. It degrades the child in the eyes of his fellows. If the punishment is wrongly given, as it sometimes happens, the child smarts under a sense of injury and injustice and looks upon his teacher with suspicion and a feeling not at all complimentary to the latter.

Corporal punishment in the school should stand on the same footing as capital punishment in the statute book. It should be resorted to very sparingly and only in cases of grave moral delinquency. As Nawab Mehdi Yar Jung Bahadur in his presidential address at the Ninth Annual Teachers' Conference put it, "Corporal punishment should be inflicted for moral delinquency rather than for mental backwardness or for such mischief as is the result of sheer exuberance of spirit. For instance, I would not cane a boy for failing to understand a problem or for running about and playing when he is at work. But I would cane him,

to ensure this freedom. To enjoy liberty one should respect the rights of others. Liberty with a total disregard of others' rights degenerates into license.

Freedom could be secured by giving the boys small responsibilities. We are of opinion that instead of a single monitor, a class may have a number of monitors, each with specified duties.

Moral Training as a factor in Discipline.—Discipline is closely associated with moral training. Real education means the harmonious development of the physical, mental and moral nature of a person. The school is a place where real education should be imparted. It is a high sense of morality which teaches a boy to wipe out his selfishness and use his individual powers for the benefit of himself and others and where necessary, to subordinate his selfishness to the common good.

The teaching of ethics and theology should result in the boy leading a moral life and not merely in his quoting the rules of morality which he has picked up from his books on these subjects. As already pointed out, education should not merely prepare the boy for life, but it should teach him *how to live.*

It is a wrong view to take that the responsibility of a teacher is limited to the covering of the prescribed syllabus or to securing a certain pass percentage at the public examination for his school. He should do his best to build up the character of his students. He has plenty of opportunities to watch their behaviour in the classroom, on the play-ground, etc. Since the instinct to imitate is very strong in the young, it is imperative that the teacher himself should be a man of strong character and free from mannerisms. In fact he should be a model for the students.

The boys should be taught to be self-dependent and self-reliant. They should be taught the dignity of labour.

and he should try to understand their little doubts and difficulties. The temperaments of boys differ widely and so he should use his discretion and tact in dealing with individual boys.

(7) He should be able to share a good and healthy joke with the students.

(8) He should have the courage of his convictions. He should not be led astray by the pretensions of the boys, nor should he yield to the threats of parents; in short, he should never allow himself to be brow-beaten by anybody. He should have sound judgement and common sense.

Proper training will, in most cases, make up the deficiency in respect of any one or more of the qualities mentioned above.

Class-room Discipline.—The discipline in the class is maintained through effective teaching. There should be variety and interest. Where these exist attention follows as a matter of course. Attention is after all voluntary and cannot be enforced. Suitable questions should be put to the boys in the course of teaching to keep up the interest of the whole class. The questions should first be put to the whole class and then a boy singled out to answer it. Threats should on no account be resorted to. They simply betray the weakness of the teacher. He should employ kindness and love, as love begets love. He should not lose his head over the little annoyances caused by them which may after all be the result of their natural exuberance.

Rules of conduct for the guidance of boys should be few and capable of being easily followed. Where they are many and impracticable, they are honoured only in their breach. A command given in a class should be capable of immediate execution. The boys should be made to feel that they are moving in an atmosphere of freedom and that the little restraints imposed upon them are really calculated

side of man. Certain inherent qualities are essential to make a successful teacher; for example: (1) appearance, (2) Enthusiasm, (3) Skill in teaching, (4) Sense of justice, (5) Sincerity, (6) Sympathy i. e. a correct appreciation of the pupils' doubts and difficulties, (7) Sense of humour, and (8) Courage of convictions.

(1) The physique and personal appearance of the teacher count much in maintaining discipline. In order that the teacher may command the respect and obedience of the pupils, it is necessary that he should be careful about his appearance and also active, energetic and healthy.

(2) Enthusiasm is always contagious and an enthusiastic teacher can naturally make his students enthusiastic in their work.

(3) Teaching should be varied and interesting. According to Educational Psychology, interest means *effort* on the part of the pupils. In the course of his teaching, the teacher is expected to introduce something new and connect it with what the child knows already. This is the only way of creating interest in teaching. His voice should be well adjusted, i. e., it should be neither too low nor too loud. He should stand in such a position that he can command a full view of the boys without obstructing them from having a clear look at the board.

(4) A teacher should have a high sense of justice. The boys should have complete faith in his impartiality. If this faith is shaken, he will not succeed in securing their voluntary co-operation or willing obedience. Neither will he be able to carry on his work smoothly.

(5) A teacher should be absolutely sincere. He must be true to his work and take pride in it. All this involves sacrifice on his part.

(6) He should be sympathetic. He must be ready and willing to place himself in the position of his students

should be separate latrines for teachers and boys, removed from the main building.

Furniture—The ideal arrangement would be to provide single desks. Care should be taken to see that the boys observe correct posture while they are sitting, standing or moving. The teacher's seat should be elevated and the black-board should be to his left. The teaching should be made concrete and interesting with the aid of appropriate educational appratus. In moving the apparatus from place to place noise and disorder should be avoided. There should be a well-recognised limit to the number of boys to be admitted to each class.

Time-Table.—The allotment of periods according to the importance of the subjects and the assignment of work according to the qualifications of teachers should receive greater care and attention than they do at present. The proper distribution of work and the scientific framing of the time-table will relieve the tension and monotony of the work and make it interesting. The age of the pupils is an important consideration in determining the duration of the periods.

The work of the teacher for the whole year should be well planned. It is preferable to have a scheme prepared in each subject for the whole school. Omitting holidays, the length of the academic year is only 10 months. The last month may conveniently be reserved for revision work. The remaining 9 months may be divided into 3 terms, each term covering 3 months. The work for each term may further be sub-divided into monthly schemes of work. Each teacher should keep a record of his daily preparation of work.

The personality of the teacher as a factor in school discipline.—The personality of the teacher includes his physique but does not stop with it. In fact it means the harmonious development of the physical, mental, and moral

implies an external authority, it should be willing and not enforced. This obedience later on teaches him to respect and obey the laws of his country. Settled habits go to build up character. But the child in his helplessness looks to the teacher for assistance and guidance. That is why we would like to point out that it is imperative that the teacher should be a model for the child. It is here that the personality of the teacher comes in to make or mar the chances of a child. It is impossible to over-rate the importance of the teacher's personality. The training a boy receives while at school should endure through life. Education should not be a mere preparation for life. It should be something more; it should teach the child '*how to live.*' A teacher is a life sharer.

School organisation, teaching, physical training, the home and the school environments, and curricular and extra curricular activities—all these play an important part in the maintenance of discipline. We shall now proceed to discuss briefly how each of these contributes towards discipline.

School Organisation.—The greater the efficiency of the school organisation, the better will be the discipline. Organisation includes the school building and apparatus, formation of classes, time-tables, methods of teaching and general management.

The School Building—The site chosen should be in a locality which is healthy from the moral as well as the hygienic points of view. The building should satisfy the acoustic needs. All the classes should be housed in one and the same building. Where two or more buildings are unavoidable, they should be at least adjacent to one another. Each room should be spacious enough to accommodate the boys of that class. There should be an assembly hall to accommodate as far as possible all the boys of the school. There should be separate rooms for drawing, manual training etc, and a common room for teachers. There

Report of the Committee on School Discipline.

" Discipline is the regulation of conduct by the operation of will power in the individual. The will must be trained and directed into right channels. This training can be effective only when applied to daily activities and interests associated with them. It is not the acquisition of knowledge only, but is firstly, the creation of habits, the habit of being acquisitive, diligent, obedient, punctual, truthful, persevering and secondly, it is the development of a right attitude towards matters of life." We wish to emphasise that discipline is the formation of right habits as a result of volition and not of coersion. It should be developed from within. It includes obedience and the cultivation of a certain kind of attitude towards matters of life. A child is born with certain inherited tendencies. The problem of discipline is really the problem of checking the evil tendencies and directing them into proper channels. Discipline does not mean the suppression of the free and natural tendencies of the child. It rather means the providing of a healthy atmosphere for their proper expression. The individuality of the child should be made to subserve the demands of the community of which he is a member. Discipline being a habit, it can be carried over to the play-ground, to social or public functions, and in fact to any situation in life. What is meant by saying that discipline should be developed from within is this: the child should be made to see that it is to his interest to be well-disciplined and that it is worth his while to be so disciplined. This will mean the exercise of his own rights with due regard for those of others. From this the recognition of the need to willingly submit to the rules of conduct framed by his school for his guidance is an easy and natural step. Though obedience

MESSAGE FROM

Sachchidananda Sinha, Esq., Barrister-at-Law,

Vice-Chancellor, Patna University.

I gladly respond to the kind invitation of the editor of the *Hyderabad Teacher* to send him a brief message, conveying my hearty felicitations. From what I have seen of this quarterly, the articles contained in it are of varied interest, and on topics of educational value and importance. Its readers are likely to be benefited by a study of the articles both in the English and the Urdu sections.

To teachers my message is one of great hope and sturdy optimism. Without hope no ideal can be approached and without optimism no real achievement is possible. To-day the world is passing through a great crisis, the old order changing, yielding place to new. In India, too, including the Indian States, we are on the eve of great changes, constitutional, as well as social. In placing the corner-stone of the great national edifice the part that teachers will have to play is undoubtedly great. In the first place, teachers themselves will have to widen their outlook on life, and keep abreast of the times by a careful study of the modern problems of education, now pressing for solution. Secondly, they will have to so train their pupils as to make them take a wider outlook of men and things, and think in terms, not of mere communalism, or nationalism, but of internationalism. It is because I have noticed that the *Hyderabad Teacher* has been steadily keeping these two noble ideals in view, that I wish the journal a long career of practical utility and great prosperity.

SACHCHIDANANDA SINHA,
Vice-Chancellor,
Patna University.

PATNA,
25th December, 1936

Hyderabad Teacher

CONTENTS.

VOL. XI No. 4

THE HYDERABAD TEACHER

APRIL—JUNE 1937.

Quarterly Magazine of the Teachers' Association, Hyderabad-Deccan.

Under the Patronage of

SYED MOHAMED HUSAIN JAFERI Esq., B. A., (Oxon).

Director of Public Instruction.

Editorial Staff

S. ALI AKBAR, M. A. (Cantab) *Editor-in-Chief.*
SALIM BIN SAYEED, B. A., B. T., M. Ed. (Leeds).
T. A. LINGAM, B. A., L. T.

SECUNDERABAD-DECCAN.
PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD.
1937.

Annual Subscription Rs. 3.

VOL. XI No. 4

THE

HYDERABAD TEACHER

APRIL—JUNE 1937.

Editorial Staff

S. ALI AKBAR, M. A. (Cantab) *Editor-in-Chief.*
SALIM BIN SAYEED, B. A., B. T., M. Ed. (Leeds).
T. A. LINGAM, B. A., L. T.

SECUNDERABAD-DECCAN
PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD.
1937.

کتب خانہ جامعہ عثمانیہ